نذر سلیم

(عبدالوہاب خاں سلیم)

مصنف و مرتب

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی

شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
یو پی۔ انڈیا

نذر سلیم

(عبدالوہاب خاں سلیم)

مصنف و مرتب

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی

شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

یوپی۔انڈیا

نام کتاب : نذر سلیم

مصنف ومرتب : ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی

اشاعت : ۲۰۱۲ء

تعداد : تین سو (۳۰۰)

ناشر : ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، شعبۂ عربی۔
اے۔ایم۔یو، علی گڑھ

مطبع : آرورا پرنٹرس، شاہدرہ، دہلی۔۱۱۰۰۳۲

قیمت : پانچ سو (۵۰۰) روپئے

انتساب

اپنے بھائی اعجاز احمد مرحوم کے نام

جو

اپنی ذات میں ایک انجمن تھا

جو

محنت ومشقت کا خوگر تھا

جو

والدین اور گھر کے لئے ماہ تمام تھا

جو

خاندان کی تعمیر وترقی کے لئے ہمہ وقت فکرمند تھا

جس کی

رحلت نے ہمیں سوگوار بنادیا

اور

خوشیوں سے بھرا ہوا گھر تاریکیوں میں ڈوب گیا

فہرست

عرض احوال

رعنائی کائنات کی توضیح وتشریح میں ارباب علم وفن نے ہر دور میں اپنے اپنے انداز سے کوششیں کی ہیں، لیکن کائنات کی وسعتوں، پہنائیوں اور سربستگیوں کی تمام تر عکاسی پھر بھی ممکن نہیں، انسانی ذہن بواطنِ کائنات اوراس کے محاسن کی گرفت کسی حد تک اللہ تعالیٰ کی آخری آسمانی کتاب سے ممکن ہے۔ قرآن کریم نے کائنات اور غایت تخلیق کائنات کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے، تاکہ انسانی ذہن کی رسائی وہاں تک دشوار نہ ہو۔ اسرار کائنات اوراس کے محاسن کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں سب سے احسن واکمل اوراعلیٰ واشرف حضرت انسان ہے۔ جسے خلیفہ کے منصب پر فائز کیا گیا کیونکہ بار کائنات کے اٹھانے کے لئے خود اس نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ بہر کیف خداوند قدوس نے اسے اشرف المخلوقات بنایا ہے اوراسی کے ساتھ محترم ومکرم بھی۔ ارشاد ربانی ہے:

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (التین: ۹۵/۴)
یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا۔

اور انسانی تکریم وتفضیل کا اعلان قرآن کریم نے اس طرح کیا:

ولقد کرمنابنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا (الاسراء: ۱۷/۷۰)
یقیناً ہم نے اولاد آدم کو بڑی عزت دی اور انہیں خشکی اور تری کی سواریاں دیں اور انہیں پاکیزہ چیزوں کی روزیاں دیں اوراپنی بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا فرمائی۔

لیکن افسوس صد افسوس کہ یہ انسان اپنے مقام و مرتبہ سے لاتعلق اور اپنی اشرفیت واکرمیت سے بے پرواہ، بہت کم ایسے انسان ہیں جنھیں اپنی منزلت و مرتبت کا احساس ہو، عرفان ذات اور عرفان کائنات کے بغیر عرفان خداوندی ناممکن ہے۔ ہمارے عبدالوہاب خاں سلیم ایسے ہی خوش نصیب اور خوبصورت انسانوں میں سے ہیں، انہیں اللہ نے خودشناسی اور مردم شناسی دونوں صفتوں سے متصف کیا ہے۔ اسی اتصاف واتصال نے ہمیں ''نذر سلیم'' کی ترتیب وتدوین کی طرف راغب کیا، اس چاہت ورغبت کو مزید ہوا دینے میں ہماری شریکۂ حیات انجم سفیان صاحبہ کا بھی خاصہ دخل ہے۔ ان کی ایک ہی رٹ اور ایک ہی اصرار کہ ''نذر سلیم'' کی اشاعت میں جلدی کی جائے تا کہ عبدالوہاب خاں سلیم کی نظر شفیق ''نذر سلیم'' کا مشاہدہ کر کے قرار وسکون حاصل کر سکے، انجم سفیان صاحبہ کو یہی عجلت ''ذاکر علی گڑھ'' کی تسوید وتبییض میں بھی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ (اگست ۲۰۰۹ء) میں مرتب ہو کر ذاکر صاحب کے حضور پیش کر دی گئی ہے۔ آج اب یہ عظیم انسان اپنے چاہنے والوں سے بہت دور جا چکا ہے، جہاں سے واپسی اور اس کے تقدس کی بازیابی اب ہمارے بس میں نہیں۔ ۸؍فروری ۲۰۱۲ء کو اس کی رحلت کی خبر کیا ملی کہ کوہ الم ٹوٹا، پیروں تلے زمین کھسکی اور ''آغوش انجم'' شب دیجور میں ڈوب گیا۔ عبدالوہاب خاں سلیم میرے آسمان بھی ہیں اور میری زمین بھی، اپنی بساط بھر اسی ارض وسماء کو ''نذر سلیم'' میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خدا کرے کہ یہ کوشش اور یہ آئینۂ سلیم قارئین اور محبین سلیم کو پسند آئے۔ ویسے ایک عاشق کو کسی کی پسند اور ناپسند کی کب پرواہ، اسے تو صرف اپنی تصویر کشی اور خاکہ گری سے مطلب، ''نذر سلیم'' کی ابتدائی سطور میں اسی جذبہ کی عکاسی کی گئی ہے، چونکہ یہ عاشقِ احقر اپنی بساط کی حد تک اس تصویرِ سلیم کو اتارنے کی کوشش کی ہے۔ احقر اپنی اتاری ہوئی اس تصویر پر نازاں ہے۔ کیونکہ بقول رشید احمد صدیقی اپنی معنوی اولاد جو ٹھہری، اپنی اولاد جیسی بھی ہو پیاری لگتی ہے، قرۃ العین ہوتی ہے۔

عبدالوہاب خاں سلیم نہ تو دانشور ہیں اور نہ ہی حکیم وعبقری، اس کے باوجود خاں صاحب دانشوروں، حکماء اور عباقر کے چہیتے۔ مشفق خواجہ جمیل جالبی، داؤد رہبر، صدیق جاوید، رفیع الدین ہاشمی، انتظار حسین، محمد ذاکر علی خاں، نگار سجاد ظہیر، رشید حسن خاں، اسلوب احمد انصاری مختار الدین احمد، کبیر احمد جائسی، پروفیسر اسلم، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، افتخار عالم خاں، اصغر عباس اور ابوالکلام قاسمی وغیرہ سے دیرینہ تعلقات، علماء، ادباء، ناقدین اور شعراء کے مکاتیب میں خاں صاحب کے اوصاف وامتیازات کا ذکر کثیر، انتظار حسین نے بھی انگریزی میں خاں صاحب کی سراپا پیمائی کی ہے۔ سیکڑوں ایسی کتابیں ہوں گی جن کا انتساب عبدالوہاب خاں سلیم کے نام یا مقدمات تصانیف میں خاں صاحب کے صفاتِ مستودہ پر اظہار خیال، بیشمار ایسی مطبوعات ہوں گی جو خاں صاحب کے صرفے سے قارئین کے لئے تازہ سامان سفر بن سکیں۔ بہت سے ایسے گھرانے ہیں جو مشعل سلیم سے روشن ہیں، بہت سے ایسے کتب خانے ہیں جن کے مصادر ومراجع کے ازدیاد کے پیچھے خاں صاحب کی معارف پروری کارفرما ہے۔ ارباب علم وفضل کی لائبریریز آپ کی کرم فرمائیوں سے مملوء ہیں اور کتنے مفلوک الحال بندوں کی شادیاں رچانے میں پیشوائی کی ہے۔ خاں صاحب کے انہی عادات واطوار نے راقم السطور کو ''نذر سلیم'' کی ترتیب وتہذیب پر مجبور کیا۔ یہ تحریر وتسوید صرف ادارۂ سرسید سے عبارت ہے، تمنائی تھا کہ رفیع الدین ہاشمی اور نگار سجاد ظہیر کی خوشبوؤں سے بھی یہ معطر ہوتا لیکن زمانے کی ستم ظریفیاں کب ممد ومعاون۔ خدا کا شکر ہے کہ ''حبیب منزل'' کے جھونکوں سے محرومی نہ رہی۔ مولانا آزاد اور حبیب منزل کا جہاں ذکر جمیل ہو وہاں ترنگ آ ہی جاتی ہے اور جہاں نگارشات جائسی ہوں وہاں فیض احمد فیض کی باد نو بہار چلنے ہی لگتی ہے۔ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر نذیر احمد کی موجودگی بھی باعث افتخار ہے، مجھے قوی

امید ہے کہ ادارۂ سرسید کی علمی تاریخ کی تزئین میں آپ کی علمی ریاضتیں ضرور شریک وسہیم ہوں گی۔ خاکسار کی اس میں Healthy نمائندگی ہے، جس کے تنوع وتفنن سے قارئین کو ضرور فرحت ومسرت ہوگی۔

اللہ سے دعا ہے کہ یہ ''نذر سلیم'' عبدالوہاب خاں سلیم کے لئے باعثِ طمانیت قلب ہو، مرتب کا یہ اخلاص اور اس کی یہ ادنیٰ تقدیم ضرور اہل علم کے لئے وجہ کشش ہوگی، اس کے لئے دعائیں کی جائیں کہ درس وتدریس اور توجیہہ وتحلیل ہی اس کا مدعا ومنتہا ہو، یہی حسین کارکردگی ہی اس کا لباس زندگی ہو اور دنیا کی رنگینیاں اس کے لئے پابگل نہ بن سکیں۔ دنیاوی بیڑیوں سے جسکا واسطہ پڑجائے وہ ازکاررفتہ ہوجاتا ہے، اسی لئے بنی نوع انسان کو یہ نسخۂ کیمیا عطا کیا گیا ''ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة'' (ہمارے رب! ہمیں دنیا میں اچھائیاں عطا فرما اور آخرت میں بھی اچھائیوں (سے نواز)۔ یہ ''نذر سلیم'' ایک ننھا سا علمی تحفہ ہے اس امید کے ساتھ کہ شائقین علم وادب اسے ضرور لائق توجہ گردانیں گے۔ بہر کیف جو بھی ہو پتھر کو چھونے میں احقر کامیاب تو ہوا۔ بس یہی شادمانی اس کے لئے کافی ہے۔

ابوسفیان اصلاحی

۲۰۱۲/۶/۱۹ء

عبدالوہاب خاں سلیم

ابوسفیان اصلاحی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو خوبصورت اور پروقار بنایا ہے، حسن و جمال میں دنیا کی تمام چیزیں اس کے بالمقابل ہیٹی، بنی نوع انسان کا بنیادی فریضہ ہے کہ اپنے حسن و جمال کی حفاظت کرے اور اسی سے دنیا کو بقعۂ نور بنائے، بالکل اسی طرح جس طرح علامہ اقبال نے کہا تھا: ع

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دنیا کے بے شمار انسانوں کی اسی شمع برداری کی وجہ سے اس دنیا کی چمک دمک اور رنگینی حیات باقی ہے، نیویارک کے ایک شمع بردار الحاج عبدالوہاب خاں سلیم سے کون واقف نہیں؟ تقسیم انوار ہی آپ کا شیوۂ حیات، اللہ کے بندوں کو مسرتوں اور خوشیوں سے گرانبار کرنا ہی آپ کا مقصد زندگی اور دولتِ خداوندی سے لوگوں کے مسائل و مصائب کو کافور کردینا ہی آپ کی دیرینہ خواہش عبدالوہاب خاں سلیم نحیف و نزار اتنے کہ چٹکیوں میں کوئی اڑا لے جائے، لیکن اندر سے اتنے مضبوط کہ ہر مظلوم کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار، صرف پڑوسیوں ہی کی خبر گیری کرنے والے نہیں بلکہ ہر ملک اور ہر رنگ و نسل کے درد پر دردمند ہو جانا ان کا ایک فطری عمل، ادباء، شعراء اور ناقدین و محققین کی خیریت دریافت کرنے کے لئے ہمہ آن مضطرب، ان کی نگارشات و تحقیقات پر مبارکباد پیش کرنا آپ کا فریضۂ اولین، یہ بارش انوار اور یہ پیہم کرم فرمائیاں بذریعہ فون انجام پاتی رہتی ہیں، مادی دور میں یہ جلوۂ انسانیت کہاں دیکھنے کو ملے؟

خاں صاحب کا تعلق بھارت کے سنبھل مرادآباد سے ہے جو تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے منفرد نوعیت کا حامل ہے اسی تہذیبی شہر سے مولانا خلیل احمد اسرائیلی کا بھی تعلق تھا، اسی علمی سرزمین میں آپ ۶/فروری ۱۹۳۹ء کو تولد پذیر ہوئے۔ عبدالوہاب خاں سلیم دراصل ایک سراپا کمال کا نام ہے، آج انسان کا بانگِ دہل اعلان ہے کہ پیسے پیسے کو کماتا ہے، اسی لئے یہ انسان شیرز (Shares) خریدتا ہے، فیکٹریز قائم کرتا ہے، انسانیت کا خون چوسنے کے لئے تعلیمی اداروں کی بناء ڈالتا ہے، کالونیز اور ہوٹلز کی تعمیر کرتا ہے۔ غرضیکہ "الھٰکم التکاثر" کی اس کے انگ انگ سے بو آتی ہے، لیکن قلب سلیم کے حامل عبدالوہاب خاں سلیم کو اس سوچ سے بیر ہے، انہیں انفاق ہی میں سارا مزہ، مادہ پرستوں کو کیا معلوم کہ انفاق سے رزق بڑھتا ہے اور دولت و ثروت میں اضافہ ہوتا ہے؟ ہندوستان اور پاکستان کے بے شمار اہل قلم ایسے کہ جن کی تصانیف اور افکار کی طباعت میں خاں صاحب کا حصہ ہے اور طباعت کے بعد اس کی بہت سی کاپیاں خرید کر مفکرین و مصنفین کے مابین تقسیم کرنے کی وجہ بھی، ایسے انسان، ایسے درنایاب اور ایسے عدیم النظیر محسن کہاں ملنے کو؟

راقم الحروف سراپا احسان مند ہے اپنے محبتی مہر الٰہی ندیم صاحب کا جنہوں نے اس خوب رو اور عظیم انسان سے ملوایا، گوشت پوست والے انسان سے نہیں، بلکہ اس کی عظمتوں سے، پیار بھری آوازوں سے، رنگین باتوں سے اور مسحور و مبہوت کر دینے والے جملوں سے۔ ایک دن فون آیا کہ "عبدالوہاب خاں سلیم بول رہا ہوں"، یہ سننا تھا کہ مزاج ساتویں آسمان پر، آواز میں چشمۂ صافی کی مٹھاس یا آبشار کے گرنے کا سماں، بس دل یہی چاہ رہا تھا کہ وہ بولتے ہی رہیں اور میں سدا گوش بر آواز، فرمانے لگے کہ میں تمہاری کتاب "مولانا

حمید الدین فراہی: محقق و مفسر" کی طباعت میں حصہ لینا چاہتا ہوں، احقر نے کہا کہ تعمیل حکم کے لئے حاضر ہوں، خدا کا شکر ہے کہ برتر و کہتر کے درمیان تعلقات کی بنیاد کتاب اللہ کے توسط سے قائم ہوئی۔ اس کتاب کا موضوع قرآنیات ہے، یقیناً یہ اللہ کی کتاب کی برکت ہے جس نے ہمیں جوڑ دیا۔ یہ کتاب آئی ہی اس لئے ہے کہ دلوں کو جوڑے۔

اذ کنتم اعداءاً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا (آل عمران: ۳/۱۰۳)

تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔

اس کے بعد اکثر فون پر باتیں ہوتی رہتی ہیں فون کیجئے تو فرماتے ہیں کہ خود کر لیا کروں گا، ان کے حاشیۂ خیال میں نہیں کہ کسی پر بار بنا جائے بلکہ ہر وقت یہی فکر کہ کسی طرح کے گلے میں خوشیوں کا ہار بنا جائے، خوشی کے مواقع تلاش کرتے رہتے ہیں، ایک بار میرے بچوں کے احوال دریافت کر رہے تھے کہ درمیان گفتگو بچوں کی پڑھائی کا مسئلہ در آیا اور جب بتایا گیا کہ میرے چھوٹے بیٹے نے کافی اچھے نمبرات حاصل کئے ہیں تو انہوں نے مبارکباد دی اور ایک ہزار روپیوں کا انعام، اسی طرح جب اسی بارہ سالہ بیٹے کی کتاب "باران رحمت" منظر عام پر آئی تو بے پناہ خوشی کا اظہار کیا کہ اس عمر میں قلم و قرطاس کا یہ حال؟ خدا اس کے قلم میں اور برکت عطا فرمائے اور وہی دعاؤں کی صورت میں ہزار روپئے۔ نہ جانے ان انعامات اور نوازشوں کا سلسلہ کتنا طویل ہوگا، جس طرح طول شبِ فراق کا ناپنا کار دشوار ہے، اسی طرح قلب سلیم کی کرم فرمائیوں اور عنایتوں کا اندازہ لگانا بھی ناممکن۔ سلیم صاحب یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں؟ ہوش مند و چالاک جو ٹھہرے، انہیں معلوم ہے کہ اس سخت ترین دن یہی جمع پونجی کام آئے گی:

فاما من اعطیٰ واتقیٰ وصدق بالحسنی فسنیسرہ لیسریٰ راما من بخل واستغنیٰ وکذب بالحسنیٰ فسنیسرہ للعسریٰ وما یغنی عنه ماله اذا تردیٰ. (اللیل:۹۲/۵۔۱۱)

تو جس نے (راہ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا اور بھلائی کو سچ مانا اس کو ہم آسان راستے کے لئے سہولت دیں گے اور جس نے بخل کیا، اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا اس کو ہم سخت راستے کیلئے سہولت دیں گے اور اس کا حال آخر اس کے کس کام آئے گا جب کہ وہ ہلاک ہو جائے گا۔

عبدالوہاب خاں سلیم کے تقسیم حسن اور تقسیم محبت کا ایک انداز ہ یہ بھی ہے کہ رمضان المبارک کے آتے ہی نیکیوں پر جٹ گئے، یہاں مجھے ان کے رکوع و سجود اور اوراد و وظائف سے کوئی غرض نہیں، نہ ان کے قیام لیل کے متعلق کچھ بتانے جا رہا ہوں کیونکہ مجھے کچھ پتہ ہی نہیں؟ بالعموم اقامت صلوٰۃ، تلاوت قرآن کریم اور تسبیحات ہی کو عبادت تصور کیا جاتا ہے اور ان تمام چیزوں سے فراغت کے بعد ہر سطح پر اباحیت کا دروازہ کھول لیا جاتا ہے، جب کہ دنیا کا ہر کام جس میں انسانیت کی بھلائی ہو وہ عبادت ہے، ایسا ہر قدم اللہ کو عزیز ہے۔ ہمارے سلیم صاحب بھی اللہ کے بندوں کو خوش کرنے کے لئے، عیال اللہ کی آسودگی کے لئے ہر آن پا بر کاب اور ہر لمحہ سرگرم سفر، بات ماہ مبارک کی ہو رہی تھی، اس مقدس مہینے میں اکیڈمیشین روزہ داروں کے لئے کلو دو کلو کھجوریں اور روح افزا کی متعدد بوتلوں کا اہتمام۔ اس خاکسار اور لنگڑے، لولے اکیڈمیشین کو اتنی کھجوریں اور اتنی بوتلیں عنایت کی گئیں کہ گھر والے، مہمانان گرامی اور خدام

غریب خانہ (یعنی محسنین) مل کر کھاتے رہے لیکن ختم ہونے کا نام نہیں، بھلا ایسے انسانوں سے جنت کیسے دور رہ سکتی ہے؟ ایسے انسان کو "فیھما عینان نضاختان" (دونوں باغوں میں دو چشمے فواروں کی طرح ابلتے ہوئے) سے کیسے محروم رکھا جا سکتا ہے؟ یقیناً ہمارے خاں صاحب بڑے ہی دور اندیش نکلے، انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہی انفاق، یہی دریا دلی سخت ترین دن سے بچا سکتی ہے اور یہ بھی انہیں معلوم ہے کہ افطار کرانے کا کیا اجر ہے؟۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من فطر صائماً، کان لہ مثل اجر؟ غیر انہ لا ینقص من اجر الصائم شیئاً

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ جو شخص کسی روزہ دار کو افطار کرائے تو اسے بھی اسی کی طرح اجر ملے گا چہ جائے کہ روزے دار کے اجر میں سے ذرہ برابر بھی کمی واقع ہو۔

آپ کی محبتوں کا ہاتھ ایسا طویل کہ جہاں جایئے، آپ کی چاہتیں استقبال کرنے کے لئے تیار، خاکسار کراچی پہنچا تو وہاں آپ کے چاہنے والے ہر طرح کی سہولیات دینے کے لئے دل وجان سے آمادہ، ہم جیسے ایرے غیروں کو امریکی صدر جیسا Protocol دلوانے کے لئے بے چین وبیتاب، آپ کی سوچ کتنی صائب اور کس طرح مستقیم کہ اصل توقیر وتکریم کے مستحق تو یہی اہل وطن ہیں نہ کہ خوں بار وخوں آشام امریکی صدر بش جس کا استقبال (۱۵ر نومبر ۲۰۰۸ء) صحیح معنوں عراقی صحافی نے کیا۔ بات کہاں سے کہاں نکل گئی؟ بات کراچی میں استقبال کی چل رہی تھی، عبد الوہاب خاں سلیم کے بیشمار چاہنے والوں سے کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامی تاریخ میں ملاقات ہوئی جس کی سربراہ نگار سجاد ظہیر صاحبہ ہیں، یہ بھی خاں صاحب کے عقیدت مندوں میں ہیں۔ یہیں پر کراچی کے مشہور شاعر معراج جامی سے ملاقات ہوئی جن کے

شرافت کا یہ حال ہے کہ خاں صاحب کی ہر درخواست کی تعمیل و تکمیل کو اپنا فریضہ اولین تصور کرتے ہیں، امریکہ سے فرمایا کہ ابوسفیان اصلاحی کی آموں سے تواضع کی جائے، جامی صاحب کی سرعت محبت تو دیکھئے کہ آم کی ایک پیٹی میری کار میں ڈال دی گئی، آم ایسے کہ کھانے سے زیادہ دیکھنے کو دل چاہے، سہلانے میں عجیب مزا آئے، جب ہم اپنے اعزاء کے ساتھ کھا رہے تھے، قاش قاش پر خاں صاحب کے لئے دعائیں نکل رہی تھیں، مجھے یقین ہے کہ غالب نے بھی ایسے حسین وخوش رنگ آم نہ دیکھے ہوں گے؟۔

کراچی یونیورسٹی کے ایک کمرے پر نظر گئی تو دیکھا اس دروازے پر ''گوشۂ عبد الوہاب خاں سلیم'' مرقوم ہے دل اندر جانے کے لئے حیران، پریشان، اندر گیا تو کتابوں کی الماریاں، اسلامیات کے موضوع پر گراں قدر مصادر ومنابع، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ سب خاں صاحب کی عطا کردہ کتابیں ہیں، آپ کا شیوۂ حیات ہی یہ ہے کہ اہل علم کی مساعدت کی جائے، ان کے افکار وخیالات کی اشاعت کی جائے، اور علم کے متوالوں کے لئے کتابوں کی سیلانی ارزانی کی جائے، جب احقر نے اکبر سے ذکر کیا تو فرمانے لگے کہ مادر علمی کا مجھ پر اتنا قرض ہے کہ اسے اتارا نہیں جاسکتا، لیکن اتارنے کی یہ ایک ادنیٰ سی شکل ہے، خاں صاحب کی سب سے خوبصورت دنیا دنیائے کتب ہے۔ دنیائے جہاں سے کتابوں کو خریدنا، نایاب کتب کی فوٹو حاصل کرنا اور اہل علم سے ان کی تصانیف کو ہدیہ پیش کر کے اپنے کتب خانے کے لئے مہیا کرنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ ادارۂ سرسید کی مولانا آزاد لائبریری میں بھی ''گوشۂ سلیم'' ہے۔ جو آپ کی کتابوں سے محبت کی شہادت دے رہا ہے۔ بتایئے ایسے گوہر نایاب اب کہاں ملنے کو؟ ہم تو ایک ایسی دنیا میں جی رہے ہیں جہاں پر ہر شخص کے پیروں سے یہ دنیائے دنی

چمٹی ہوئی ہے۔ جن کا خیال ہے کہ ''چمڑی چلی جائے مگر دمڑی نہ جائے''
خاں صاحب کا عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی آخری انتہا پر ہے،
نہ جانے کتنی بار مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے ذرات کو سرمۂ حیات بنا چکے، اسی
سرمۂ حیات نے انہیں اللہ کے بندوں سے محبت کرنا سکھایا اور اسی عشق رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب علامہ اقبال کو کہنا پڑا: ع

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ ونجف

اسی جذبہ حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہار ایک جگہ علامہ نے
یوں کیا؟ ع

شوق تیرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا ثبوت بھی حجاب

حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کہ انہوں نے مختلف زبانوں میں
ترتیب دیئے گئے حج کے سفرناموں کو جمع کرنے کی ٹھان لی، نہ جانے کن کن
ذرائع اور کن کن موانع ومشکلات سے گزرتے ہوئے ڈھیروں سارے سفرنامے
اکٹھا کر لئے، غالباً اسے مبالغہ پر محمول نہ کیا جائے گا کہ دنیا میں سب سے زیادہ حج
کے سفرنامے خاں صاحب کے پاس ہیں، دنیا کے کسی گوشے میں کسی سفرنامے
کا پتہ لگ جائے تو اس کے حصول میں ان کا دل اٹک جاتا ہے، ہندوستان میں
اس طرح کا چیلنج قبول کرنے کے لئے مہرالٰہی ندیم صاحب موجود ہیں، لیکن پتہ
چلا ہے کہ ان کے اس طرح کے جیالے ہر ملک میں موجود ہیں۔ محترمہ پروفیسر
نگار سجاد ظہیر کے حج کے سفرنامہ ''دشتِ امکاں'' کے پیچھے بھی آپ ہی کھڑے
ہیں۔ اسی سفرنامہ میں خاں صاحب کی تصویر بھی دیکھی، تصویر کیا بالکل ہڈیاں،

ہڈیوں میں صرف روح ہی روح، یہی روح علم ومعرفت کی ایسی شیدائی کہ ہر صاحب فکر سے رشتہ استوار کرنے کے تمنائی، اسی شئ عظیم نے انہیں مشفق خواجہ کا عاشق بنایا، مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور اسلوب احمد انصاری سے محبت کرنا سکھایا، رفیع الدین ہاشمی اور ذاکر علی خاں کا عقیدت مند بنایا، پروفیسر افتخار عالم خاں اور پروفیسر نگار سجاد ظہیر کا قدر شناس بنایا، مختصر یہ ہے کہ نہ جانے کتنے دانشوروں کی تصاویر ان کے ذہن ودل میں سجی ہوئی ہیں۔ ہم تو خاں صاحب کے ڈبل شکر گزار ہیں ایک تو انہوں نے ہمیں اپنی ردائے شفقت میں جگہ دی اور دوسرے ہمارے خلیل الرحمٰن اعظمی، پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی، پروفیسر اطہر صدیقی، ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے قدر دانوں میں ہیں، ان کی ادبی، شعری اور تنقیدی وتحقیقی کاوشوں کے مداح بھی اور اسی مداحی میں خانوادۂ خلیل سے جڑے ہوئے ہیں، سلمان خلیل کو آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور ان کے دامن دل میں مستقل جام محبت لنڈھاتے رہتے ہیں۔ واقعتاً ہمارے خاں صاحب کو خداوند قدوس نے نہ جانے محبت کے کتنے انداز عطا کئے ہیں، جب دیکھئے آپ کی شخصیت سے وہی چشمۂ محبت ومودت پھوٹتا چلا آرہا ہے۔

محترم قلب سلیم کی شخصیت کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ اخبارات میں اسلام اور ملت اسلامیہ سے متعلق اگر کوئی اہم خبر ہے یا اپنے شناساؤں کے باب میں کوئی معلومات ہے تو اس کا تراشہ متعلق شخص کو ضرور ارسال کرتے ہیں اس خاکسار کی دو ایک چیزیں جنگ میں شائع ہوئیں تو اس کا تراشہ مجھ حقیر کو روانہ کیا، یہ انداز ان کی دلی قربت اور علم سے گہرے رشتے کا غماز ہے۔

آیئے خاں صاحب کی رنگارنگ شخصیت کا ایک رنگ اور ملاحظہ کیا جائے، ایسا رنگ کہ کبھی بھلایا نہ جاسکے، بلکہ نوشتۂ دیوار دل بن جائے،

آموں کا موسم آیا اور اس نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا، محبین قلب سلیم اس رنگ کے عاشق زار، اس کے ظہور کے سراپا منتظر، وہی غالب کی طرح آم کی ٹوکریوں کے نزول کا انتظار، دیکھتے دیکھتے وہ ساعتِ سعید آ ہی گئی، پروفیسر مختار الدین احمد، پروفیسر جائسی، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر افتخار عالم خاں، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر مرزا خلیل بیگ اور محترم مہر الٰہی ندیم، ڈاکٹر عطا خورشید کے گھروں میں خاں صاحب کے اشارے سے ٹوکریاں حاضر، گھر میں آموں کی خوشبو ہی خوشبو، اگر آج غالب زندہ ہوتے تو انہیں نواب صاحب کے باغ میں جانے کے بجائے خاں صاحب سے رابطہ قائم کرنا پڑتا اور وہ انہیں اتنے آم دیتے کہ ان کی طبیعت ہی نہال ہو جاتی۔ یہ تو بتانا ہی بھول گیا کہ اس بدقسمت کے گھر میں بھی آموں کی ٹوکری اترتی ہے، پورا گھر اللے تللے کھاتا ہے، خاں صاحب کو دعائیں دیتا ہے کاش کہ اکیسویں صدی کے حاتم طائی، اور جگر مرادآبادی کے متوطن کی زندگی سدا بہار بنی رہے جو دوسروں کی زندگیوں کو سدا بہار بنانے کے لئے بہانے تلاش کرتا رہتا ہے۔

محبین اردو کے مابین مسابقہ کرایا جائے تو ہمارے خاں صاحب اول نمبر آئیں گے، شاید یہ ہماری بڑ سمجھی جائے کہ آپ کو اردو سے مولوی عبدالحق جیسی محبت ہے، مولوی صاحب سے جب ایل۔ آئی۔ سی (L.I.C) اجنٹ نے دریافت کیا کہ وارث کے خانہ میں کس کا نام لکھا جائے تو انہوں نے ارتجالاً کہا ''زبان اردو'' یقیناً یہی حال کچھ خاں صاحب کا ہے۔ بار بار اس کا ذکر آ چکا ہے کہ اردو مصنفین اور اردو مطبوعات سے آپ کا نہایت گہرا تعلق ہے، اسی طرح ہندو پاک کے بے شمار رسائل و مجلّات اور نئی تصانیف کے متعدد نسخوں کے خریدار ہیں، دونوں ملکوں میں آپ کے متعدد ایسے احباب موجود ہیں جو مذکورہ لٹریچر خرید

کر آپ کو پارسل کرتے رہتے ہیں۔ احباب کی کیا خوب تعریف خاں صاحب نے کی ہے، فرماتے ہیں: ''میرے احباب ہی میرا اثاثہ ہیں، میں اس اثاثہ کی بہت فکر کرتا ہوں'' آج کی اس دنیا میں غالباً خاں صاحب یکہ وتنہا ہیں جو اردو زبان کے فروغ واحیا میں جی جان سے لگے ہوئے ہیں۔ بتایئے ایسے دیوانوں کے حق میں قصائد کیوں نہ پڑھے جائیں، یہ دیوانگی انہیں مشفق خواجہ سے ملی ہے جس نے اپنا سارا اثاثہ اور اپنی ساری زندگی کتابوں کے تحفظ اور بٹورنے میں صرف کردی، ایسا ہی ایک دیوانہ کراچی میں اور بیٹھا ہوا ہے جس نے اردو کے قدیم وجدید شعراء کی آوازوں کو قید کر رکھا ہے، یہ سب دیوانگی کے روپ ہیں، فرزانگی سے کہاں باتیں بننے والیں؟ فرزانہ ڈرپوک، سود وزیاں کے حساب میں گم اس کی ساری زندگی لیت ولعل کے سپرد۔

خدا کرے اردو کا یہ عاشق تیز سے تیز تر ہوتا رہے، حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ علمبردار متلاشیانِ علم ومعرفت کی پیاس بجھاتا رہے۔ احقر تمام رہروانِ علم اور جویانِ معرفت سے درخواست گزار ہے کہ ایسے عظیم شخص کی صحت کے لئے دعا کی جائے جو اس وقت امراض واسقام کے نرغے میں ہے۔ گو اسے اپنی جان کی پرواہ نہیں لیکن ہمیں تو ہے، افسوس کہ اس جان من سے اب تک آنکھیں چار نہ ہوسکیں۔ ع

ایک پرچھائیں سی لہراتی ہے دل کے آس پاس
ایک خوشبو جس کا پیراہن نہ دامن دیکھنا

یہ ذکر آچکا ہے کہ ہندو پاک کے بیشمار ایسے معروف ادباء، شعراء اور ناقدین ہیں، جن سے باتیں کرنا، انہیں علمی تحائف بھیجنا اور اکثر مواقع پر لذتِ کام ودہن کی راہیں ہموار کرنا آپ کے فرائض اولین میں داخل ہے۔ آپ کے

احباب میں مشفق خواجہ کو ایک نمایاں حیثیت ہے۔ مشفق خواجہ کے مندرجہ کلمات میں خاں صاحب کی نہایت سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔

''عبدالوہاب خاں سلیم کی عنایت کردہ دونوں کتابیں مل گئی ہیں، ان کا شکریہ فون پر ادا کر چکا ہوں اور اب آپ کا (رفیع الدین ہاشمی) ادا کرتا ہوں، آپ نے ان کتابوں کے بھیجنے میں بہت زحمت اٹھائی، یہ عبدالوہاب خاں صاحب انسان نہیں فرشتہ معلوم ہوتے ہیں، اتنی دور بیٹھ کر اتنا خیال رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اور یہ سلوک دو چار افراد کے ساتھ نہیں، بیشمار لوگوں کے ساتھ ہے۔ معلوم نہیں انہیں کیسے یہ علم ہو گیا کہ میری تاریخ پیدائش ۱۹ دسمبر ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ۱۹ دسمبر کی صبح کو میرے گھر ایک گلدستہ ایک کوریئر سروس کے ذریعہ آ گیا، ساتھ ہی مبارکباد کا کارڈ بھی۔ شام کو مبارکباد کا فون آیا۔ بتایئے کون یہ بکھیڑا اٹھائے گا''۔

واقعتاً مذکورہ بالا سطور میں صبح صادق جیسی سچائی، اسی صبح منیر یعنی عبدالوہاب سلیم کی ایک تفسیر یہ بھی ہے جسے مشفق خواجہ نے اپنے ایک خط بنام پروفیسر رفیع الدین ہاشمی میں بیان کیا ہے:

''عبدالوہاب خاں سلیم (پ: ۶ فروری ۱۹۳۹ء) طویل عرصے تک پنجاب یونیورسٹی لاہور میں کتاب دار رہے۔ اب کئی برس سے امریکہ میں مقیم ہیں، اور دنیا کے حوالے سے ان کے حلقۂ احباب میں راقم جیسے گوشہ نشیں شخص سے لے کر بھارت اور پاکستان کے نامور ادیب اور شاعر تک

شامل ہیں، کتابوں کے نہایت شائق، بیسویں علمی وادبی
کتابوں کی اشاعت میں ان کی مالی اعانت شامل رہی ہے،
وہ احباب کو مختلف تحائف کے علاوہ ان کی مطبوعہ کتابیں
بھجوانے میں سرگرم رہتے ہیں۔ بھارت اور پاکستان سے
اپنی پسند کی کتابیں برابر خرید کر منگاتے رہتے ہیں، آپ
بیتی اور سفرناموں میں (بطور خاص سفر حج وعمرہ) کا ایسا بڑا
ذخیرہ بلا مبالغہ دنیا میں کہیں نہیں ہوگا مجموعی طور پر بھی ان کا
کتب خانہ، امریکہ کا سب سے بڑا کتب خانہ ہے۔ جن
لوگوں سے سلیم صاحب کو علاقہ رہا وہ ان کے خلوص، محبت،
نیک نفسی و دین داری کی شہادت دیں گے"۔

دنیائے لسانیات کے امام رشید حسن خاں کب کس کو خاطر میں لانے والے لیکن ہمارے عبدالوہاب خاں سلیم ان کے مدوحین میں شامل ہیں۔ شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ دونوں صاحبان خاں جو ٹھہرے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ عبدالوہاب ان تنگ نائیوں سے بلند تر ہیں اتنے بلند کہ ہمالیہ بھی رشک کرے۔ ماہر لسانیات کا خیال خاں صاحب کے بارے میں کچھ اس طرح ہے۔ "جناب عبدالوہاب خاں سلیم کا بہ طور خاص ممنون اور شکر گزار ہوں، جن کی کتاب دوستی نے تکمیل اشاعت کے سب سے زیادہ مشکل مرحلے کو آسان بنانے میں مدد کی"۔

آپ کی سب سے بڑی آرزو اہلِ علم سے روابط اور ارباب فضل سے باتیں، آپ کی دیرینہ خواہش کہ صاحب علم دوست کے رخصت ہو جانے کے بعد اور اس کے سلاسل ذریت کو یاد کرتے رہیں اور ان کی شادابی کے لئے ان کی جڑوں میں پانی ڈالتے رہیں۔ دیکھئے خاں صاحب کی یہ سطور کیا کہہ رہی ہیں:

''میرے کئی احباب دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن میرا تعلق اور سلوک ان کی اولاد سے ویسا ہی مخلصانہ ہے جیسا کہ ان کی زندگی میں مرحومین سے تھا اور میں اپنے بچوں سے کہتا ہوں کہ میرے بعد تم سب اس روایت کو قائم رکھنا۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس پر عمل کریں گے۔ میرے بچے سب فرماں بردار اور صالح فکر کے ہیں، یہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ وہ میرے ہم خیال ہیں کہ بقول حالی کے: ع

یہی ہے عبادت اور یہی دین وایمان
کہ دنیا میں کام آئے انساں کے انساں''

آیئے خاں صاحب کے کچھ احباب کے اور وظائف پڑھ لئے جائیں کہ وہ دنیا کے کن کن گوشوں میں جگمگا رہے ہیں۔ یہی ان کی علمی وادبی جگمگاہٹ خاں صاحب کے لئے باعث کشش ہے۔

''ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر سلیم اختر، انتظار حسین، محمد سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر داؤد رہبر، ڈاکٹر صدیق جاوید، اور ڈاکٹر انور محمود خالد وغیرہ، خاں صاحب کی تعریف وتوصیف میں تمام حدود کو تجاوز کر گئے۔ ایسے حسین شخص اور خوش خصال کو عرب شعراء دیکھتے تو نہ جانے کیا کرتے۔ ہم کتنے خوش قسمت کہ ایسے اریب وحسیب کی باتیں سنتے ہیں، اس کی خوش کلامی کا مزا لوٹتے ہیں، کاش کہ یہ قزاقیت لازوال ہوتی اور کبھی ہماری طبیعتیں سیر نہ ہوتیں، کیا بدر کامل سے کبھی آنکھیں ہٹنے کے لئے سوچ سکتی ہیں۔

ادارۂ سرسید کا جاروب کش ہونے کے ناطے عبدالوہاب خاں سلیم کے اس بین پہلو کو کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے کہ انہیں سرسید، شہر سرسید، ادارۂ سرسید

اور فضلاء سر سید سے والہانہ اور جذباتی تعلق ہے اسی تعلق کی بنیاد پر مسلم یونیورسٹی
کے درجنوں اساتذۂ کرام سے آپ کے نہایت فقید المثال مراسم ہیں یہاں کی
علمی سرگرمیوں اور اساتذۂ کرام کی دینی اور ادبی خدمات سے بخوبی واقف ہیں
اور اس واقفیت کی فراہمی میں موسوعۂ علی گڑھ محترم مہر الٰہی ندیم یار شید احمد صدیقی
کی زبان میں ''علمی بگار'' کا ناقابل فرموش کارنامہ ہے، علی گڑھ کی محبت میں
سب کچھ کرتے رہتے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ چراغ سر سید کی لو کو بڑھانے کے لئے
اس میں تیل ڈالتے رہتے ہیں، لیکن ثواب وصلہ کی کوئی پرواہ نہیں۔ ایسا عاشق علی
گڑھ آج تک زیارت علی گڑھ سے محروم ہے اور اسے اپنے محرومی پر تاسف بے
پناہ اب تو جسم وجاں بھی اتنے ناتواں کہ ہلنے کے نام پر کپکپی طاری ہو جائے،
لیکن اسی کپکپی میں سرزمین حجاز اور مدینۂ رسول سے باز آجائیں یہ ممکن نہیں۔ لیکن
ہمارے خاں صاحب کی محترمہ اہلیہ صاحبہ اور بیٹی صاحبہ آپ کی زیارت بدل کے
لئے دو چار سال قبل احاطۂ ادارۂ سر سید میں حاضری دے ڈالی، ان صاحبات نے
ذرہ ذرہ دیکھا اور آسمان کی طرح ان ذرات کے بوسے لئے اور یہاں کے
در ودیوار کی تصاویر خاں صاحب کی طمانیت قلب کے لئے ان کے حضور پیش
کردی گئیں، انہوں نے محمد ذاکر علی خاں کے دیار آرزو کو دیکھا اور سینے سے لگایا۔

خاں صاحب کے صدقاتِ جاریہ اور حسنات تسلسل کی بنیاد کیا ہے
جانتے ہیں؟ جی صرف یہ آیت کریمہ کہ:

ومنهم من يقول ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار (البقرة: ۲/۲۰۱)	اور انہی میں سے کچھ دعاگو ہیں کہ ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں کامیابی عطا فرما اور آخرت میں بھی کامیابی سے سرفراز فرما اور دوزخ کے عذاب سے بچا۔

یہ دعا صرف وہی مانگ سکتا ہے جس کے پاس قلب سلیم ہو اور دین اسلام کا واضح تصور ہو، صوفی صرف آخرت چاہتا ہے، دنیا سے بیزاری دیکھاتا ہے کیونکہ دین کی حقیقی تصویر سے نابلد ہے، اس نے قرآن کا یہ اعلان سنا ہی نہیں "لاتنس نصیبک من الدنیا"

خاں صاحب کے انہی صالح تصورات کی بناء پر بیٹے، بیٹیاں، پوتے، پوتیاں نواسے، نواسیاں اور احباب آپ پر نچھاور رہنے کے لئے تیار رہتے تھے، یہ سب آپ کی صفا مشربی اور بے لوث محبت کا نتیجہ ہے، شاید غلط کہہ گیا بلکہ بالکل غلط کیونکہ تربیت اولاد میں آپ کی محترمہ خورشید سلیم صاحبہ کا بھی اہم رول ہے کیونکہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا نقطۂ نظر بہت واضح ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی دولت نیک بیوی ہے، اسی حدیث کی تفسیر احقر کے والد محترم یوں بیان کرتے تھے کہ عورت سوئی کی نوک سے گھر کو گرا بھی سکتی ہے اور گھر کو تعمیر بھی کر سکتی ہے، یہ مجھے پتہ ہے کہ محترمہ خورشید صاحبہ نے گھر کی تعمیر میں اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی رہی ہیں، بہر حال دونوں صاحبان کی کوششوں سے بیٹا اور چار بیٹیاں پیشۂ طب و ہندسہ سے جڑی ہوئی ہیں اور سب کے سب اپنے والدین کے لئے "قرۃ العین" ایسے کہ وہ جینے کی دعا مانگیں۔

یہ احقر بھی اللہ سبحانہ سے دعا گو ہے۔

والذین یقولون ربنا ھب لنا	اور یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے
من ازواجنا و ذریتنا قرۃ اعین	پروردگار! تو ہمیں ہماری بیویوں اور
واجعلنا للمتقین اماما	اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما
(الفرقان: ۲۵/۷۴)	اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔

بعد نماز فجر ورجینیا سے فون کیا گیا کہ تم سے ابو الحسن نغمی مخاطب ہے،

انداز تخاطب ملاحظہ فرمائیں: فرمانے لگے تمہاری کتاب ''لالۂ وگل'' دوبار پڑھنے کے بعد جی چاہا کہ تم سے باتیں کی جائیں۔ تم نے اپنی اس کتاب میں میرے اپنے خانوادے کے کئی افراد کا ذکر کیا ہے۔ ذکر اپنوں کا ہو اور ذکر میں سلیقہ پن ہو تو کیا ہی بھلا لگتا ہے۔ سیتا پور میرا آبائی وطن ہے، وہاں سے وطن ثانی لاہور کو بنایا، اس میں میرے پیارے گاما صاحب (اختر ظہیر رضوی) اور مرحوم وثاق الحسن رضوی کی داستان سرائی کی گئی ہے جنہیں پڑھ کر اپنا سیتا پور اور اپنا وطن نظروں میں طواف کرنے لگا، اس میں میرے شناسا سید علی اکبر رضوی مرحوم کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے جن کی شفقتیں بھولے سے نہ بھلائی جائیں۔ آگے کی روداد سناتے ہوئے گویا ہوئے کہ پاکستان میں ریڈیو سے وابستہ تھا اور بچوں کا پروگرام نشر کرتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ سالوں بچوں کی اصلاح کا شرف حاصل رہا۔ اس کے بعد امریکہ آکر Voice of America سے سالوں جڑا رہا۔ اور اب سبکدوشی کے بعد کتابوں سے رفاقت، ایسی مثالی رفاقت کا جواب نہیں، گفتگو سے پتہ چلا کہ آپ چالیس کتابوں کو انگریزی سے اردو میں منتقل کر چکے ہیں۔ احقر کے لئے یہ فرمودات بڑے ہی پرکشش ثابت ہوئے جب انہوں نے فرمایا کہ مجھے لاہور میں ایک طویل عرصہ تک مولانا امین اصلاحی کا پڑوسی بن کر اور ان سے ہم کلام ہونے کی سعادت حاصل رہی نیز ان کے محاضرات سے مستفیض ہونے کے مواقع بھی نصیب ہوئے تو خواہش ہوئی کہ نغمی صاحب اپنے نغموں کا چھیڑنا بند نہ کرتے تو کیا ہی بہتر ہوتا۔ آگے یہ بھی جوڑ دیا کہ محترم مرحوم غلام احمد پرویز کی معیت بھی لاہور میں ایک مدت تک رہی۔ انہیں بڑے قریب سے دیکھا، قرآن میں ڈوبے رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ لغات القران، من ویزداں اور مفہوم القرآن جیسی اہم کتابیں دنیا کو دے گئے۔

بات ''لالہ و گل'' سے چلی تو چلتی ہی رہی۔ گویا ہوئے کہ یہ کتاب مجھے عبدالوہاب خاں سلیم نے مرحمت فرمائی جو کتابوں کے حد درجہ رسیا ہیں، کیا ہی خوبصورت و خوب سیرت ہیں، کتابیں چھپوانا، چھپوا کر تقسیم کرنا اور کتابیں بٹورنا آپ کا مسلک و مذہب، خاں صاحب کے پاس کتابوں بالخصوص حج کے سفر ناموں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، نغمی صاحب مزید نغمہ ریز ہوتے ہوئے فرمایا کہ میں بھی انجمن عشاق سلیم کا ایک ادنیٰ سا ممبر ہوں، گاہے بگاہے خاں صاحب کی عشق وحمیت سے سرشار ہوتا ہوں، اور اس سرشاری میں خاکسار کو جلیل مانکپوری نظر آنے لگتے ہیں۔

جلیل ختم نہ ہو دور جام مینائی
کہ اس شراب سے بڑھ کر کوئی شراب نہیں

نغمی صاحب اپنے صدیق مکرم کے لئے رطب اللسان تھے، یہ رطب اللسانی کچھ مڑی تو محمد ذاکر علی خاں اور شہریار کا دور چلا، یوں جانئے کہ یہ سلسلہ غالب کے بادہ و ساغر سے کم نہ تھا، نغمی صاحب بھی کیا عظیم شخص ہیں کہ انہوں نے منافقین بُش، کلنٹن اور اوبامہ کے درمیان بھی جنت بنا رکھی ہے جسے ''سوسائٹی آف اردو لٹریچر'' سے موسوم کیا ہے، اسی میں ہمارے ذاکر اور ہمارے شہریار صاحبان کے جانے پر تعزیتی تقاریر ہوئیں، ذاکر صاحب کی ادبی و تعلیمی خدمات پر روشنی ڈالی گئی، اس مجلس میں ہمارے عبداللہ صاحب بھی تھے، جن سے بہتر ذاکر صاحب پر کوئی روشنی ڈال سکتا ہے؟ ذاکر صاحب جیسا بھلا انسان کہاں ملنے کو؟ اس دور جدید میں ایسا بھولا اور بے غرض انسان نایاب ہے، بہر کیف نغمی صاحب کو جب خاکسار نے خبر سنائی کہ بہت جلد ''نذر سلیم'' آپ کے ہاتھوں میں ہوگی تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی، انہوں نے کہا کہ ایسا ہی کچھ ایک صاحب

پاکستان میں کررہے تھے لیکن آج تک یہ نوید صرف نوید رہی، مجھے امید ہے کہ اب یہ نوید حقیقت کا روپ دھارے گی اور ہم اپنے خاں صاحب کو آئینہ علی گڑھ میں دیکھ سکیں گے۔ مجھے امید ہے کہ یہ آئینہ علی گڑھ آپ کو پسند آئے گا اور کسی کو پسند آئے یا نہ آئے۔ یہ آئینہ تو احقر نے صرف تسکین جاں کے لئے تیار کیا ہے، صرف اس لئے کہ تصویر یار دیکھی جا سکے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اختر شیرانی کی نظم ''اے عشق ہمیں برباد نہ کر'' کی تلاوت کرنی پڑ جائے۔

اے عشق نہ چھیڑ آ آ کے ہمیں — ہم بھولے ہوؤں کو یاد نہ کر!
پہلے ہی بہت ناشاد ہیں ہم — تو اور ہمیں ناشاد نہ کر!
قسمت کا ستم ہی کم نہیں کچھ — یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر!
یوں ظلم نہ کر، بیداد نہ کر
اے عشق! ہمیں برباد نہ کر

نغمی صاحب کی اسکرین پر خاں صاحب کی ایسی ایسی پرکشش تصاویر ایک کے پیچھے ایک لگی ہوئیں تھیں کہ کسی طرح نظریں ہٹنے کا نام ہی نہ لیں۔ انہی تصاویر کے درمیان اپنے اعزاء سید امین قادری اور سید محمد اشرف کے بارے میں بھی بتانے لگے، لیکن راقم الحروف کو تو تصاویر سلیم کا اشتیاق تھا، جب نغمی صاحب نے فون بند کیا تو مجھے اپنے دیوار و در دیکھ کر عامر شیخ یاد آنے لگے۔

سنور گئے مرے گھر کے بام و در
عامر! یہ کون آیا تصور میں حور کی صورت

اسی حوری تصور کو نغمی صاحب لفظوں میں منظوم کررہے تھے۔ یقیناً یہ حوری تصور کتنوں کو مسحور کئے ہوئے ہے۔ احمق ہی ہوگا جو اس سحر سے گلوخلاصی کا خوگر ہو۔ خدا کرے یہ نور کی صورت ہمیشہ ہماری نظروں میں بسی رہے۔ اور

ہمارے بام ودر کو صبح بہاراں سے سرفراز کرتی رہے۔

عبدالوہاب خاں سلیم کی خصوصیات کا ذکر چھیڑیئے تو یہ مصرع یاد آئے کہ

''سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے''

یہ بات روز روشن کی مانند عیاں ہے کہ ایک بڑی تعداد خاں صاحب کی فیاضیوں اور وسعتوں سے فیض یاب ہورہی ہے، کاش کہ یہ چشمہ فیض دوامی ہوتا تو کیا ہی خوب ہوتا، ہندوپاک کے بے شمار اشخاص اس چشمۂ شیریں سے سیراب ہورہے ہیں، اگر ان سیراب شدہ لوگوں میں سے کوئی اللہ کو پیارا ہوگیا تو اس کے بعد اس کے اہل وعیال اس رحمتِ باراں سے مستفیض، یہ بات تو سبھی کو معلوم ہے کہ بحرِ بے پایاں سے جتنا بھی پانی نکالا جائے اس کی متلاطم موجوں اور باغی لہروں پر کوئی فرق پڑنے والا نہیں، قرآن کریم نے یہی بات انفاق کے باب میں صادر کی ہے کہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے دولت گھٹتی نہیں بلکہ افزوں ہوتی ہے، اسی نظریۂ انفاق کے پیش نظر عبدالوہاب خاں سلیم کی سخاوت جاری وساری ہے۔

عبدالوہاب خاں سلیم کے بحر سخاوت میں ہمیشہ جوش ہی جوش تاکہ خوشیاں تقسیم کرسکیں، کبھی کسی کے بیٹے کی پاس ہونے کی خبر سنی تو اسے امریکہ سے ڈالرز روانہ کردیئے، ولادت کی خبر سنی تو اس کی خوشیوں میں شرکت کے لئے وہاں سے تحائف ارسال کردیئے اور اگر اپنے شناساؤں میں سے کسی کے بیٹے یا بیٹی کی شادی ہے تو اس میں ایک بڑی رقم سے اعانت کرنے کے لئے ہمیشہ پیش پیش اور آپ کی ایک Hobby یہ بھی رہی ہے کہ اپنے احباب کے بچوں کی شادیوں کے دعوت نامے اکٹھا کرتے ہیں۔ جو صرف اظہار محبت کا ایک بہانہ ہے، اگر یہ بہانے نہ ہوں تو یہ دنیا قتل وغارتگری کی آماج گاہ بن جائے، بہرکیف ہمارے خاں صاحب کے پاس ایسے ہزاروں بہانے اور نشانے ہیں جن کے سہارے

دلوں پر راج کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہیں دل دینے والے اور ان کے لئے نغمۂ محبت چھیڑنے والے دنیا کے گوشے گوشے میں بس رہے ہیں، آج کی کراہتی ہوئی دنیا اور بلکتی ہوئی انسانیت کے لئے مودت ومحبت کی اشد ضرورت ہے۔ اس حاجت روائی کے لئے ہمارے خاں صاحب کی برق رفتاری کیا ہی قابل ستائش، اللہ سے دعا ہے کہ یہ کاروبار محبت یوں ہی چلتا رہے اور محبت کے پیاسوں کے لئے یہ "ماءِ فرات" یوں ہی بہتا رہے۔

یہ بات اس مضمون میں آچکی ہے کہ خاں صاحب کو اپنے بچوں سے حد درجہ لگاؤ ہے۔ فون پر اکثر ان کے محاسن شماری میں مصروف ان کی اداؤں پر اپنی فریفتگی اور وارفتگی کا ذکر کثیر، ابھی چند ماہ پیشتر بیٹے کی شادی ہوئی تو اس کے شادیانے ملکوں ملکوں بجوائے۔ یہ بات کون نہیں جانتا کہ شاید ہی دنیا کا کوئی خطہ ہو جہاں آپ کے چاہنے والے، دم بھرنے والے اور رطب اللسانی کرنے والے موجود نہ ہوں، ان تمام شناساؤں کو باخبر کیا تاکہ اس خوشی کے موقع پر سب کو اپنی خوشی میں شامل کرسکیں، اس کے بعد اپنے احباب خاص کی خدمت میں شادی کی تصاویر روانہ کیں، ان تصاویر سے خاں صاحب کی جذباتیت ظاہر وباہر، ہر تصویر خاں صاحب کے اندرونی کوائف کا منھ بولتی ثبوت۔ ایک تصویر میں دولہا ودلہن اور اپنے تمام کنبہ کے ساتھ ایک خوبصورت آبشار کے دوش بدوش۔ یہ منظر اس قدر دلکش اور ایسا جاذبِ نظر کہ بس نہ پوچھئے اس تصویر میں خاں صاحب کی موجودگی نے مزید رنگ بھر دیا، ویسے خاں صاحب کی رنگین مزاجی ایسی کہ ہر شخص کو رنگین مزاج، اور بوقلموں بنادے نیز فطرت ربانی سے ہم دوش وہم کلام ہونا سکھادے، خاں صاحب نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا انہوں نے اپنے رفیق کار سید جمیل احمد رضوی سے تعارف کراتے ہوئے خود کو انٹرنیشنل بتایا، یہ سچ ہے کہ اپنے تعلقات، اپنی دنیائے محبت اور اپنے اندازِ فکر کی وجہ سے خاں صاحب بین

الاقوامی سطح پر کھڑے ہیں۔ اللہ ایسے بلند ترین اور جانفزا شخص کو عمر دراز اور صحت کاملہ عطا فرمائے جس کی باد پیمائی بادہ نوشی کے مترادف۔

خاں صاحب کی اس خوبی کا ذکر آچکا ہے کہ انہیں اپنے اعزاء اور احباب کے بچوں اور بچیوں کے شادی کارڈز جمع کرنے کی شدید خواہش۔ اور ارسال نہ کرنے پر تقاضے کی جھڑی لگا دیتے ہیں، یہی کچھ خاکسار کے ساتھ پیش آیا، لیکن افسوس صد افسوس کہ آپ کی اس فرمائش کی تکمیل میں تساہلی سدباب بنی رہی۔

یہ سب کچھ صرف دل جیتنے اور تالیف قلب کی تدبیریں ہیں، یہی وجہ ہے کہ انبوہ کثیر کے دلوں پر خاں صاحب کی حکمرانی ہے۔ لیکن مطلق العنانی ہرگز نہیں، وہ اپنے چاہنے والوں کو چمکارتے ہوئے لیکر آگے بڑھتے ہیں، کیا مجال کہ کسی کو ان سے شکایت یا انقباض ہو، یہی وجہ ہے کہ دائرۂ مشتاقاں میں مسلسل اضافہ در اضافہ۔ جو حوادث سے گزرنا اور طوفانوں سے لڑنا سیکھ لے تو اس کی ہر منزل آسان سے آسان تر، خاں صاحب راہ انسانیت کے دائمی مسافر لیکن انہیں ذرہ برابر احساس اذیت نہیں، بلکہ یہ مسافت شرافت ان کے لئے باعث فرحت و انبساط، انسانوں کے کام آنا، اعزاء کے دکھ درد بانٹنا، ادباء اور شعراء کی مشکلات کو آسانیوں میں تبدیل کرنا اور علم و معرفت کو فروغ دینا ہی آپ کے لئے مسرت آگیں۔ اہل علم و ادب دست بدعا ہیں کہ خاں صاحب کی مست و مسحور کن ہوائیں یوں ہی چلتی رہیں اور پیغام محبت پھیلاتی رہیں۔ احقر بھی ایسے شخص اور ایسے خاندان کے لئے بحضور ایزدی ایستادہ ہے کہ انہیں طمانیت قلب سے سرفراز کیا جائے تاکہ یہ سرفرازی دکھیاروں کے لئے مشعل حیات ثابت ہو۔

قرآن کریم کا لسانی اعجاز

ابو سفیان اصلاحی

ماہرین قرآنیات نے معجزات کو ہر دور میں موضوع بحث بنایا، اسی طرح نبی کریم ﷺ کے معجزات سے دیگر انبیاء کرام کے معجزات کا موازنہ بھی کیا گیا اور آپ ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم ہے یہ ایک ایسا معجزہ ہے جسے تمام معجزات پر فوقیت حاصل ہے۔ قرآن کریم کے علاوہ تمام معجزات ایک محدود اور متعین عہد نیز مخصوص قوم کے لیے تھے لیکن اعجاز قرآن ہر قوم اور ہر عہد بلکہ رہتی دنیا تک کے لیے ہے۔ اعجاز قرآن کے باب میں علما کرام کی مختلف آراء ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس پر بے شمار لٹریچر آچکا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اقدار، روایات اور احکام کے لحاظ سے اس کا اعجاز قائم ہے۔ ایک طبقہ کا خیال ہے کہ چوں کہ قرآن کریم نے غیب کی خبریں دی ہیں اس حیثیت سے اسے اعجازی درجہ حاصل ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ کتاب الٰہی بلاغت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہے اس لیے اسے کتاب معجز کہا جاتا ہے۔ علماء کرام کا ایک حلقہ ایسا بھی ہے جسے کتابِ الٰہی کا تمام اعجاز نظم قرآن میں نظر آیا۔ بہر کیف اعجاز قرآن کے سلسلے میں افکار و نظریات کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن قرآن کی اصل حیثیت اس کی صداقت اور فکری صلابت ہے۔ اس کا معنوی اور فکری اعجاز ہر دور میں قائم و دائم رہے گا۔ قرآن کی اسی صلابت و صداقت نے عربوں کو متاثر کیا[۱] قرآن کریم کی زبان و بیان کی انتہاؤں تک رسائی تو دور کی بات ہے اسے حاشیہ خیال میں بھی نہیں لایا جا سکتا، لیکن قرآن

کریم کا تمام تر مقام و مرتبہ اس کے فکری اعجاز کی وجہ سے ہے، اگر مرکزی حیثیت اعجاز بیان کو دے دی جائے تو اس کا مطلب یہ ہونا چاہیے تھا کہ تمام کفار عرب آغوش اسلام میں سمٹ جاتے جب کہ ایسا نہیں ہوا۔ لیکن یہ حقیقت نا قابل تردید ہے کہ اس کا انداز تخاطب اور طرزِ تذکیر و تہدید ضرور اس لائق ہے کہ اسے موضوع بحث بنایا جائے اور اس کے لسانی محاسن اور بلاغی خصائص کو واضح کیا جائے۔ حالات کے ساتھ ساتھ اس کی لسانی خوبیوں کا ادراک بڑھتا جائے گا۔

معجزہ کے لیے قرآن کریم میں ''آیت'' کا لفظ آیا ہوا ہے۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ مسیحؑ نے بنی اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

وَرَسُولاً إِلَى بَنِى إِسْرَائِيلَ أَنِّى قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ (آل عمران: ۳/۴۹)	اور [وہ] بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے، رسول کی حیثیت سے [کہے گا] میں تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔

اسی طرح حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام فرعون کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ وَالسَّلامُ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى (طٰہٰ: ۲۰/۴۷)	بلاشبہ ہم تیرے رب کی جانب سے نشانی لے کر تیرے پاس آئے ہیں اور سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔

کفار و مشرکین نے بھی آنحضورصلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ کا مطالبہ کیا:

بَلْ هُوَ شَاعِرٌ فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ كَمَا أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ (الانبیاء: ۲۱/۵)	بلکہ یہ تو شاعر ہے، ورنہ یہ کوئی معجزہ پیش کرے۔ جیسے پہلے انبیاء [معجزوں کے ساتھ] بھیجے گئے تھے۔

مذکورہ تینوں آیات میں لفظ ''آیت'' معجزہ کے معنی میں ہے۔آیت کے معنی علامت کے ہیں۔ایسی علامت جو کسی چیز کا پتا دے۔جس کے تعلق سے کسی چیز کا ادراک وعرفان حاصل ہو، کائنات اور کائنات کی تمام چیزیں آیات کے زمرے میں آتی ہیں۔ اس کے توسط سے خالق کائنات کا علم ہوتا ہے۔ذرہ ذرہ توحید ربانی پر دال ہے۔اس کا نظام کسی عظیم وجلیل ذات کا پتا دیتا ہے۔ان تمام چیزوں میں قرآن کریم ایک ایسا خارق عادت اوراعجاز ہے جو توحید کا سب سے بڑا اور مؤثر نقیب ہے۔ اس کے ذریعہ صراط رب کائنات تک رسائی ممکن اور آسان ہے۔قرآن کا اعجاز صرف اہل ایمان ہی کے سامنے نہیں بلکہ کفار ومشرکین کے سامنے بھی آشکارا تھا۔ بنت الشاطی کا کہنا بجا ہے کہ بت پرستی سے مجادلہ اور مقابلہ کے لیے آپ کے ہاتھ میں صرف قرآن کریم تھا۔ کلام الٰہی کی تلاوت سے بت پرستی کی بنیادیں متزلزل ہو جاتیں اوراس کے محل ڈھیر ہونے لگتے[۲]

مولانا فراہی نے اپنی معروف کتاب ''مفردات القرآن'' میں لفظ ''آیت'' پر قابل قدر گفتگو کی ہے اور واضح کیا کہ منطقی دلائل کا انحصار ''آیت'' ہی پر ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے:

العالم متغير كل متغير حادث	دنیا تغیر پذیر ہے اور ہر تغیر پذیر شئی حادث ہے۔

یہاں عالم کی تغیر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ عالم حادث اور فانی ہے اس طرح تغیر عالم کا درجہ آیت کا ہے۔مولانا فراہی نے ''آیت'' کی توضیح یوں کی ہے:

''والثاني ان الآية هي التي تبعث الفكر وتلقي السوال في القلب وتذكره مانسي	اور ''آیت'' کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ فکر وخیال کو جلا دیتی ہے۔ ذہن میں سوال ڈالتی ہے۔فراموش کردہ چیزوں

وتهيج فيه خلقا أودعه من الرحم والتقوىٰ والصبر والشكر وغير ذلک"۔ ۳۔

کو یاد دلاتی ہے اور ذہن انسانی کو اخلاق عالیہ مثلاً رحم، تقویٰ، صبر اور شکر سے آشنا کرتی ہے۔

اسی کو زہیر بن ابی سلمیٰ المزنی نے اپنے قصیدہ میں یوں ادا کیا ہے:

أرانی اذا ما شئت لاقيت آية

تذکرنی بعض الذی کنت ناسيا ۔ ۴

قرآن کریم کے اعجاز بیان کے متعلق خود قرآن کریم میں مختلف ایسی آیات ہیں جن سے اس کے حسنِ بیان اور رعنائی اسلوب کو سمجھا جاسکتا ہے، آسمانی یا غیر آسمانی کوئی کتاب اس کی لسانی عظمت و رفعت کو نہیں چھوسکتی، قرآن کریم کے الفاظ، جملوں اور احکام و واقعات کی پیش کش میں ایسا حسن و جمال ہے کہ عرب کے خطبا اور شعرا اس کے سامنے سرنگوں ہو گئے، سوق عکاظ، سوق المجنہ اور ذوالمجاز کی ساری تزئین و آرائش اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔ قرآن کریم نے جب مجادلے کی آواز بلند کی تو عربوں کا تمام کروفر اس کے سامنے سرد پڑ گیا۔ اور اس کے مثل ایک سورت بھی لانے سے قاصر ہو گئے ۔ قرآن کی زبان میں ایسی تازگی، شادابی اور شگفتگی ہے جو کبھی دست بردِ زمانے سے متاثر نہیں ہوسکتی، اس میں کسی طرح کی پیچیدگی، غموض، ابہام، اور تعقید نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے "عربی مبین" میں نازل کیا ہے اور اس کے پیش کرنے والے کو بھی "نذیر مبین" کے لقب سے نوازا اور جو چیز پیش کی گئی اسے "کتاب مبین" یا "بلاغ مبین" سے تعبیر کیا گیا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وهذا لسان عربی مبين (النحل: ۱۶/۱۰۳)

اور یہ [قرآن] تو واضح عربی زبان ہے۔

آنحضور ﷺ کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد باری ہے:

إن هـو الا نـذيـر مبيـن (الاعراف: ۷/۱۸۴) — وہ تو بس صاف صاف تنبیہ کرنے والا ہے۔

قرآن کریم کے احکام و پیغامات کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے:

وما على الرسول الا البلاغ المبين (النور: ۲۴/۵۴) — اور رسول کی ذمہ داری تو صرف واضح انداز میں پیغام رسانی ہے۔

مذکورہ تینوں آیات سے متبادر ہے کہ قرآن کی زبان، قرآن کریم کو پیش کرنے والی ذات اور اس کا پیغام تینوں چیزیں ''مبین'' کے زمرے میں شامل ہیں۔ ان آیات کریمہ کی روشنی میں بڑے اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب آسمانی اپنے اسلوب بیان، اپنے ذکر وفکر اور کلمات وآیات کے اعتبار سے اعجازی حیثیت کی حامل ہے۔ قرآن کریم کے اسی علومرتبت اور عظمتِ بیان کو دیکھتے ہوئے یہ فرمایا گیا:

قرآناً عربياً غير ذى عوج لعلم تتقون (الزمر: ۳۹/۲۸) — [ہم نے ایسا] قرآن عربی اتارا جس میں کوئی عیب نہیں ہے تاکہ یہ تقویٰ اختیار کریں۔

اسی مفہوم کو ایک دوسری جگہ اس طرح بیان کیا گیا:

الحمدلله الذى انزل على عبده الكتاب ولم يجعل له عوجاً (الکہف: ۱۸/۱) — تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندہ پر کتاب نازل کی اور اس میں کسی قسم کی کجی نہیں رکھی۔

مذکورہ دونوں آیتوں سے مزید تاکید ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں کسی قسم کی فکری اور لسانی ٹیڑھ نہیں ہے۔ اس کی زبان اور تقدیم وتذکیر کا انداز نہایت پاکیزہ اور روشن ہے۔ لفظ لفظ انفرادی نوعیت کا حامل ہے۔ ہر آیت عجیب رنگ وآہنگ سے عبارت ہے۔ پڑھتے ہوئے لذت وفرحت محسوس ہوتی ہے۔ ولید

بن مغیرہ نے قرآن کریم کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے اپنی قوم کو مشورہ دیا تھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ نہ کہیں کہ ان کا لایا ہوا کلام ہے۔ اس لیے کہ وہ جوں ہی یہ بات کہیں گے اہل عرب اسی رد کردیں گے۔ زیادہ سے زیادہ اس کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمد ایک ایسا کلام لائے ہیں جو جادو ہے جو آدمی اور اس کے بھائی، بیوی اور اولاد میں جدائی کرادیتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ بیان قرآن میں ایسا سحر اور ایسی تاثیر ہے جو لوگوں کے اذہان وقلوب میں پیوست ہوجاتی ہے اور ان کی کایا پلٹ دیتی ہے۔ یہی قرآن کا اعجاز بیان ہے کہ تمام تر جدوجہد کے بعد اس کے سحر کو نہ روکا جاسکا اور نہ ہی اس کی خوشبوؤں کو پابند کیا جاسکا، ایک سے ایک قسی القلب اس کے سامنے موم بن گئے اور اسی کی دولت سے انھیں قلب سلیم عطا ہوا۔

قرآن کریم کے اسلوب بیان، الفاظ اور جملوں کی نرالی شان کو پوری طرح اسی وقت محسوس کیا جاسکتا ہے جب قرآن کریم کے نظم وتناسب کو مدنظر رکھا جائے۔ یہ ایک مربوط اور منظوم کتاب ہے، کسی ایک حرف یا کسی ایک لفظ کی تقدیم وتاخیر سے قرآن کا پورا نظام درہم برہم ہوجائے گا۔ ایک آیت دوسری آیت سے اور ایک سورہ دوسری سورہ سے اس طرح پیوست ہے کہ کچھ بھی کرنے سے پورا نظام القرآن تتر بتر ہوجائے گا، یہی تنظیم وتنسیق ہر قرآنی پہلو کی بلندی کا احساس دلاتی ہے نظم قرآن کے بغیر قرآن کا اعجاز بیان منظر عام پر نہیں آسکتا ہے۔ یہی خیال خطابی کا ہے کہ نظم قرآن میں بلاغت کی اساس یہ ہے کہ قرآن میں الفاظ کی ترتیب ایسی ہے کہ اگر ایک لفظ کو ہٹا کر کوئی دوسرا لفظ اس کی جگہ لایا جائے تو معنی فاسد ہوجاتا ہے یا وہ رونق ختم ہوجاتی ہے جس سے بلاغت میں فرق پڑتا ہے[۵] بنت الشاطی کا خیال ہے کہ لفظ اور معنی میں گہرا

ارتباط ہے[6] اور قرآن کریم کے الفاظ اور معانی میں نہایت حسین امتزاج وارتباط ہے۔اور اس حسن کو صرف نظم قرآن ہی منظر عام پر لاسکتا ہے۔ نظم قرآن کے تئیں اب تک ہونے والی کاوشوں میں سب سے قابل قدر اور قابل ستائش کاوش مولانا حمید الدین فراہی کی ہے۔ اس موضوع پر آپ کی کتاب ''دلائل النظام'' غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ نظم قرآن کی ضرورت کا احساس ان الفاظ میں یاددلایا ہے:

> ''پھر نظم قرآن کی سب سے بڑی شہادت ان لوگوں کا علم ویقین ہے جن پر حسن ترتیب کے محاسن کچھ بے نقاب ہوگئے ہیں اور جنھوں نے ان حقائق کی کوئی تجلی دیکھ لی ہے جو نظم قرآن کے اندر ودیعت ہیں۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ کتاب اللہ کے اسرار وعجائب کا ایک عظیم الشان خزانہ ہے جس کی کلید صرف نظم قرآن ہے۔ یہ چیز ان کے ذوقِ جستجو کو شہ دیتی ہے۔ اور ان کی طمانیت وبصیرت میں اضافہ کرتی ہے۔ اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ اس مخفی خزانہ کو اجاگر کریں''[7]

مولانا فراہی کا یہ بھی خیال ہے کہ نظم قرآن کی وجہ سے تاویل میں پیدا ہونے والے تمام اختلافات فرو ہو جائیں گے، نیز اس کی وجہ سے کلام کی صحیح سمت متعین ہوسکتی ہے اور امت تمام بدعت، ضلالت اور باہمی اختلافات سے بچ سکتی ہے[8] نظم قرآن اور اعجاز بیان کو دیکھتے ہوئے مولانا فراہی رقم طراز ہیں:

'إني رأيت في ترتيب كلام الله (وله الحمد على ما أراني) إن الكلام يجري من أمر إلى امر و كله جدير بأن يكون مقصداً فيشفي الصدور ويجلو القلوب ثم يعود إلى المبدأ فيصير كالحلقة'[۹]

قرآن کریم کی ترتیب میں میرا مشاہدہ (اپنے مشاہدہ پر اللہ کا شکر گزار ہوں) کہ کلام الٰہی ایک مسئلہ سے دوسرے مسئلہ کی اور یہ تمام امور مل کر ایک مقصد کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، یہ مقصد دلوں کے لیے باعث سکون اور سینوں کے لیے باعث تنویر ہے۔ پھر یہی کلام اپنے آغاز سے جڑ کر حلقہ زنجیر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

نظم قرآن کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن کریم پر تفکر و تدبر کیا جائے تو یہ نقطہ نظر پوری وضاحت کے ساتھ نظروں کے سامنے ہوگا کہ قرآن کریم قطعی الدلالہ ہے۔ ایک آیت کا ایک ہی مفہوم ہوگا اور ایک لفظ کا ایک ہی معنی ہوگا اور ایک ہی تاویل پر تمام مفسرین کا انحصار ہوگا۔ بالعموم بہت سے الفاظ کو ہم معنی سمجھا جاتا ہے جب کہ ان مزعومہ مترادف کلمات میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے۔ یہی صورتِ حال قرآنی کلمات کی ہے کہ وہ اپنی جگہوں پر مخصوص معانی کے حامل ہیں ان کلمات کی جگہ کسی دوسرے کلمہ کو رکھا ہی نہیں جا سکتا اور وہ اس کی کسی طرح نمائندگی کر ہی نہیں سکتا۔ قرآن کریم کے اس لسانی راز سے فصیح اہل عرب بخوبی واقف تھے[۱۰] عام طور سے یہ معروف ہے کہ ایک چیز کے لیے عربی میں متعدد الفاظ پائے جاتے ہیں جب کہ یہ تصور لغوی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ مثلاً پتھر، شیر، سانپ اور گھوڑے کے متعدد نام پائے جاتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ایک چیز کا ایک ہی نام ہے۔ دیگر نام اسماء صفاتی ہیں۔

ابن خالویہ نے جب یہ کہا کہ مجھے تلوار کے پچاس نام یاد ہیں۔ تو ابو علی فارسی جو اس مجلس میں موجود تھے سن کر ہنسے اور فرمایا کہ مجھے تو صرف ایک نام یاد ہے۔ وہ ہے ''سیف'' اس پر ابن خالویہ نے کہا کہ پھر آپ مہند (ہندوستانی تلوار) صارم (شمشیر براں) قضیب (ٹکڑے ٹکڑے کرنے والی تلوار) حسام (دھار دار تلوار) اور دیگر فلاں فلاں ناموں کے متعلق کیا کہیں گے؟ تو ابو علی نے جواب دیا کہ یہ سب تلوار کی صفات ہیں لگتا ہے کہ آپ اسم اور صفت کے مابین امتیاز کو محسوس نہیں کرتے[۱۱]

مولانا فراہی نے اپنی کتاب ''مفردات القرآن'' میں یہ واضح کیا کہ مفردات کے صحیح معانی معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مفسرین مختلف غلطیوں میں گھرتے چلے جائیں گے۔ طالب قرآن تدبر قرآن، فہم آیات، اور نظم قرآن جیسی عظیم نعمتوں سے محروم ہو جائے گا۔ ایک لفظ کا صحیح مفہوم نہ معلوم ہونے کی وجہ سے وہ غلط راستہ پر چل پڑے گا۔ قرآنی علوم وحکم سے دور ہو جائے گا، یہاں تک کہ ایک لفظ کے مفہوم میں غلطی کے سبب پوری سورہ کی تصویر ہی بگڑ جائے گی اس کی بناء پر نئے فرقے وجود میں آتے ہیں، قوم تباہ و برباد ہو جاتی ہے، اسی طرح مفردات کا صحیح علم نہ ہونے سے اور قرآن کے لسانی اسرار سے عدم واقفیت کی بنا پر انسان اصل قرآنی دولت ''حکمت'' سے محروم ہو جاتا ہے[۱۲]

درج ذیل سطور میں کچھ الفاظ دیتے ہوئے یہ وضاحت کی جائے گی کہ دو مختلف الفاظ ہم معنی نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ''الرؤیا'' اور ''الحلم'' دونوں قرآن کریم میں آئے ہوئے ہیں اور دونوں خواب کے معنی میں ہیں لیکن دونوں میں واضح فرق موجود ہے، ''الرؤیا'' قرآن کریم میں سات مرتبہ آیا ہے، اس کا استقراء کرنے پر پتا چلتا ہے کہ یہ لفظ صرف انبیاء کرام کے سچے خواب کے لیے

آتا ہے۔"حلم" قرآن کریم میں تین مرتبہ جمع استعمال ہوا ہے۔اس کا تجزیہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے مراد پریشان کن، ڈراؤنے خواب اور مخلوط اور بے حیثیت وسوسے ہیں۔ اشادر بانی ہے:

بَلْ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ بَلِ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ كَمَا أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ
(الانبیاء:۲۱/۵)

بلکہ انھوں نے [قرآن کو] پریشان خوابوں کا مجموعہ بتایا، بلکہ یہ اس کا خود ساختہ ہے بلکہ یہ تو شاعر ہے، ورنہ یہ کوئی معجزہ پیش کرے جیسے، پچھلے انبیاء [معجزوں کے ساتھ] بھیجے گئے تھے۔

''الرؤیا'' کے متعلق صرف ایک آیت نقل کرنے پر اکتفا کیا جائے گا۔[۱۳]

وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ. قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ
(الصافات:۳۷/۱۰۴۔۱۰۵)

تو ہم نے ندادی: اے ابراہیم! تو نے خواب سچ کر دکھایا، بے شک ہم نیکو کاروں کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں۔

"الحلف" اور "القسم" کتب لغت میں ہم معنی مستعمل ہوئے ہیں، جاہلی شعراء نے بھی انھیں ہم معنی یعنی حلف کی قسم کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ لیکن مطالعہ قرآن سے یہ چیز ثابت نہیں ہوتی بلکہ دونوں کے معانی میں فرق ہے۔ لیکن شعراء نے ان فروق کو ملحوظ نہیں رکھا۔ مثلاً نابغہ ذبیانی کا شعر ہے:

حلفت فلم اترک لنفسک ریبة.[۱۴]

اسی طرح اعشیٰ کا شعر ہے:

حلفت له بالراقصات إلى منى .[۱۵]

شاش بن عبدہ کا قول ہے:

حلفت بما ضم الحجيج إلى منى

لیکن قرآن کریم میں ''ح ل ف''[۱۶] کا مادہ تیرہ مقامات پر آیا ہوا ہے اوران تمام آیات کا جائزہ لینے کے بعد یہی پہلو ابھر کر سامنے آیا کہ یہ لفظ جھوٹی قسم کے لیے آتا ہے، اکثر اس کا تعلق منافقین سے ہے مثلاً ارشاد باری تعالی ہے:

وَسَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ (التوبة: ۹/۴۲)

اور اب وہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں گے: اگر ہمارے لیے ممکن ہوتا تو یقیناً ہم تو آپ کے ساتھ چل دیتے [ایسے بہانوں سے] وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اور اللہ کو علم ہے کہ یہ لوگ یقیناً جھوٹ بول رہے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ (القلم: ۶۸/۱۰)

اور آپ کسی بھی زیادہ قسمیں کھانے والے بے وقار شخص کے کہنے میں نہ آئیں۔ جو عیب جو آوارہ، چغل خوری میں دوڑ دھوپ کرنے والا ہے۔ بھلائی سے روکنے والا حد سے تجاوز کرنے والا بدکردار ہے۔

تیسری جگہ اللہ فرماتا ہے:

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَى شَيْءٍ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكَاذِبُونَ (المجادلة: ۵۸/۱۸)

جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا تو وہ اسی طرح اللہ کے سامنے قسمیں اٹھائیں گے۔ جس طرح تمہارے سامنے قسمیں اٹھاتے ہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ کسی موقف پر ہیں۔ آگاہ رہو یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں۔

اب رہا قسم تو اس کا اطلاق صرف سچی قسموں پر ہوگا، سورہ ابراہیم میں اللہ کا ارشاد ہے:

رَبَّنَا أَخِّرْنَا إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ أَوَلَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُم مِّن قَبْلُ مَا لَكُم مِّن زَوَالٍ (ابراہیم: ۱۴/۴۴)

ہمارے رب! ہمیں تھوڑی مدت کے لیے ڈھیل دے دو، اب ہم تیری (دعوت پر لبیک کہیں گے اور رسولوں کا اتباع کریں گے (انھیں جواب ملے گا) کیا اس سے پہلے تم قسمیں نہیں کھاتے تھے کہ تمہارے لیے کسی قسم کا زوال نہیں ہے۔

دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے:

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مَن يَمُوتُ بَلَى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (النحل: ۱۶/۳۸)

یہ لوگ اللہ کے نام سے بڑی بڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اللہ کسی مرنے والے کو پھر سے زندہ کر کے نہ اٹھائے گا، اٹھائے گا کیوں نہیں؟ یہ تو ایک وعدہ ہے جسے پورا کرنا اس نے اپنے اوپر واجب کرلیا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

مذکورہ آیات کریمہ کی روشنی میں یہ خیال حق بجانب ہے کہ حلف اور قسم کے درمیان دقیق فرق موجود ہے۔ اگر اس سے کسی کو اتفاق نہ ہو تو یہ بغیر کسی تامل کے کہا جا سکتا ہے کہ حلف محض جھوٹی قسموں کے لیے ہے اور قسم کا اطلاق عام ہے۔ [۱۷] مولانا فراہی نے اپنی کتاب ''اقسام القرآن'' میں ان مسائل کو اٹھایا ہے اور لفظ ''حلف ''کو 'قسم' کے مشابہ قرار دیا ہے جو قرآن کی رو

سے مناسب نہیں ہے[۱۸]

قرآن کریم میں بیوی کے لیے دو لفظ ''زوج'' اور ''امرأۃ'' ملتے ہیں۔ بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ دونوں میں کوئی معنوی فرق نہیں ہے، لیکن قرآن کریم کے اعجاز بیان سے بالکل صراحت کے ساتھ معلوم ہے کہ زوج کا استعمال وہاں ہوتا ہے جہاں تعلق کی بنیاد زوجیت ہو، حکمت اور نشانی کے اعتبار سے یا قانون اور حکم کے اعتبار سے، حضرت آدم جب دنیا میں تشریف لائے تو ان کی رفاقت وموانست اور محبت مؤدت کا ایک ہی ذریعہ تھا یعنی حضرت حوا علیہما السلام جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہوا ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (الروم: ۳۰/۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی۔

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے:

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَاماً (الفرقان: ۲۵/۷۴)

اور جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔

آخرت میں اہل جنت کو جو بیویاں ملیں گی، ان کے لیے بھی قرآن نے ''زوج'' ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ یہ بیویاں قرار جاں کے لیے من جانب اللہ مہیا کی جائیں گی۔ اللہ کا ارشاد ہے:

ولھم فیھا ازواج مطھرۃ وھم فیھا خالدون (البقرہ: ۲/۲۵)

ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔

سورہ آل عمران میں متقین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ پاکباز بیویاں عطا کی جائیں گی۔

قُلْ أَؤُنَبِّئُكُم بِخَيْرٍ مِّن ذَٰلِكُمْ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ (آل عمران: ۳/۱۵)

کہو! میں تمہیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے جولوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں انھیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی۔ پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کے رضا سے وہ سرفراز ہوں گے، اللہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے۔

جب زن و شو کے دلوں میں شکوک وشبہات بس جائیں، محبت ومودت کی جگہ خیانت ودناءت لے لے یا دونوں میں عقیدۃً اختلاف ہوجائے تو وہاں زوج کے برعکس ''اِمرأۃ'' کا لفظ لایا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کے اسلوب بیان سے مترشح ہوتا ہے۔

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتَ نُوحٍ وَامْرَأَتَ لُوطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا (التحریم: ۶۶/۱۰)

اللہ کافروں کے معاملہ میں نوح اور لوط کی بیویوں کو بطور مثال پیش کرتا ہے وہ ہمارے دو صالح بندوں کی زوجیت میں تھیں مگر انھوں نے اپنے ان شوہروں سے خیانت کی اور وہ اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ بھی کام نہ آسکے۔

اسی طرح فرعون کی بیوی کے لیے ''اِمرأۃ'' کا لفظ آیا ہے کیوں کہ

دونوں کے درمیان زوجیت کا تصور مفقود تھا، کیوں کہ فرعون کافر تھا اور اس کی بیوی مومنہ تھیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً لِّلَّذِيْنَ آمَنُوا اِمْرَأَةَ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتاً فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ (التحریم:۶۶/۱۱)

اور اہل ایمان کے معاملہ میں اللہ فرعون کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے۔ جب کہ اس نے دعا کی: اے میرے رب! میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنادے۔ اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچالے اور ظالم قوم سے مجھے نجات دے۔

اسی طرح جب زن وشوہر کے درمیان زوجیت بانجھ پن یا بیوگی کی وجہ سے دم توڑ دے تو وہاں بھی قرآن ''زوج'' کے برعکس ''اِمراۃ'' کا ہی لفظ استعمال کرتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت عمران کی بیویوں کے لیے امراۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَامْرَأَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِنْ وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوْبَ (ہود:۱۱/۷۱)

ابراہیم کی بیوی بھی کھڑی ہوئی تھی وہ یہ سن کر ہنس دی، پھر ہم نے اسے اسحاق کی اور اسحاق کے بعد کی خوشخبری دی۔

سورہ آل عمران میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قَالَ رَبِّ أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلَامٌ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَأَتِيْ عَاقِرٌ (ال عمران:۳/۴۰)

زکریا نے کہا: پروردگار! بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہوگا؟ میں تو بہت بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔

اسی طرح جب طلاق یا ایلا کی وجہ سے زوجیت کا تعلق ختم ہوجائے تو ازواج کے بجائے قرآن کریم میں ''نساء'' کا لفظ آیا ہے۔ جیسے سورہ طلاق میں آیا ہوا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاء فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ (الطلاق:۶۵/۱)

اے نبی! جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے لیے طلاق دیا کرو، اور عورت کے زمانے کا ٹھیک ٹھیک شمار کرو۔

اسی طرح سورہ بقرہ میں اللہ کا ارشاد ہے:

لَّا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن طَلَّقْتُمُ النِّسَاء مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ (البقرہ:۲/۲۳۶)

تم پر کچھ گناہ نہیں اگر اپنی عورتوں کو طلاق دے دو قبل اس کے کہ ہاتھ لگانے کی نوبت آئے۔

مذکورہ آیت سے یہ بات منقح ہو کر سامنے آ گئی کہ زوج، امراۃ اور نساء تینوں کا محل استعمال جدا جدا ہے۔[۱۹] قرآن کریم کے اس انداز بیان اور لسانی اسرار کو وہی سمجھ سکتا ہے جو قرآنی لسانیات کا عالم ہو۔

قرآن کریم میں دو الفاظ ''النعمۃ'' اور ''النعیم'' بار بار آئے ہوئے ہیں اور دونوں کے معنی نعمت ہیں لیکن قرآن کے اعجاز بیان کے نقطہ نظر سے ان دونوں لفظوں کا تحلیل و تجزیہ کیا جائے تو دونوں میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ نعمت کا لفظ قرآن کریم میں ۵۳ بار آیا ہوا ہے ان تمام مقامات پر یہ دنیاوی نعمت کے لیے آیا ہوا ہے۔ سورہ الدخان میں بنی اسرائیل کے متعلق مذکور ہے:

كَمْ تَرَكُوا مِن جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ. وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ. وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ (الدخان:۴۴/۲۵-۲۷)

کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے کتنے ہی عیش کے سروسامان جن میں وہ مزے کر رہے تھے۔

سورہ الضحیٰ میں ارشاد ربانی ہے:

وأما بنعمة ربک فحدث — اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔
(الضحیٰ:۹۳/۱۱)

سورہ بقرہ میں ارشاد خداوندی ہے:

وَمَن يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءتْهُ فَإِنَّ اللّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (البقرہ:۲/۲۱۱) — اور اللہ کی نعمت پانے کے بعد جو قوم اس کو تبدیل کرتی ہے اسے اللہ سخت سزا دیتا ہے۔

مذکورہ آیات کریمہ میں "نعمة" دنیاوی نعمتوں کے لیے آیا ہے اور "النعیم" اخروی نعمتوں کے لیے آتا ہے۔ سورہ المائدہ میں آیا ہوا ہے:

وَلأدْخَلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ (المائدۃ:۵/۶۵) — اور لازماً ہم انھیں نعمت بھری جنتوں میں داخل کریں گے۔

سورہ الطّور میں اللہ کا ارشاد ہے:

ان المتقین فی جنات ونعیم (الطّور:۵۲/۱۷) — یقیناً اللہ سے ڈرنے والے باغات اور نعمت میں ہوں گے۔

سورہ یونس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ (یونس:۱۰/۹) — نعمت بھری جنتوں میں ان کے نیچے نہریں رواں ہوں گی۔

مذکورہ آیت کریمہ میں نعیم کا تعلق آخرت سے ہے۔ صرف سورہ تکاثر "ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ" میں مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں پر دنیاوی نعمت مراد ہے۔ لیکن یہاں بھی اگر غور کیا جائے تو اخروی نعمت ہی مراد ہے۔ در اصل یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو دنیا میں ہر طرح سے پھنسے ہوئے ہیں۔ انھیں مادیت کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ انھیں آخرت کی کامیابی کی دعوت دی جا رہی ہے لیکن اس پر ذرہ برابر توجہ نہیں دیتے وہ آخرت کو ایک شی موہوم تصور کرتے ہیں۔ جب آخرت میں وہ تمام اشیاء موعودہ کو بچشم خود دیکھ لیں گے تو ان

سے کہا جائے گا یہی حقیقی کامیابی اور حقیقی نعمت ہے[۲۰]

قرآن کریم میں لفظ ''آلاء'' بھی آیا ہوا ہے جس کی واحد ''إلیٌ'' ہے اس کا مفہوم بھی نعمت ہے۔ سورہ ''الرحمن'' میں بار بار آیا ہوا ہے۔ سورہ رحمٰن کا مطالعہ کیا جائے تو دنیا کی تمام نعمتیں کرشمہ سازیاں اور عجائب سب کچھ اس میں شامل ہیں۔ سورہ رحمٰن میں دنیاوی اور اخروی دونوں نعمتوں کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ''فَبِأَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَان'' آیا ہوا ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''الآلاءَ'' کا ''نعمت'' اور ''نعیم'' دونوں پر اطلاق ہوگا۔ مولانا فراہی کے نزدیک ''الآلاءَ'' سے اللہ تعالیٰ کے عجائب مراد ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

''اجمعوا علی أن معناه النعم ولکن القرآن واشعار العرب یاباه والظاهر ان معناه الأفعال العجیبة فارسیة کرشمة ولما کان غالب فعاله تعالی الرحمة ظنوا ان الآلاء هی النعیم.[۲۱]

عمومی رائے یہ ہے کہ ''الآلاءَ'' کا مفہوم نعمتیں ہیں۔ لیکن قرآن کریم اور اشعار عرب سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ اس کا حقیقی مفہوم حیران کن کارنامے ہیں جسے فارسی میں کرشمہ کہیں گے چوں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام کاموں میں رحمت کا پہلو غالب ہے اس وجہ سے لوگوں کا گمان ہے کہ اس کا مفہوم نعمتیں ہیں۔

مولانا فراہی نے کلام عرب سے کئی مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً میہّ بنت ضرار اپنے بھائی کا مرثیہ کہتے ہوئے فرماتی ہیں:

کریم ثناه و آلاؤه - وکافی العشیرة ماغالها[۲۲]

حضرت موسیٰ علیہ کے واقعہ میں سانپ کا ذکر آیا ہے۔ اس کے لیے ایک جگہ ''حیة'' کا اور دوسری جگہ ''ثعبان'' کا لفظ آیا ہوا ہے۔ لیکن یہ دونوں ہم معنی نہیں ہیں۔ ''حیة'' کے معنی صرف سانپ کے ہیں اور ''ثعبان'' سانپ کی

ایک قسم اژدہا ہے۔ "ثعبان" دراصل نالی میں بہتے ہوئے پانی کو کہتے ہیں۔ بہتے ہوئے پانی کا مشاہدہ کرنے والے کو معلوم ہے کہ جب پانی نالی میں تیزی سے چلتا ہے تو اس کا انداز سانپ کی مانند ہوتا ہے، پانی بھی سانپ کی طرح سر اٹھائے ہوئے سنسناتا ہوا گزرتا ہے۔ خش وخاشاک کے ساتھ پانی کی سرسراہٹ بالکل اسی طرح ہوتی ہے جس طرح کھیتوں کی کھڑی فصلوں کے درمیان سے ہو کر جب سانپ گزرتا ہے تو خاص انداز کی کھڑکھڑاہٹ ہوتی ہے۔

بہر کیف قرآن کریم زبان و بیان اور رعنائی و جمال کی ایک ایسی چوٹی پر فائز ہے جہاں تک پہنچنے کے لیے تمام انسانی کاوشیں اور تدابیر فیل ہیں، عرب اعجاز بیان کے بواطن سے واقف تھے لیکن اپنی تمام تر توانائی اور فصاحت و بلاغت کے باوجود اس کی ہم سری ان سے پرے تھی یہاں چند آیات اعجاز بیان کی توضیح وتفسیر کے لیے پیش کی جارہی ہیں۔ مثلاً توحید کی عظمت ورفعت کے لیے کس قدر حسین انداز اختیار کیا گیا ہے۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (ابراہیم: ۱۴/ ۲۴)	کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال پیش کی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے۔ اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔

ایک جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے بتایا گیا کہ جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو رات تھی، اہل شہر محو خواب تھے اور فضا بے حس وحرکت تھی، اس منظر کو کتنے خوبصورت پیرائے میں قرآن نے بیان کیا ہے۔

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا (القصص: ۲۸/ ۱۵)	اور (موسیٰ) اس وقت شہر میں داخل ہوئے جب شہر والے بے خبر تھے۔

اس طرح صبح کے نمودار ہونے کے لیے جس لفظ کا انتخاب کیا گیا ہے، اس سے بھی طلوع صبح کا ایک خوبصورت منظر سامنے آتا ہے۔ نیز جس طرح ہاتھ پیر مارتے ہوئے اور رات کو تاریکی کو چیرتے ہوئے صبح سامنے کھڑی ہوتی ہے اسے قرآن کریم نے یوں بیان کیا ہے:

والصبح اذا تنفس (التکویر: ۸۱/۱۸) اور قسم کھاتا ہوں صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے۔

اسی طرح میدان حشر میں کفار ومشرکین اپنی بے بسی، بے کسی اور لاچاری کا اظہار اس طرح کریں گے:

وقال الکافر یٰلیتنی کنت ترابا (النبا: ۷۸/۴۰) اور کافر کہہ اٹھے گا اے کاش میں خاک ہوتا۔

مولانا اصلاحی نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''یعنی اس دن ہر شخص کے اعمال اس کے سامنے آئیں گے اور جنھوں نے اس دن کے لیے کوئی تیاری نہ کی ہوگی وہ اپنی محرومی اور بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے کہ کاش ہم مٹی میں رہے ہوتے۔ ہمارا وجود ہی نہ ہوا ہوتا''۔[۲۳]

سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کی گئو پرستی اور شرک کا ذکر فصیح انداز میں کیا گیا ہے۔

واشربوا فی قلوبھم العجل بکفرھم (البقرہ: ۲/۹۳) ان کے کفر کے باعث بچھڑے کی پرستش ان کے دلوں میں رچ بس گئی۔

سورہ بقرہ میں یہود ونصاریٰ کو مخاطب کر کے دعوت دی گئی ہے کہ اگر اللہ کے رنگ میں خود کو رنگنا چاہتے ہو تو یہودیت اور نصرانیت سے باز آجاؤ۔ یہ انداز تخاطب فصیح وبلیغ ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ (البقرہ:۲/ ۱۳۸)

کہہ دو! اللہ کا رنگ اختیار کرو اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں۔

مذکورہ سطور میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ اس کتاب آسمانی کا انداز تمام شکوک وشبہات اور موانع ومشکلات سے پاک ہے۔ یہ بھی وضاحت کی گئی کہ قرآن کریم کے اعجاز بیان اور حسن اظہار کے لیے نظم قرآن کی مساعدت از حد ضروری ہے۔ اس کے بعد اس کے مختلف خصائص کی جستجو ناممکن ہے۔ یہی نظم قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ کتاب قطعی الدلالہ ہے، قرآنی الفاظ میں ترادف کا تصور بعید از عقل ہے، الفاظ کے مواقع استعمال کی خوبی نظم قرآن کے بغیر سامنے نہیں آسکتی۔ مقالہ کے آخر میں چند آیات کریمہ نقل کرکے یہ وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ فصاحت وبلاغت، یہ زور بیان، یہ تاثیر وتحریک اور یہ قوتِ اظہار فطرت انسانی سے بالاتر ہے۔ یہ کتاب حرف حرف اور لفظ لفظ اپنے دامن میں اتنے محاسن سمیٹے ہوئے ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ پندرہ سو سال گزرنے کے باوجود بھی اس کی زبان میں وہی طراوت اور وہی تازگی ہے۔ مختصر یہ کہ تا قیامت اس کی زبان اور اس کے فکر میں یہی جوش نمو باقی رہے گا۔

حواشی

۱۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: معجزہ قرآنی کی نوعیت، مولانا عبدالسلام ندوی، معارف، اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۵۰ء، ۶۶/۴، ص: ۲۶۳۔۲۴۵، نومبر ۱۹۵۰ء، ۶۶/۵، ص: ۳۲۵۔۳۲۶

۲۔ قرآن کریم کا اعجاز بیان، عائشہ عبدالرحمٰن بنت الشاطی، بار اول، اکتوبر ۱۹۹۱ء، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ص: ۵۱

۳۔ مفردات القرآن، الامام عبدالحمید الفراہی (تحقیق وشرح الدکتور اجمل ایوب الاصلاحی)، دار الغرب الاسلامی، الطبعۃ الاولی ۲۰۰۲ء، ص: ۱۳۵

۴۔ شعراء النصرانیہ (جمعہ ووقف علیہ طبعہ وصححہ الاب لویس شیخو الیسوعی)، مطبعۃ الآباء المرسلین الیسوعیین فی بیروت، ۱۸۹۰ء، ۱/۵۸۳

۵۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، بار اول، ۱۹۸۹ء، تاج کمپنی، دہلی، ۱/ ۱۷۔۲۷

۶۔ قرآن کریم کا اعجاز بیان، عائشہ عبدالرحمٰن بنت الشاطی، بار اول، اکتوبر ۱۹۹۱ء، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ص: ۱۲۲

۷۔ مقدمہ تفسیر نظام القرآن، استاذ امام مولانا حمیدالدین فراہی (ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی)، طبع اول، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ، ص ۱۵

۸۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: ایضاً، ص: ۹۔۱۰

۹۔ رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن، عبدالحمید الفراہی الطبعۃ الثانیۃ، دائرۃ

الحمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ (الہند)، ص:٦٦

۱۰۔ قرآن کریم کا اعجاز بیان، ص:٢٦٨

۱۱۔ ایضاً، ص:۲۷۰

۱۲۔ مفردات القرآن، ص:۵۰۔۵۱

۱۳۔ قرآن کریم کا اعجاز، ص:۲۷۵۔۲۷۶

۱۴۔ پورا شعر:

حلفت فلم اترک لنفسک ریبة　　　ولیس وراء الله للمرء مذهب

(دیوان النابغة الذبیانی (تحقیق وشرح: کرم البستانی) مکتبہ صادر، بیروت، ۱۹۵۳ء، ص:۲۳

۱۵۔ یہ اعشیٰ کے دیوان میں اس طرح موجود ہے:

حلفت برب الراقصات الی منی　　　اذا مخرم جاوزته بعد مخرم

(کتاب الصبح المنیر فی شعر ابی بصیر میمون بن قیس بن جندل الاعشی والاعشیین الآخرین، مطبعۃ آدلف ہلزہوسن بیانہ، ۱۹۲۷ء، ص:۹۴

۱۶۔ لسان العرب میں ''ح.ل.ف'' کے تحت مزید مثالیں اور اشعار دیکھے جاسکتے ہیں۔

۱۷۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: قرآن کریم کا اعجاز بیان، ص:۲۸۱۔۲۸۵

۱۸۔ اقسام القرآن، استاذ امام حمید الدین فراہی (ترجمہ: امین احسن اصلاحی) دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی، اپریل ۲۰۰۹ء، ص:۳۷

۱۹۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: قرآن کریم کا اعجاز بیان، ص:۲۹۱۔۲۹۳

۲۰۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: ایضاً، ص:۲۹۸۔۳۰۱

۲۱۔ مفردات القرآن لعبد الحمید الفراہی، ص:۱۲۵۔۱۳۳

۲۲۔ شاعرات العرب فی الجاہلیۃ والاسلام (جمعہ ورتبہ ووقف علی طبعہ، بشیر یموت) الطبعۃ الاولی، المبطعۃ الوطنیۃ، ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء، ص:۸۴

۲۳۔ تدبر قرآن، امین حسن اصلاحی، تاج کمپنی، دہلی، بار اول، ۱۹۸۹ء، ۹/۱۶۶

☆☆☆

اردو اسلوب بیان اور
مولانا امین احسن اصلاحیؒ

ابوسفیان اصلاحی

اردو کے ارتقائی منازل موضوع گفتگو ہوں تو اردو زبان وادب کے تین دبستانوں لکھنؤ، حیدرآباد اور دہلی پر جاکر تھم جاتا ہے، جبکہ اس کے علاوہ ہندوستان کے بہت سے ایسے خطے ہیں جنہوں نے اردو کی تعمیر وترقی میں ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں، انہی متذکرہ خطوں میں اعظم گڑھ بھی سرفہرست شامل ہے۔[1] اسلامیات اور اردو ادبیات پر ہزارہا معیاری تصانیف ترتیب دی گئیں جن کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اردو کا دامن وسیع ہوا بلکہ علمی وتحقیقی اعتبار سے اسے استحکام نصیب ہوا، ادباء میں علامہ شبلی نعمانی، مرزا احسان بیگ، سبط حسن، شکیل احمد، خلیل الرحمٰن اعظمی، مولانا عبدالسلام ندوی، انجم اعظمی، علی جواد زیدی، شمس الرحمٰن فاروقی، شاہد ماہلی، شعیب اعظمی اور عبداللطیف اعظمی وغیرہ، شعراء میں کیفی چریاکوٹی، اقبال سہیل، انور اعظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، فضا ابن فیضی، کیفی اعظمی، شمیم کرہانی، یحییٰ اعظمی، اور راشد اعظمی وغیرہ اور علماء کرام میں فاروق چریاکوٹی، مولانا عنایت رسول، علامہ شبلی نعمانی، مولانا محمد اسلم جیراجپوری، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا امین احسن اصلاحی، قاضی اطہر مبارکپوری، مولانا نجم الدین اصلاحی، مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا وحیدالدین

خاں، مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی، پروفیسر الطاف احمد اعظمی اصلاحی، مولانا سلطان احمد اصلاحی اور ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، وغیرہ کے اسماء گرامی لئے جاسکتے ہیں، مذکورہ تمام شخصیات نے اردو زبان کے توسط سے فکروفن کے مختلف میدانوں میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، اردو زبان وادب کی تزئین میں ان کی کاوشیں تاقیامت محو نہیں ہوسکتیں۔

اس مضمون میں مولانا امین احسن اصلاحی کی مختلف جہتوں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ وضاحت کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ اردو زبان کے فروغ، اس کی توسیع وترویج اور اسے تحقیقی وتنقیدی زبان بنانے میں مولانا نے نمایاں رول ادا کیا، اپنے استاذ گرامی مولانا حمید الدین فراہی کی ملاقات سے قبل وہ ایک ادیب بننے کے خواستگار تھے[۲] وہ ایک ادیب تو نہ بن سکے لیکن قرآنیات اور اسلامیات سے متعلق آپ کی تمام تصانیف میں انشاء پردازی کا عنصر سرخیل کی مانند موجود ہے، چونکہ دبستانِ شبلی سے تعلق ہے اس لئے آپ کے زبان وبیان میں رعنائی اور غضب کی جاذبیت ہے، تدبر قرآن میں بیشمار ایسے مقامات ہیں جہاں علامہ شبلی نعمانی کی ''ظہورِ قدسی[۳]'' کا پرتو، یا ''غبار خاطر'' کا عکس موجود ہے، مولانا اردو زبان کی نزاکتوں سے بخوبی واقف تھے، مولانا نے مفسّر، مترجم، صحافی، محقق اور مبلغ کی حیثیت سے اردو زبان کی نوک و پلک درست کرنے میں سنگِ میل کی طرح ہیں۔

تدبر قرآن:

تفاسیر اور تراجمِ قرآن نے اردو کو ایک مکمل اور منظم زبان بنانے میں قابل ذکر خدمات انجام دیں، عربی کے بعد اردو وہ دوسری زبان ہے جس میں تمام دیگر زبانوں سے زیادہ تراجم وتفاسیر منظرِ عام پر آئے، اردو کی ترویج

واشاعت سے متعلقہ خدمات کا جائزہ لیا جائے تو شاید مفسرین کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہوگا، اسی طرح اسلامی محققین و مصنفین نے اردو زبان میں اتنا بڑا ذخیرہ پیش کیا کہ جس کی مثال اہل اردو کے یہاں ملنی مشکل ہے، اسی حقیقت سے مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر 'تدبر قرآن' کا جائزہ لیا جائے تو اردو زبان کے تفوق وترفع میں اس کا نا قابلِ فراموش کارنامہ ہے، اسلوب حد درجہ حسین وجمیل، تاثیر کی تمام صفات سے مملوء، قاری کی ذہنی سطح کا پاس ولحاظ، پڑھئے تو دریا کا بہاؤ، کثافت کا دور دور تک پتہ نہیں اور لذّت ولطافت ایسی کہ طبیعت سیر نہ ہو، تدبر قرآن کی زبان میں یہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں، اس میں بیشمار علاقائی الفاظ بھی مستعمل ہیں۔

سب سے پہلے تراجم آیات کی کچھ مثالیں پیش کی جائیں گی تاکہ اندازہ کیا جاسکے کہ اردو ترجمہ پر مولانا کس قدر قادر ہیں، عربی الفاظ کے متبادل اردو الفاظ کے انتخاب کے پیچھے صرف ان کا ادبی ولسانی ذوق شامل ہے، مولانا کے ترجمہ میں مولانا مودودیؒ جیسی ترجمانی نہیں ہے، تراجم میں آیاتِ کریمہ کے الفاظ کا پورا پورا لحاظ کرتے ہوئے ایسی سلاست پیدا کی ہے جو ''تفہیم القرآن'' کی ترجمانی میں موجود نہیں ہے یہ انداز وہی اختیار کرسکتا ہے، جس کو عربی اور اردو دونوں پر عبور ہو، تراجم آیات کے چند نمونے پیش کئے جارہے ہیں۔

''الحمد للہ'' شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے (تدبر قرآن)

''الحمد للہ'' تعریف اللہ ہی کے لئے ہے (تفہیم القرآن)

یہاں پر ''حمد'' کا ترجمہ شکر کیا گیا ہے، شکر میں جس قدر وسعت ہے اس کا احاطہ لفظ ''تعریف'' سے ممکن نہیں، شکر سے حمد کا مفہوم سمیٹا نہیں جاسکتا ہے، لیکن اردو میں یہ لفظ'' انہی خوبیوں اور انہی کمالات کے اعتراف کے

موقع پر بولا جاتا ہے جن کا فیض آدمی کو پہنچ رہا ہو، بر عکس اس کے حمد ہر قسم کی خوبیوں اور ہر قسم کے کمالات کے اعتراف کے لئے عام ہے، خواہ ان کا کوئی فیض خود حمد کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو یا نہ پہنچ رہا ہو، تاہم شکر کا مفہوم اس لفظ کا جزو غالب ہے، اس لئے اس کے ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کرنے کے لئے یا تو تعریف کے لفظ کے ساتھ شکر کا لفظ بھی ملانا ہوگا یا پھر شکر ہی کے لفظ سے اس کو تعبیر کرنا زیادہ مناسب رہے گا تاکہ یہ سورہ جس احساس شکر اور جس جذبۂ سپاس کی تعبیر ہے اس کا پورا پورا اظہار ہو سکے''[۵]

چند تراجم آیات اور ملاحظہ فرمائیں:

وأُشربوا فی قلوبهم العجل بکفرهم (البقرة: ۲/۹۳)	اور ان کے کفر کے سبب سے بچھڑے کی پرستش ان کی دلوں میں رچ بس گئی۔[۶]
''انه لکبیرکم الذی علمکم السحر فلسوف تعلمون'' (الشعراء: ۲۶/۴۹)	بیشک وہی تمہارا گرو ہے، جس نے تمہیں جادو کی تعلیم دی ہے،[۷]
''لا یسئلون الناس الحافا'' (البقرہ،۲/۲۷۳)	وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے،[۸]
''تاکلون التراث اکلاً لماً وتحبون المال حباً جماً کلا اذا دکت الارض دکاً دکاً'' (الفجر،۸۹/۱۹۔۲۱)	اور وراثت کو سمیٹ کر ہڑپ کرتے ہیں اور مال کے عشق میں متوالے ہو، ہرگز نہیں اس وقت کو یاد رکھیں جب زمین کوٹ کوٹ کر برابر کردی جائے گی۔[۹]
قلوب یومئذ واجفة، ابصارها خاشعة، (النازعات،۷۹/۸۔۹)	کتنے دل اس دن دھڑکتے ہوں گے، ان کی نگاہیں پست ہوں گی[۱۰]

وجوہ یومئذ مسفرۃ، ضاحکۃ مستبشرہ ووجوہ یومئذ، علیھاغبرۃ، ترھقھا قترۃ، اولئک ھم الکفرۃ الفجرۃ، (عبس:۸۰/ ۳۸۔۴۲)	کتنے چہرے اس دن روشن ہوں گے، ہشاش بشاش اور کتنے چہروں پر اس دن خاک اڑتی اور سیاہی چھائی ہوگی، یہی کافرو نابکار ہوں گے!!

مذکورہ تراجم آیات کی روشنی میں دو باتیں بالخصوص کہی جاسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ تراجمِ آیات میں الفاظ آیات کوملحوظ رکھا گیا ہے اور دوسرے لفظی تراجم کے ساتھ ساتھ زبان وادب کے اعلیٰ معیار کو برتنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے، قدیم تراجم قرآن کا سمجھنا اوراس کی تاثیر کو قبول کرنا مستبعد تھا، اگران تراجم کا موازنہ تدبر قرآن کے تراجم سے کیا جائے تو اس کی اہمیت وافادیت اور رعنائیِ بیان کا اندازہ لگانا دشوار نہ ہوگا، اس ترجمے میں تمام ادبی خصوصیات موجود ہیں، اس بات کی شعوری کوشش کی گئی ہے کہ ایسا اسلوب اختیار کیا جائے جس میں کسی طرح کا اغلاق نہ ہو، یہ حقیقت ہے کہ ترجمۂ تدبر قرآن کو اگر تفسیر تدبر قرآن کا نام دیا جائے تو ہرگز بے جانہ ہوگا، آیات کریمہ کے مفاہیم کی توضیح میں ترجمۂ قرآن کا اہم رول ہے، فہمِ قرآن کے باب میں اس ترجمے کی جو اہمیت ہے شاید بعض تراجم کو وہ اہمیت حاصل نہ ہو، چند تراجم آیات کے بعد تفاسیر آیات کے اقتباسات پیش کئے جائیں گے جن سے اندازہ ہوگا کہ زبان وبیان کے اعتبار سے تدبر قرآن کس اعلیٰ مقام ومرتبہ پر فائز ہے، سورہ انفال کی آیت ”وماکان صلاتھم عند البیت الامکاء وتصلیۃ فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون“ (انفال:۸/ ۳۵) کی تفسیر کرتے ہوئے غیر دینی امور پر کس قدر ادبی انداز میں تنقید کی ہے، مولانا رقم طراز ہیں:

”اگر کوئی شخص دین کا ذوق رکھتا ہوتو بہت سی بدعتوں کو ان کی ظاہری ہیئت ہی سے پہچان جاتا ہے کہ ان خرافات کا دین

سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا، تعزیہ داری کے رسوم، مزاروں پر
ہونے والی خرافات اور متصوفین کی مجالس کی حرکتیں ایسی
چیزیں نہیں ہیں جن کی لغویت کا فیصلہ کرنے کے لئے علمی
کاوش کی ضرورت ہو، ہر صاحب ذوق بیک نظر دیکھ کر فیصلہ
کرلیتا ہے کہ ان چیزوں کا دین سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں
ہوسکتا، دین کی ہر بات میں وقار، متانت، فروتنی، خشیت اور
پاکیزگی کی جھلک اور معرفت، حکمت، دانش اور روحانیت کی
مہک ہوتی ہے، جس کی آنکھوں میں کچھ بصیرت اور جس کی
روحانی قوتِ شامّہ میں ذرا بھی زندگی ہو تو وہ صرف دیکھ اور
سونگھ ہی کر جان جاتا ہے" [۱۲]

کفّار و مشرکین نے ہر جتن صرف اس لئے اختیار کئے کہ چراغِ اسلام
کو گل کردیں اور مسلمانوں کے حوصلوں کو پست کرکے دین اسلام کی راہ میں
حائل ہوجائیں، اپنے حصولِ مقصد کے لئے انہوں نے بے پناہ روپے صرف
کئے، اس کی تصویر مولانا نے کتنے خوبصورت انداز میں پیش کی ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ راہِ حق سے روکنے کے لئے یہ زر پاشیاں
جو ہورہی ہیں ان سے مرعوب نہ ہوں، ان خزف ریزوں اور تنکوں سے اس
سیلاب کے مقابل میں بند نہیں باندھا جاسکے گا جو آرہا ہے، بیشک انہوں نے بڑی
فیاضی سے خرچ کیا ہے، اور بھی یہ خرچ کریں گے لیکن ان تمام زر پاشیوں کا
حاصل کفِ افسوس ملنے کے سوا اور کچھ نہ نکلے گا، یہ بہت جلد منہ کی کھائیں گے،
دنیا میں ان کے لئے شکست مقدر ہوچکی ہے، اور آخرت میں یہ جہنم کی طرف
ہانک کر لئے جائیں گے" [۱۳]

''مسجد ضرار'' کے مقاصد کی تفصیلات حسین پیرایہ میں پیش کی گئی ہیں، ایک طرف اگر حقیقت کی عکاسی ہے تو دوسری طرف اظہارِ بیان کی ایک اعلیٰ وارفع مثال۔

''اس کی پہلی غرض یہ بتائی گئی کہ یہ ضرار کے لئے بنائی گئی ہے، یعنی اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے، مسجد، اقامتِ نماز اور اقامتِ دین کا مرکز ہوتی ہے، لیکن یہ دامِ ہمرنگ مسجد اس لئے بچھایا گیا تھا کہ مسلمان اس میں پھنسے اور پھر ان کے اندر آہستہ آہستہ نفاق کا زہر اتارا جائے۔

دوسرا مقصد اس کا کفر بتایا گیا ہے یعنی جو کفر ان کے اندر رچا بسا ہوا تھا اس کی پرورش اور اس کی تائید وتقویت کے لئے ایک پرورش گاہ بنائی گئی تھی، مسجد ایمان کی تربیت گاہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ نام نہاد مسجد بالکل اس کے برعکس کفر کی خدمت کے لئے تعمیر کی گئی۔

تیسرا مقصد اس کا ''تفریقاًبین المؤمنین'' بتایا گیا ہے، یعنی اس غرض سے بنائی گئی ہے کہ مسلمانوں کے شیرازے کو پراگندہ کیا جائے، اسلام میں مسجد ہی ہے جو مسلمانوں کو ایک سلک میں پروتی اور ان کی زندگی میں وحدت وتالیف پیدا کرتی ہے، ان منافقین نے یہ چاہا کہ ایک مسجد بنا کر پہلے مسلمانوں کو اس کی طرف کھینچیں اور پھر اپنی وسوسہ اندازیوں سے ان کو ملت سے کاٹ دیں''[۱۴]

''تصریف الریاح'' کی تشریح مولانا نے اس انداز سے فرمائی ''یعنی ہواؤں کی گردش میں بھی خدا کی قدرت، رحمت، ربوبیت اور اس کی نقمت کی نشانیاں موجود ہیں، صاف ہوتا ہے کہ ایک ہی مصرف کے ہاتھ میں ان کی باگ ہے، اور وہی اپنی حکمتوں کے تحت ان کو استعمال کرتا ہے، اگر وہ ان کو روک دے، تو چشمِ زدن میں ساری، دنیا تباہ ہوجائے، وہ چاہے تو ایک قوم کے لئے

اس کو رحمت بنادے، اور دوسری قوم کے لئے نقمت، اسی ہوا کی گردش سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات بخشی اور اسی کی گردش سے فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کیا، آئے دن یہ بات مشاہدہ میں آتی رہتی ہے، کہ کسان اپنی فصل کے مستقبل سے نہایت مطمئن ہوتے ہیں، لیکن دفعتہً کوئی ہوا ایسی چل جاتی ہے کہ مستقبل کے آلات لئے ہوئے سازگار ہوا کے انتظار میں چشم براہ ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں کہ سازگار ہوا چلادے، اس زمانے میں سائنس کی بدولت اگرچہ انسان کے اندر یہ زعم پیدا ہوگیا ہے کہ اس نے ابر وہوا کو بڑی حد تک اپنے قابو میں کرلیا ہے لیکن قدرت ذرا سا جھنجھوڑ دیتی ہے تو اس ادعا کا سارا بھرم کھل جاتا ہے، یہ باتیں اس بات کی صاف شہادت دیتی ہیں کہ ایک ہی ذات ہے جو اس کائنات کے تمام عناصر پر حکمراں ہے، اس کے اذن کے بغیر ایک پتہ بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا'' [۱۵]

مذکورہ اقتباسات سے یہ بات پوری طرح عیاں ہے کہ تفسیر ''تدبر قرآن'' کا اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں نہایت اہم رول ہے، اس کے بیشمار ایسے اقتباسات ہیں جن میں زبان وادب کی ایسی لذت ورعنائی ہے کہ جو دامن دل کو چھولیتی ہے، پڑھنے والا مسحور ومبہوت ہو جائے، لفظ لفظ ادب عالیہ کا نمائندہ، جملے کانوں میں رس گھولتے ہیں، ''تدبر قرآن'' کی ایک ادبی خصوصیت یہ بھی ہے کہ مختلف مقامات پر عربی اشعار نقل کئے گئے ہیں، ان کے تراجم میں بھی مولانا نے مہارت تامہ کا ثبوت دیا ہے، ان تراجم میں وضاحت کے ساتھ بلا کی سلاست ہے، اسی طرح ''تدبر قرآن'' میں بیشمار فارسی اور اردو کے اشعار نقل کرکے اگر ایک طرف استدلال ہے تو دوسری طرف ''غبارِ خاطر'' یا ''مکتوبات ربانی'' کا پورا پورا عکس موجود ہے۔

مولانا کے مختلف تراجم کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے چند معتبر اور قابلِ قدر مترجمین میں آپ کا نام نامی ضرور شامل ہوگا، پیچھے آیاتِ کریمہ کے تراجم سے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ آپ نے زبان و بیان کی اعلیٰ مثال پیش کی ہے، تراجم ''تدبر قرآن'' میں Apeeling، سادگی اور پرکاری ہے۔اسی طرح آپ نے مولانا فراہی کی تفسیر ''نظام القرآن'' کا ترجمہ کر کے اردو زبان وادب میں ایک بلند پایہ اضافہ کیا ہے تو دوسری طرف اردو دنیا کو ایک فکری ندرت سے روشناس کیا ہے، اس ترجمہ کی خصوصیات جو بھی ہوں لیکن اردو قارئین کے حلقوں میں فکر فراہی کی ایک بھرپور نمائندگی ہے،اگر یہ تراجم نہ ہوتے تو علمی دنیا اس تفسیری ورثہ سے محروم ہوتی، یہاں ''نظام القرآن'' کے دو اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔تفسیر سورہ عبس کی آیت کریمہ ''عبس وتولّٰی أن جاءہ الأعمی'' پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا فراہی نے فرمایا:۔

> ''یہاں بھی وہی مضمون ہے،قرآن مجید نے تعلیم کو مؤثر اور دلنشیں بنانے کے لئے ، نابینا کے مناسب حال واقعہ کو بطور مثال اختیار کرلیا ہے اور پیغمبر محمد ﷺ کو تبلیغ ودعوت میں اصرار کی اس حد سے روکا ہے جو آپؐ کے منصب کے شایانِ شان نہیں ہے اور گو کلام کا ظاہر اسلوب تنبیہ وعتاب کا ہے، لیکن درحقیقت ان تمام مواقع میں، جب محمد ﷺ کو منکرین سے اعراض کا حکم دیا جاتا ہے،غصہ وعتاب کا اصلی رخ پیغمبر محمد ﷺ کے بجائے منکرین ہی کی طرف ہوتا ہے اور یہ اتمام دعوت کا ایک معروف اسلوب ہے، جس سے اہل نظر ناواقف نہیں ہو سکتے''[۱۶]

''فالمقسمات امراً'' کی جو تفسیر مولانا فراہی نے کی ہے اس کا ترجمہ مولانا اصلاحی نے کتنا خوبصورت کیا ہے۔

''اور ہواؤں کے تصرفات اور ان کے فرق و امتیاز کی رنگیاں عجیب وغریب ہیں، ایک قوم کے ساتھ ان کا معاملہ کچھ اور ہوتا ہے، دوسری قوم کے ساتھ کچھ اور، کسی قوم کے لئے یہ ابرِ کرم کی بشارت بن کر نمودار ہوتی ہیں، کسی قوم کے لئے طوفانِ عذاب بن کر''۔ ١٧

اپنی تفسیر نظام القرآن میں مولانا فراہی نے ''توبوا توبۃً نصوحاً'' کا مفہوم اس طرح بیان کیا۔

''یہاں توبہ سے مراد وہ کامل توبہ ہے جس کے بعد کسی اختلاف و اعراض کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے یہ توبہ پورے دل کے جھکاؤ اور قلب کے کامل انقیاد کے بعد ظہور میں آتی ہے، اسی توبہ سے میاں بیوی دو جسم ایک جان بنتے ہیں، یہی توبہ ہے جس سے بندہ اپنے مولیٰ کی بندگی میں فنا ہوتا ہے اور مولی اس کا کان، اس کی آنکھ اور اس کا دل بن جاتا ہے''۔ ١٨

مذکورہ اقتباسات کے علاوہ بہت سے اقتباسات پیش کئے جاسکتے ہیں، یہ بات مسلّم ہے کہ مولانا اصلاحی نے بڑے خوبصورت انداز میں نظام القرآن کا ترجمہ پیش کیا ہے، یہ نہ صرف ترجمہ ہے بلکہ یہ چیز بھی ملحوظ رکھی گئی ہے کہ فکر فراہی کی عمدہ انداز میں ترجمانی ہوسکے، قارئین پڑھتے ہوئے کسی اضطراب اور الجھن کا شکار نہ ہوں، مولانا فراہی کے مخاطبین اور قارئین دراصل علماء کرام اور مخصوص اہل علم ہیں اس لئے نہایت اختصار اور غیر معمولی ایماء سے کام لیتے ہیں۔ ان

کے فکر، عبارتوں اور مدعائے کلام کا سمجھنا آسان نہیں ہے، ترجمہ میں مولانا اصلاحی نے یہ کوشش کی ہے کہ ان کے افکار کو اس طور سے اردو جامہ پہنایا جائے کہ تمام پہنائیاں واہو کر منظر عام پر آجائیں، قارئین کو کسی دقت کا سامنا نہ ہو، جنہوں نے ''نظام القرآن'' کو براہِ راست عربی زبان میں مطالعہ کیا ہے وہ مولانا کی خوبیوں سے بخوبی واقف ہیں، ''نظام القرآن'' کے مترجم کے لئے ضروری ہے کہ اس کی قرآنیات، فکرِ فراہی اور عربی زبان وادب پر دسترس ہو، خدا کا شکر ہے کہ مولانا اصلاحی ان خصائص سے متصف تھے۔

مولانا فراہی کے تمام قرآنی افکار عربی زبان میں ہیں، انہیں اردو دان حلقوں میں متعارف کرانے کا سہرا مولانا اصلاحی کے سر ہے، لیکن اب بھی بیشمار ایسی مکمل اور نامکمل تصانیف ہیں جو مخطوطات کی صورت میں موجود ہیں، بہت دنوں بعد سورہ بقرہ کی اشاعت روبعمل آئی اور اسے اردو قالب میں استاذ مکرم پروفیسر عبید اللہ فراہی نے پیش کیا۔ جو قسط وار مجلّہ ''نظام القرآن'' (مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ) میں شائع ہورہی ہے، اس کے علاوہ ''حکمت القرآن'' کو اردو زبان میں مرحوم خالد مسعود صاحب نے منتقل کیا۔ اسی طرح آپ کے بعض افکار کو مختلف کتابوں سے اخذ کر کے ''تفسیر قرآن کے اصول'' کے عنوان سے شائع کیا، جو اردو قارئین کے لئے حد درجہ مفید ہے، بہر کیف ادھر کافی چیزیں اردو قارئین کی تشفّی و تسلّی کے لئے آچکی ہیں جن کی مدد سے فکر فراہی تک رسائی آسان ہوگئی ہے، لیکن فکر فراہی کے اصل شارح مولانا امین احسن اصلاحی ہیں، آپ نے ان کی کتابوں ''اقسام القرآن'' اور ''ذبیح کون ہے'' کو ایک خاص اسلوب نگارش کے ساتھ اردو زبان میں پیش کیا، یہ دونوں کتابیں دنیائے اردو کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھیں، دونوں کتابوں سے ایک ایک اقتباس حاضر ہیں تاکہ ان کے طرز ندرت کو سمجھا جاسکے۔ ''اقسام القرآن'' کا

ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں جو مقسم بہ کی تقدیس سے متعلق ہے:۔

''زمانہ جاہلیت میں عربوں کا حال بھی یہی تھا وہ جس طرح لڑنے جھگڑنے میں طاق تھے اسی طرح قول کی پاسداری اور وفائے عہد میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، خانہ کعبہ ان کا سب سے بڑا معبد تھا اور اس کا احترام صلح و امن کا سب سے بڑا منادی۔ یہ اسی کا احترام تھا کہ حج کے مہینوں میں تمام فتنے سرد پڑ جاتے، جو عرب اپنی عام زندگی میں شیروں کی طرح خوفناک اور بھیڑیوں کی طرح خونخوار تھے وہ ان مہینوں کے آتے ہی بھیڑوں سے زیادہ حلیم و بردبار بن جاتے اور راہبوں کے لباس پہن کر اور امن و عدل کی تمام خوبیوں سے بن سنور کر اللہ کے گھر کے گرد اکٹھے ہوتے اور اس جگہ پہنچ کر دشمن اپنے دشمن سے اور حریف اپنے مقابل سے بغیر کسی خوف و اندیشے کے مل سکتا، یہی وجہ ہے کہ وہ مکہ کو ''صلاح'' اور ''ام الرحم'' بھی کہتے تھے، اور جب ان کو کوئی معاہدہ کرنا ہوتا تو وہ اسی معبد کے پاس آتے اور گویا خدا کے سامنے اپنے معاہدے مرتب کرتے''۔[19]

ایک اقتباس ''ذبیح کون ہے؟'' کا نقل کیا جا رہا ہے، جس میں حضرت ابراھیم علیہ السلام کے اس تعلق خاطر کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے باپ میں ان کے اندر موج زن تھا، مولانا اصلاحی نے اسے دل آویز انداز میں منتقل کیا ہے:۔

''ذرا تصور کیجئے کہ ایک صابر اور صاحبِ سوز و گداز انسان ہے جو بڑھاپے کی آخری منزل تک پہنچ چکا ہے، لیکن اولاد کی

نعمت سے محروم ہے، اس محرومی سے اس کا دل تنگ ہو رہا ہے
اور وہ اپنے پروردگار سے اولاد کے لئے پرسوز دعا کرتا ہے،
اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرما کر اولاد کی نعمت سے اس کی
آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے، اس قبول دعا پر اس کے دل کا ریشہ
ریشہ شکر کے جذبہ سے معمور ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس
کا نام ہی ''قبولِ دعا'' رکھ دیتا ہے۔ پھر تیرہ برس ایک لمحہ کے
لئے بھی اپنی پر محبت آغوش سے اس کو الگ نہیں کرتا، اکلوتا
بیٹا ہے، دعاء سے ہے، بڑھاپے کا چشم و چراغ ہے اور
صورتحال ایسی ہے کہ آئندہ اولاد کی کوئی امید نہیں، ان تمام
باتوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیجئے کہ ایسے بیٹے کے ساتھ ایسے
باپ کی محبت کا کیا عالم ہوگا''؟[۲۰]

مذکورہ دونوں اقتباسات کے لفظ لفظ شاہد ہیں کہ مولانا اردو زبان و ادب کے رمز شناس تھے، وہ الفاظ کی لطافتوں اور لسانی نزاکتوں سے بخوبی واقف تھے، مولانا فراہی کی دقیق وعمیق فکر کی گہرائیوں میں اترنا اور اس کے بعد اسے ایک دوسری زبان میں قلمبند کرنا کار دشوار است، لیکن مولانا اصلاحی نے اسے خوبصورت انداز میں پائے تکمیل کو اس لئے پہنچایا کہ وہ عربی، اردو اور فارسی زبان کی تہہ داریوں اور محاسن سے بخوبی واقف تھے اور الفاظ کی باطنی کیفیات پر ان کی نظر تھی، اب اس کے بعد ''مبادیٔ تدبر حدیث'' کو موضوع بحث بنایا جائے گا، حدیث کے مقام و مرتبہ کے تعین پر مختلف زبانوں میں بے شمار لٹریچر آچکا ہے، اس کے تعین میں بڑی ناہمواریاں برتی گئی ہیں اور حدیث کی تعریف میں غیر ذمہ داریوں کا ثبوت دیا گیا ہے، مولانا اصلاحی نے اپنی اس کتاب میں حدیث کو صحیح تناظر میں پیش کرنے کی مثالی کوشش کی ہے، یہاں بھی مولانا نے اپنے مباحث کو

اچھوتے انداز میں پیش کیا اور احادیث کے تراجم میں ہر حسن پیدا کرنے کا بیڑا اٹھایا، ایک جگہ حدیث رسول ﷺ پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"پیغمبر ﷺ کی حدیثوں میں معنوی جمال کے ساتھ ساتھ ایک ظاہری جمال بھی ہوتا ہے جو ان لوگوں کو نظر آتا ہے جو اس جمال سے آشنا ہو چکے ہوتے ہیں اس طرح کے ادا شناس ہر اس چیز میں جو حدیث رسول کے نام سے پیش کی جاتی ہے، اس جمال کو تلاش کر لیتے ہیں، اگر یہ چیز ان کو نہیں ملی تو وہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ یہ گہر نہیں بلکہ پشیز ہے جس کو گہر کے نام سے پیش کرنے اور لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جارہی ہے، اس کے برعکس اگر کسی دوسرے کا کلام رسول کے کلام کی حیثیت سے اس کے آگے پیش کیا جائے تو اس کو سنتے ہی وہ تاڑ جاتا ہے کہ یہ رسول ﷺ کا کلام نہیں ہے، اگر چہ اس میں کچھ حسن بھی ہو اور اگر وہ کوئی منکر بات ہو تب تو وہ بدرجۂ اولی اس کو رد کر دیتا ہے، اس لئے کہ وہ رسول کے کلام میں کسی منکر بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا"۔[۱۱]

احادیث کے تراجم میں بھی مولانا کے یہاں وہی انفرادیت ہے جو تراجمِ آیات میں، مولانا کلامِ رسول کی خوبیوں اور اس کی لسانی حکمتوں سے واقف تھے، ایک طرف اگر وہ احادیث کے مفاہیم و معانی سے باخبر تھے تو دوسری کلامِ رسول کی خوبیاں ان کی نظر میں تھیں۔ "مبادیِ تدبر حدیث" کی سطر سطر سے واضح ہے کہ علم حدیث بھی مولانا کا ایک خاص میدان تھا۔[۲۲] اس کے علاوہ اپنی تفسیر "تدبر قرآن" میں جا بجا حدیث کے مختلف پہلوؤں پر سیر

حاصل بحث کی ہے، مولانا نے اپنے علم حدیث کی روداد یوں بیان کی ہے، اور اس روداد کا تعلق حدیث کے جید عالم اور محدث مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ (متوفی: ۱۶ شوال ۱۳۵۳ھ/ ۲۲ جنوری ۱۹۳۵) سے ہے جن کی فیض صحبت سے مولانا نے استفادہ کیا مولانا اصلاحی مولانا مبارکپوری کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو شاید یہ علم تھا کہ میں مدرسۃ الاصلاح کا فارغ التحصیل اور مولانا فراہی کے شاگردوں میں سے ہوں، انہوں نے فرمایا کہ آپ تو بہت کچھ پڑھ چکے ہیں، اب مزید پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اگر آپ چاہیں تو اپنی سند آپ کو دیدوں گا، مولانا کی طرف سے یہ میری بڑی حوصلہ افزائی تھی لیکن میرا مقصد حدیث شریف کا علم حاصل کرنا تھا نہ کہ صرف سند حاصل کرنا، میں نے ادب سے گزارش کی کہ میں ایک حقیر طالب علم ہوں، شاہوں کا یہ تاج میں اپنے سر پر رکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتا، میری آرزو یہ ہے کہ میں آپ سے حدیث سمجھنے کا سلیقہ سیکھوں، یہ جواب سن کر مولانا نے کچھ دیر توقف کے بعد فرمایا کہ اچھی بات ہے، آپ کی خواہش یہی ہے تو جو کتاب چاہیں میں وہ پڑھا دوں گا، میں نے کہا! آپ ترمذی کے شارح ہیں، یہی کتاب مجھے پڑھا دیجئے، یہ درخواست مولانا نے منظور فرمالی، اور مزید کرم یہ فرمایا کہ شرح ترمذی کا ایک نسخہ اپنے دستخط سے مزیّن فرما کر مجھے عنایت کیا"۔[۲۳]

مذکورہ کلمات سے دو چیزیں منظرِ عام پر آئیں ایک تو یہ کہ علوم قرآنیہ کی

طرح انہیں علوم حدیث سیکھنے کا بھی زبردست اشتیاق تھا اور دوسرے وہ دینِ اسلام کے دوسرے ماخذ سے پوری طرح استفادہ کرنے کے خواہش مند تھے، یہاں دو حدیث کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جس سے ان کی اس فن میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے، ایک حدیث کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:۔

عن ابی حمید أن رسول الله ﷺ قال: اذاسمعتم الحديث عنى تعرفه قلوبكم وتلين له ،اشعاركم وابشاركم وترون أنه منكم قريب، فأناأولاكم به واذا سمعتم الحديث عنى تنكره قلوبكم وتنفر منه اشعاركم وابشاركم و ترون أنه منكم بعيد فأنا ابعدكم منه ۔[۲۴]

ابوحمید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم مجھ سے منسوب کوئی ایسی روایت سنو جس سے تمہارے دل آشنائی محسوس کریں، تمہارے رونگٹے اور تن بدن اس سے اثر پذیر ہوں اور تم دیکھو کہ وہ تمہارے دلوں سے قریب ہے تو میں تمہاری نسبت اس کے زیادہ قریب ہوں اور جب تم مجھ سے منسوب کوئی ایسی بات سنو جس سے تمہارے دل اجنبیت محسوس کریں، تمہارے رونگٹے اور جسم اس سے ناگواری محسوس کریں اور تم دیکھو کہ وہ تمہارے مزاج سے دور ہے تو میں تمہاری نسبت اس سے زیادہ دور ہوں۔[۲۵]

ایک دوسری روایت کا ترجمہ مولانا نے اس طرح کیا ہے:۔

”لقد ادركت سبعين عند هذه الاساطين واشار الىٰ مسجد الرسول ﷺ يقولون فما اخذت

میں ان ستونوں (مسجد نبوی کے ستونوں کی طرف اشارہ کرتے) کے پاس ستّر آدمیوں سے ملا ہوں

عنهم شيئاً وإن احدهم لو إئتمن علی بیت مال لكان به أميناً الا انهم لم يكونوا من اهل هذاالشان"	جو نبی ﷺ سے منسوب کر کے روایت کرتے تھے، لیکن میں نے ان میں سے کسی سے روایت نہیں لی، اگرچہ ان میں ایسے لوگ تھے کہ اگر وہ بیت المال کے امین بنائے جاتے تھے تو وہ اس کے اہل ثابت ہوتے۔ لیکن وہ روایت حدیث کے اہل نہیں تھے۔ ۲٦

اب تک مولانا امین احسن اصلاحی کی ان خدمات کا جائزہ پیش کیا جارہا تھا جس کا تعلق تفسیر وترجمہ سے تھا، مذکورہ سطور کی روشنی میں یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ جس طرح انہیں دنیائے تفسیر میں امتیاز واختصاص حاصل ہے اسی طرح انہیں مترجمین میں بھی انفرادیت ویکتائیت حاصل ہے، اپنی ان علمی اکتسابات سے اگر اردو زبان وادب میں اضافہ کیا تو وہیں اردو زبان کی تزئین وتنسیق میں نمایاں رول ادا کیا، مولانا کی علمی وتحقیقی کاموں کو اردو زبان سے خارج کردیا جائے تو ایک واضح خلا نظر آئے گا، اردو قارئین کے لئے مولانا نے ایک سرمایہ چھوڑا جو حق وباطل کے مابین میزانِ عدل کی مانند ہے، اس کے بعد مولانا کے تصنیفی کارناموں کا تجزیہ کیا جائے تو انہیں پانچ خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) تحقیق وتنقید (۲) دعوتِ دین (۳) فقہ (۴) مقالات (۵) رسالے (٦) صحافت۔

مذکورہ بالا موضوعات پر مولانا نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو ارباب علم وفضل کے لئے راہنما اصول کی مانند ہیں، مولانا کی بعض کتابیں

عربی اور انگریزی میں منتقل ہوکر تمام دنیائے علم کے لئے توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہیں، تحقیق و تفتیش کا وہ اعلیٰ معیار قائم کیا جو سنگِ میل کے مثل ہے اور آئندہ اسلام پسند مصنفین کے لئے تحریک و تحریض کا باعث بھی، اس زمرے میں تزکیۂ نفس، مبادیِٔ تدبر قرآن، فلسفہ کے بنیادی مسائل قرآن حکم کی روشنی میں، اسلامی ریاست، اسلامی قانون کی تدوین، اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام، مقالاتِ اصلاحی اور اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

اس مضمون میں تمام تصانیف کو موضوع بحث بنانا دشوار ہے، صرف ''تزکیۂ نفس'' اور ''مبادیِٔ تدبر قرآن'' کے کچھ اقتباسات ہی پر اکتفا کیا جائے گا، ''تزکیۂ نفس'' مولانا کی ایک ایسی تصنیف ہے جس کی مثال شاید پوری اسلامی دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے، اس کتاب میں اس پہلو کو اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کی تصویر کس کس طرح سے بگاڑنے کی سبیل تلاش کی گئی ہے، دینِ اسلام کی نمائندہ شخصیات نے بھی تصوّف کے نام پر اسلام کا ایک حلیہ پیش کیا جس کا قرآن کریم اور حدیث سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، تزکیۂ نفس دنیا کے اہم ترین اسلامی لٹریچر میں شامل کی جاسکتی ہے یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہماری مادری زبان میں موجود ہے، اسے علم وفضل اور زبان وبیان کے اعتبار سے اوّلیت حاصل ہے ''تزکیۂ نفس'' کے متعلق مولانا فرماتے ہیں:۔

> ''نفس کا تزکیہ یہ ہوگا کہ اس کے اندر جو غلط افکار و نظریات جڑ پکڑ گئے ہیں ان کی جڑیں اکھاڑی جائیں، جاہلی عادات واخلاق نے اس کے اندر جو ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں ان کو درست کیا جائے، تقلید اور رسوم کی پرستش نے اس میں بے حسی اور جمود کے جو روگ پیدا کر رکھے ہیں ان کو دور کیا جائے، جانی اور نفسانی لذتوں کی چاٹ نے اس پر جو پست

ہمتی اور بزدلی طاری کر رکھی ہے اس کا علاج کیا جائے، تا کہ اس کی آنکھیں کھل سکیں، اس کا دماغ سوچ سکے، اس کی ہمت ابھر سکے، اس کی عادتیں سنور سکیں اور وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق اپنی ذہنی، اخلاقی اور روحانی ترقی کے اس بلند مرتبے تک پہنچ سکے جس مرتبہ تک پہنچنے کی اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر قابلیت رکھی ہے۔ [۲۷]

مولانا نے ''تزکیۂ نفس'' کے متعلق فرمایا کہ یہ ایک جہد مسلسل ہے، یہاں کسی توقف اور ٹھہراؤ کا گزر نہیں۔

''اس چیز نے تزکیئے کو ایک مستمر جدوجہد اور ایک مسلسل تگ و دو کی چیز بنا دیا ہے، اس میں کوئی وقفہ یا ٹھہراؤ نہیں ہے اور اس سفر میں کوئی موڑ یا مقام ایسا نہیں آتا ہے، جہاں پہنچ کر آدمی یہ سمجھ سکے کہ بس اب یہ آخری منزل آ گئی ہے، یہاں پہنچ کر ذرا سستا لینا چاہیئے یا یہیں کمر کھول دینی چاہئے، یہ ایک خوب سے خوب تر کی جستجو ہے، اس خوب سے خوب تر کی جستجو میں نگاہ کو کہیں ٹھہرنے کی جگہ نہیں ملتی جس رفتار سے اعمال واخلاق اور ظاہر و باطن میں جلا پیدا ہوتا جاتا ہے، اسی رفتار سے مذاق کی لطافت جس کی ذکاوت اور آنکھوں کی بصارت بھی بڑھتی جاتی ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دامن کے پچھلے دھبّے دھو کر ابھی فارغ نہیں ہوئے کہ نگاہ کچھ اور ڈھونڈ کر سامنے رکھ دیتی ہے کہ اب انہیں دھوئیے۔ [۲۸]

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

(الطاف حسین حالی)

''تزکیۂ نفس'' میں بے شمار ایسے افکار و اقتباسات ہیں جو ایک طرف

مفکرین کے لئے فکری اضطراب کا باعث ہیں تو دوسری طرف اہلِ زبان اور ادباء کی تسکین و تشفّی کا ایک مؤثر ترین ذریعہ، اردو زبان کے ناقدین اور مبصرین کے نقد و تبصرے، شعر و شاعری، ناول نگاری، خاکہ نگاری اور افسانہ نویسی سے آگے نہیں بڑھتے لیکن سچائی تو یہ ہے کہ اسلام پسند مصنفین نے اردو زبان کی تعمیر و ترقی میں جس جانفشانی اور جان گدازی کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال اہل اردو کے یہاں ملنی مشکل ہے، اسی طرح ''مبادیِ تدبر قرآن'' فہم قرآن کے موضوع پر ایک منفرد کتاب ہے اس میں ان تمام نکات کا احاطہ کرنے کا بیڑا اٹھایا گیا جس سے فہم قرآن کی منزلیں آسان ہو جائیں اور اس پر غور و فکر کی راہیں باز ہو جائیں، اس میں فکر اور زبان و بیان کا لازوال حسن موجود ہے، یہاں ایک اقتباس نقل کیا جا رہا ہے جس میں حکمت و بصیرت کے طلب گاروں کا ذکر ہے:۔

''وہ علم کے جھوٹے مدعیوں اور مناظرہ بازوں کی طرح بستیوں، مدرسوں، مسجدوں اور خانقاہوں میں مباحثے اور مناظرے کی مجلسیں نہیں منعقد کرتا پھرتا اور نہ یہ کرتا ہے کہ جو خطرہ دل میں گزر جائے اس کو جھٹ چند ورقوں میں چھاپ کر ساری دنیا میں اپنے علم و فضل کا ڈھنڈورا پیٹنے کی کوشش کرے بلکہ سوچنے والے دماغ اور غور کرنے والی طبیعت کی طرح وہ خلوت کے گوشوں اور تنہائی کے ویرانوں کا شائق ہے وہ بستیوں کے ہجوم سے بھاگتا اور شہروں کے اژدہام سے گھبراتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی مقام عبرت دموعظت کا کوئی خلوت کدہ میسّر آ جائے تو اپنے ان سوالوں کو لے کر بیٹھ جائے جن کے جواب کے لئے وہ ہمہ وقت تشنہ و بیقرار ہے، چنانچہ اسی طرح کی کسی ڈھتی ہوئی بستی پر اس کا

گزر ہو جاتا ہے، اس کی منہدم دیواریں، اس کے ٹوٹے ہوئے در، اس کی سربسجود محرابیں اس کی پراگندہ اینٹیں اور اس کی وحشت و ویرانی کی خاموشی اس کے سامنے عبرتوں اور بصیرتوں کا ایک دفتر کھول دیتی ہے اور طبیعت کا ذوق فوراً اپنے لئے فکر و نظر کا موضوع تلاش کر لیتا ہے اور جس سوال پر دماغ بار بار زور آزمائی کر کے عاجز آ چکا تھا۔ لیکن کوئی تشفی بخش حل نہ پا سکا تھا، موقع و محل کی تاثیر سے دل کا وہی داغ پھر ابھر آتا ہے تذبذب کی خلش اور اضطراب کی چبھن پھر تازہ ہو جاتی ہے اور وہ انکار و ہٹ دھرمی کے غرور کے ساتھ نہیں، بلکہ یکسر ذوق، جستجو اور سراپا شوق و آرزو ہو کر پکار اٹھتا ہے ”انی یحیی ھذہ اللّٰہ بعد موتھا“ یہ کیسے ہوگا کہ خدا اس کو پھر زندہ کرے گا“۔ [۲۹]

مولانا امین احسن اصلاحی چونکہ مدرسۃ الاصلاح کے فرزندوں میں سے ہیں، اس لئے دعوتِ دین کا کام آپ کے اولین فرائض میں شامل تھا، مدرسۃ الاصلاح دراصل ”اصلاح المسلمین“ کی دین ہے، مدرسۃ الاصلاح کے قیام سے قبل یہ ایک تنظیم تھی جو مولانا محمد شفیعؒ (۱۸۹۶ء۔۱۹۷۶ء) کی قیادت میں اصلاح معاشرہ کا کام کیا کرتی تھی، مدرسہ کے طلبہ اور اساتذہ قرب و جوار میں تبلیغ دین کے فرائض انجام دیتے نیز مختلف مواضع میں غیر شرعی رسومات کے خلاف تقاریر ہوتیں، انہی تمام وجوہ کی بناء پر مولانا نے عملی اور فکری اعتبار سے دعوت دین کا کام کیا، اس موضوع پر مولانا کی معرکۃ آلاراء تصنیف ”دعوت دین اور اس کا طریقۂ کار“ مبلغین اور دعاۃ کیلئے ایک قیمتی تحفہ ہے، جماعتِ اسلامی کی دعوت اسلام کا انحصار اسی کتاب پر ہے، اپنے موضوع پر یہ کتاب تنہا ہے، اپنے معاصر

اسلوب کی وجہ سے حد درجہ مقبول و مطلوب ہوئی، ''شہادۃ علی الناس'' پر اس انداز سے اظہار خیال کیا گیا ہے:

''جنہوں نے اللہ کے دین کو برپا کرنے کے لئے جہاد کیا اور جس حق پر ایمان لائے تھے اس کے حق ہونے کی گواہی تلواروں کے چھاؤں میں بھی دی، ان کو شہید کہا گیا ہے اور غور کیجئے تو ان لوگوں کے سوا نہ اس لقب کا کوئی مستحق ہو سکتا ہے اور نہ اس لقب کے سوا کوئی اور لقب ان کے لئے موزوں ہو سکتا ہے، اس امت پر ''شہادت علی الناس'' کی جو ذمّہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی ہے اس کو پورا کرنے والے ہزاروں لاکھوں ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی محنت کا اللہ کے یہاں اجر بھی پائے گا، لیکن جنہوں نے اس راہ میں اپنا پورا سرمایۂ زندگی لگایا اور اپنا سر دے کر اس حق کی گواہی دی، درحقیقت وہی اس بات کے اہل ہیں کہ ان کو شہید کا لقب ملے کیونکہ ایک چیز کے حق ہونے کی اس سے بڑی شہادت کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ آدمی اس کی حمایت و نصرت کی راہ میں اپنا سر کٹا دے پس جو ہمت ور یہ بازی کھیل گیا اس نے وہ شہادت دیدی، جس کے بعد شہادت کا کوئی اور درجہ باقی نہ رہا۔[۳۰]

اس کتاب نے تحریک اسلامی کی تبلیغی سرگرمیوں میں روح پھونکدی اور اردو زبان میں ایک گرانقدر لٹریچر فراہم کیا۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے عربی میں منتقل کیا گیا، پاکستانی صحافی عطاء الرحمٰن نے اسے اردو زبان کا شاہکار قرار دیا ہے۔[۳۱] اس کتاب کے ساتھ ساتھ تحریکِ اسلامی کو جلا دینے میں مولانا نے ناقابلِ فراموش کارنامہ انجام دیا۔[۳۲]

مولانا کی تفسیری اور قرآنی خدمات روز روشن کی مانند عیاں ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ کی فقہی بصیرت اور فقہی خدمات کو کبھی بھی نظر انداز نہیں

کیا جا سکتا، دراصل آپ فقہِ اسلامی کے ترجمان تھے، بڑے سے فقہاء کرام کو قرآن وسنت کی روشنی میں دیکھتے تھے، ان کی آراء سے ہرگز مرعوب نہ ہوتے تھے، اسی طرح جدید اہل علم کے خیالات کا تحلیل وتجزیہ آپ کا شیوہ تھا، آپ نے اسلامی قانون کی تدوین کے موضوع پر جامعات میں خطبات دیئے، اس موضوع پر آپ کی تصانیف اس طرح ہیں:۔

(۱) اسلامی قانون کی تدوین

(۲) اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل

(۳) اسلامی ریاست

(۴) عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ۔

یہ وہ کتابیں ہیں جن سے مدارس اور جامعات کے طلبہ مستقل استفادہ کرتے رہتے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ مولانا کی بعض فقہی آراء زریں حروف سے لکھی جانے کے لائق ہیں، اپنی معروف تصنیف ''اسلامی ریاست'' میں موجودہ نظام کے کھوکھلے پن کی جانب ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:۔

''اسی طرح جو طرزِ زندگی موجودہ نظامِ حکومت میں حکمرانی کے چہرے کا اصلی غازۂ جمال سمجھا جاتا ہے، اسلامی ماحول کے اندر وہ فرعونیت بلکہ عین شیطنت ہے، دونوں کے درمیان اس غیر معمولی دوری کی وجہ سے موجودہ زمانے کی مغرب سے مرعوب نسلوں کو اسلامی نظام کا معتقد بنانا کچھ آسان کام نہیں ہے، زندگی کے موجودہ نظریات جب تک یکسر بدل نہ جائیں اور موجودہ اخلاقی اقدار کی جگہ اسلامی اقدار کی عظمت ومحبت دلوں میں رچ بس نہ جائے اس وقت

تک اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ لوگ ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں کو سمجھ سکیں اور اپنے اندر وہ اوصاف واخلاق پیدا کرنے کی طرف مائل ہوں جو ایک اسلامی حکومت کے کارکنوں کے اندر مطلوب ہیں'' ۴۳؎

''اسلامی قانون کی تدوین'' میں مولانا نے ایک جگہ لباس پر ان کلمات میں اظہار خیال کیا:۔

''اسی طرح ہمارے لباس کا مسئلہ ہے، اس بارے میں اسلام نے صرف یہ کہا کہ چند اخلاقی نوعیت کی حدیں مقرر کر دی ہیں مثلاً یہ کہ لباس ساتر ہو، مرد مسرفانہ لباس مثلاً ریشم کا استعمال نہ کریں، لباس سے شہد پن اور غنڈہ پن کا اظہار نہ ہو، عورتیں مردوں کا سا اور مرد عورتوں کا سا لباس نہ پہنیں، بس اس طرح کی چند شرطیں عائد کر کے ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہے، کہ ہم جس طرح کا کپڑا چاہیں ایجاد کریں، جس طرح کا چاہیں سلوائیں اور جس ڈھب سے چاہیں اسے پہنیں، ان ساری باتوں کا انحصار ہی ہمارے ملک کی آب وہوا، ہماری قومی روایات، ہمارے فطری ذوق وآرائش اور ہماری قابلیت، اختراع وایجاد پر ہے، اسلام ان چیزوں کے بارے میں اپنی طرف سے کوئی ضابطہ بندی نہیں کرتا''۔ ۴۴؎

مذکورہ دونوں اقتباس سے مولانا کے فکری ترفع اور فقہی بصیرت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، دوسرے مولانا کا مثالی اور ٹکسالی انداز ظاہر و باہر ہے،

مولانا کا مخصوص لب ولہجہ ہر جگہ پہچان لیا جاتا ہے، یہ انداز تحریر انہیں دوسروں سے ممتاز بنا دیتا ہے، اسی انفرادی مثال کے سبب قارئین ان کی تحریروں کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں، مولانا کی تصانیف کا ایک پہلو خواتین سے متعلق ہے، اس میں بہت سے نسائی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے، مسئلہ حجاب پر نہایت عالمانہ اور فاضلانہ گفتگو کی گئی ہے، چہرے کے حجاب کے مسئلہ پر ترجمان القرآن میں مولانا مودودیؒ سے فکر انگیز مباحثہ ہوا، اور ان سے شدید اختلاف کیا، اس موضوع پر مولانا کی تصانیف ''پردہ اور قرآن مجید''، ''اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام'' اور ''پاکستانی عورت دوراہے پر'' خصوصی اہمیت کی حامل ہیں، یہ تصانیف بہت سے نسائی مسائل کا حل پیش کرتی ہیں، اور مذکورہ تصانیف میں تمام آراء قرآن کریم اور احادیث کی روشنی میں پیش کی گئی ہیں، موجودہ پردے کا جائزہ اور اس کی خامیوں کو پیش کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:۔

> ''اوپر کے مباحث سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ جس طرح موجودہ بے پردگی قرآن کے بالکل خلاف ہے، اسی طرح مروّجہ پردہ بھی قرآن کے بالکل خلاف ہے بالخصوص گھروں کے اندر کے پردہ سے متعلق قرآن نے جو احکام دیئے ہیں وہ تو یک قلم بدل ڈالے گئے ہیں، ان کی جگہ یا تو ایک بالکل غلط قسم کی آزادی اور بے قیدی نے لے رکھی ہے یا ایک بالکل ناروا قسم کی پابندی نے، یا تو یہ حالت ہے کہ قریب کے عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی لوگ اس طرح کے پردے کو ضروری سمجھتے ہیں جس قسم کا پردہ اجنبیوں اور بے گانوں سے ضروری قرار دیا گیا ہے، یا یہ حالت ہے

کہ جن لوگوں کے ساتھ قرابت ورشتہ داری کی کوئی ادنیٰ وابستگی بھی ہو جاتی ہے ان کے لئے سرے سے کسی قسم کی پردہ کی ضرورت ہی نہیں خیال کی جاتی، اس افراط وتفریط کا نتیجہ یا تو یہ ہے کہ اس سے بہت سے خاندانوں کی اجتماعی زندگی متاثر ہو جاتی ہے اور ان کے درمیان وہ انس اور وہ ربط وضبط باقی نہیں رہ جاتا ہے جس کو اسلام نے باقی رکھنا چاہا ہے، یا یہ ہوتا ہے کہ اس سے اس کا وہ معیار اخلاق گر جاتا ہے جس کو اسلام نے ہر قیمت پر باقی رکھنا چاہا ہے اور جس کی بربادی اسلامی معاشرہ کی بربادی کے ہم معنی ہے"۔[۳۵]

مقالہ نگاری ایک مشکل فن ہے، کیونکہ یہ دریا میں کوزہ بند کرنے کا نام ہے، مخصوص انداز میں بڑے بڑے اہم موضوعات کو چند صفحات میں سمیٹنے کا نام مقالہ نگاری ہے، ہندوستان کے چار مقالہ نگار مولانا امتیاز علی عرشی، رشید احمد صدیقی، مولانا مودودیؒ، اور ابو کریم محفوظ المعصومی کے یہاں مقالہ نگاری کا فن نصف النہار پر ہے، یہ وہ شخصیات ہیں جنہوں نے بڑے بڑے علمی موضوعات کو نہایت فصیح وبلیغ انداز میں اختصار کے ساتھ قلم بند کیا ہے، جو قارئین مولانا امین احسن اصلاحی کے مقالات پڑھنے کا شرف حاصل کر چکے ہیں انہیں اس کے اعتراف میں کوئی تأمل نہیں کہ انہیں بھی مذکورہ مقالہ نگاروں میں شامل کیا جاسکتا ہے، انداز بیان میں آسمانی عظمت میں تاج محل کی سی جاذبیت، لفظ لفظ لذت وتاثیر میں ڈوبا ہوا، مولانا مودودیؒ، مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا وحید الدین خاں اردو زبان وادب میں مخصوص اسالیب کے موجد ہیں، کاش کہ اردو کے ناقدین، محققین اور ادباء ان اسلام پسند مصنفین کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے اور

ان کے ترسیلی انداز بیان کی اتباع کرتے،[۳۶] مولانا کے مقالات کے مجموعوں کے عناوین اس طرح ہیں (۱) تنقیدات (۲) توضیحات (۳) تفہیم دین (۴) اور مقالات اصلاحی (۳ جلدیں)۔ اب بھی مجلّات اور اخبارات میں مولانا کے بہت سے مقالات ہیں جو مذکورہ مجموعوں میں شامل نہیں ہیں، بہر کیف مولانا کے مقالات، قرآنیات، اسلامی موضوعات، تحریکِ اسلامی، اجتماعیات اور سیاسیات سے متعلق ہیں، مولانا کے وہ مقالات جو تحریکِ اسلامی اور مولانا مودودیؒ سے اختلافات پر مشتمل ہیں یا جن میں مخالفین فراہی کے جوابات دیئے گئے ہیں۔[۳۷] وہ خاصے دلچسپ اور علمی ہیں، یہاں صرف دو اقتباس ہی پر اکتفا کیا جائے گا، یہاں پر مولانا کے مقالہ بعنوان ''جماعتِ اسلامی پر الزامات اور اس کا جواب'' سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:۔

> ''ان کی نفسیاتی کمزوری تو یہ ہے کہ مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی سے ان کو جو خلش ہے وہ اس بات کی وجہ سے ہرگز نہیں ہے کہ خدانخواستہ ان کے ہاتھوں اسلام کو کوئی نقصان پہنچ رہا ہے بلکہ ساری خلش اس بات کی وجہ سے ہے کہ مولانا مودودیؒ کی تحریروں اور جماعت کی دعوت سے خود ان کے اپنے حلقہائے عقیدت بھی متاثر ہوتے چلے جارہے ہیں، اگر ان حضرات کو اس بات سے اطمینان ہوجائے کہ ان کے اپنے حلقے جماعت کی اثر اندازیوں سے محفوظ رہیں گے تو پھر مولانا اور ان کے رفقاء جو چاہیں کرتے پھریں، انشاء اللہ سب خیر و برکت اور خدمت و اعانت دین ہی ہے، ورنہ اس کے آخر کیا معنی کہ جو شخص ان کے خیال کے

مطابق مسلمانوں میں ایک نئے فرقے کی بناء ڈال رہا ہے،
جو کتاب وسنت اور سلف کے استنباطات پر نظر نہ رکھنے کے
باوجود بھی اجتہاد کا زعم رکھتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے دماغ
میں بھی اجتہاد کی ہوائے خودسری بھر رہا ہے جس نے تصوف
واحسان اور اس کے اساطین وعمائد کے خلاف لوگوں کے
اندر نفرت وتحقیر کے جذبات پیدا کئے ہیں، جس نے حدیث
کے وقار کو بہت حد تک کم اور سلف کے وقار کو بہت حد تک
گرادیا ہے جو اپنے ہم عصر علماء کے جبہّ ودستار کے مضحکے اور
ان کے حواس خمسہ کی تعطیل وتحمیق سے بھی گریز نہیں
کرتا"۔ ۳۸؎

دورِ جدید میں معمولی صلاحیت کے مالک کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ خود کو
سربراہ اور عقلِ کل بنا کر پیش کرے، اسے مدارس، مراکز اور انجمنوں کے قیام کی فکر
ہوتی ہے، اس ذہنیت کا تعارف مولانا نے کتنا خوبصورت کرایا ہے، لکھتے ہیں کہ:

"اس دور میں جماعت سازی کا فتنہ سب سے بڑا فتنہ ہے،
جس شخص کی زبان یا اس کے قلم میں کچھ حرکت ہوتی ہے وہ
سب سے پہلے جماعت سازی کو سوچتا ہے ابتداء تو ان
جماعتوں کی خدمتِ ملّت اور خدمتِ اسلام کے کسی دعوے
سے ہوتی ہے، لیکن جب کچھ آگے چل نکلتا ہے تو پھر یہ
جماعتیں ملّتِ اسلام کے جسم سے گوشت کا ایک لوتھڑا نوچ
کر اپنی الگ دکان سجا کر بیٹھ جاتی ہیں اور ان کے ایجنٹ اور
کارندے سادہ لوح عوام ہیں یہ وسوسہ اندازی شروع کر

دیتے ہیں کہ جوان کی دکان سے سودا نہ خریدے اس کا ایمان ہی سلامت نہیں رہتا، ہم نے کتنی جماعتوں کو خدا کے نام سے قائم ہوتے اور پھر اسی طرح خود الٰہ اور بت بنتے دیکھا ہے، جن لوگوں کا ان جماعتوں کے ساتھ پیٹ اور تن وابستہ ہو جاتا ہے ان کا تو کام ہی اس کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا کہ وہ آسمان و زمین کو انہی جماعتوں کے ہاتھوں قائم و باقی ثابت کریں اور ان کی پھیلائی ہوئی ہر گمراہی اور ان کے اٹھائے ہوئے ہر فتنہ کو دینی کی حکمت کا عین مقتضی اور شریعت کی منشا کی عین روح قرار دیں، اس فتنے میں متبلا ہو کر میں نے ایسے ایسے لوگوں کو مرتے دیکھا ہے جن کی موت میرے لئے باعث حیرت بھی ہے اور باعث اندوہ بھی''[۳۹]

مذکورہ دونوں اقتباس سے واضح ہے کہ مولانا کے دل میں اسلام کا سچّا درد تھا، انہیں دینِ اسلام کے اعلاء و احیاء سے غیر معمولی لگاؤ تھا، انہیں اسلام کے نام پر دکان چمکانے والوں اور اس کی غلط تعبیر و تشریح پیش کرنے والوں سے کدھی، اسلام سے حقیقی تعلق ہی تحریکِ اسلامی سے اختلاف کا سبب بنا، قرآن وسنّت کے باب میں مصلحت پسندی انہیں ہرگز پسند نہ تھی۔

مجموعۂ مقالات ''تفہیم دین'' میں ایک مقالہ سرسید احمد خاں سے متعلق ہے، جو دراصل ایک سوال کے جواب میں ہے، اور یہ جواب کچھ سرسری سا ہے، اس مضمون میں سرسید کو صرف ایک ملی لیڈر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔[۴۰] یہ نقطۂ نظر عدل و انصاف کے برعکس ہے، مولانا نے انہیں ایک مصلح ماننے سے انکار کیا ہے، یہ جرأت وہی کر سکتا ہے جس نے ''تہذیب الاخلاق'' کے شماروں

اور ''مقالات سرسید'' کا مطالعہ نہ کیا ہو، اس مضمون میں یہ تأثر بھی دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ سرسید نے براہ راست اسلامی مآخذ و مصادر کا مطالعہ نہیں کیا تھا، جبکہ تبیین الکلام، تفسیر سرسید، خطبات احمدیہ اور مکاتبات الخلان کا مطالعہ کرنے والا کسی طرح بھی اس خیال کو قبول نہیں کرسکتا، اتنا ضرور ہے کہ سرسید کا قانونِ فطرت اور نظریۂ معجزہ کسی طرح بھی قابلِ تسلیم نہیں، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ فہمِ قرآن کی راہیں ہموار کرنے، مستشرقین کے مزعومات کے مدلّل جوابات فراہم کرنے اور غیر اسلامی نظریات پر تنقید کرنے میں سرسید نے نمایاں رول ادا کیا۔[۴۱] اسی طرح خود مولانا کے استاذ گرامی مولانا حمیدالدین فراہی نے تفسیر سرسید کے اثرات قبول کئے۔[۴۲] جس کا اعتراف مجلّہ ''علوم القرآن'' کے اداریہ میں کیا گیا ہے۔[۴۳]

مولانا کے مقالات مختلف دینی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں پر مشتمل ہیں، علم و تحقیق کے ساتھ ساتھ حالاتِ حاضرہ پر ایک متوازن تبصرہ ہے، زبان و بیان کے اچھوتے انداز نے ان مقالات کی قدر و منزلت میں اضافہ کردیا۔ اردو زبان میں مقالہ نگاری کے فن کو قابل اعتبار و استناد بنایا، مولانا نے اصلاحی اور دعوتی نقطۂ نظر سے چند رسالے تحریر کئے جو فکر و نظر اور اسلوب بیان کے اعتبار سے حد درجہ مؤثر اور علمی اور عوامی حلقوں میں یکساں مقبول ہیں، عصرِ حاضر میں دعوتِ اسلام کی خاطر اس طرح کے کتابچے بے پناہ مفید ہیں، ان کتابچوں کے عناوین حقیقتِ صلوٰۃ، حقیقتِ تقویٰ، حقیقتِ توحید اور حقیقتِ شرک وغیرہ ہیں، ''حقیقتِ تقویٰ '' سے ایک اقتباس نقل کیا جارہا ہے جس میں ان لوگوں کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے جو تقویٰ کی ایک غلط تصویر اپنے ذہنوں میں سجائے ہوئے ہیں۔

''علی ھذا القیاس'' تقویٰ کے شرائط میں سے یہ بات بھی

سمجھی جاتی ہے کہ تجرد اور ترکِ دنیا سے مناسبت رکھتا ہے، اور خلوت کے گوشوں اور تنہائی کے حجروں ہی میں پرورش پاسکتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی زندگی کی تمام عملی سرگرمیوں میں الگ تھلگ اور خلائق سے منقطع ہو کر یادِ الٰہی میں مشغول رہے، یہاں تک کہ اگر ایک شخص کی زندگی دین کی حجت واضح کرنے اور اس کی اقامت کے لئے کشمکش میں بسر ہو رہی ہیں تو ہمارے تقویٰ کے موجودہ سائنس کے ماہرین کے نزدیک اس کا یہ مشغلہ بھی حصولِ تقویٰ کی جد وجہد میں مخل ہے اور اس سے کچھ فائدہ حاصل ہونا تو الگ رہا، بہت زیادہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس کشمکش میں اس کی رہی سہی خوبیاں بھی برباد ہو جائیں، ان حضرات کے نزدیک اعلیٰ طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی پوری زندگی ریاضت و مراقبہ میں گزار دے ورنہ کم از کم ایک طویل مدت تو اس شغلِ تنہائی میں بسر کئے بغیر آدمی کے لئے عملی میدان میں اترنا بہر صورت خطرہ سے خالی نہیں ہے، یہ حضرات اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ بچہ کی ترقی کے لئے اس کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ماں کی گود سے اترے زمین میں رینگے، کھڑے ہونے کی کوشش کرے، کھڑا ہو کر لڑ کھڑائے، اور گرے، پھر دوڑنے لگے، وہ اس کے برعکس اس بات کے قائل ہیں کہ بچہ ولادت سے لے کر سن رشد تک ماں باپ کے کندھوں پر لدا لدا پھرے اور چالیس برس کی اس پختہ

استعدادِ مادی وعقلی کو پہنچ جائے جس کو قرآن حکیم نے "فلما بلغ اشده وبلغ اربعین سنة" سے تعبیر کیا ہے، تو اس کو دفعۃً کارزار حیات میں جھونک دیا جائے کہ اب تو جا اس کے نشیب وفراز اور سرد وگرم سے خود عہدہ برآ ہو، کیونکہ پورے چالیس سال مادرِ مشفقہ کی محفوظ آغوش میں اس کارزار میں اترنے کے لئے تربیت حاصل کر چکا ہے"۔[۴۴]

اسی طرح ایک اقتباس "حقیقت شرک" سے ملاحظہ فرمائیں، جس میں ایک سچّے اور پکّے موحد کی تصویر کشی کی گئی ہے:۔

"وہ باطل کو ایک ایک کر کے چن لے اور حق کا ایک ایک کر کے انتخاب کر لے اور حق کے لئے اپنی دوستی کا اور باطل کے لئے اپنی دشمنی کا اعلان کر دے، اس راہ میں اپنی ساری آرزوؤں، ساری تمنّاؤں، ساری دوستیوں اور تمام رشتوں اور ناتوں کو قطع کر لے، اور جو کچھ اس کے صلہ میں اللہ کے پاس ہے اس پر راضی ہو جائے، اس کی دعوت ساری خدائی کے لئے یکساں اور عام ہو، اس کی جھولی کی روٹی اور اس کی چھاگل کے پانی میں ہر بھوکے اور پیاسے کے لئے آسودگی اور سیرابی ہو، اس کا چراغ پہاڑی کے چراغ کی طرح چمکے اور ہر گم گشتہ کی راہنمائی کے لئے اشارہ کرے، اس کی ہدایت کی ضیاء پاشیاں خدا کے سورج کی طرح عام وہمہ گیر ہوں، اس کا ابرِ کرم آسمان کی بارش کی طرح ہر دشت وجبل کو سیراب کرے، اس کی گفتگو ہر بولی میں اور اس کی مخاطب

تمام نسل انسانی ہو، وہ چیخ چیخ کر پکارے، اور لپٹ لپٹ کر
سمجھائے اور انسان کی روحانی بیماریاں اس کو اس درجہ بے
قرار کردیں کہ وہ خلوت کے سجدوں میں اس کی نجات کے
لئے پھوٹ پھوٹ کر روئے اس کی راتیں بستر کی لذّتوں
سے محروم ہو جائیں اور اس کے دن فراغت کی گھڑیوں سے
بے نصیب ہو جائیں، خدا کی زمین پر اتنے بیشمار ارباب
وآلہہ کی غلامی کا بوجھلِ طوق دیکھ کر دکھ اور درد سے بھر جائے
اور ہر سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ تک اللہ کی وہ دعوت
قولاً وعملاً پہنچادے جو ان تمام مصائب کا واحد علاج
ہے"۔[۴۵]

دونوں اقتباس میں دو اہم مسئلوں کی حقیقت بیان کی گئی ہے، متقی اور
موحد کے حدود متعین کے گئے اور اس کے تئیں منفی رجحان رکھنے والوں کی نشان
دہی کی گئی، حقیقتِ تقویٰ اور حقیقتِ شرک میں خالصتاً دعوتی انداز ہے، مصنف
نے اپنی بات کی ترسیل کے لئے دلنشیں اور مؤثر اظہارِ بیان اختیار
کیا ہے، صاحبِ کتاب کو زبان وبیان پر ایسی قدرت ہے کہ اپنی ہر بات کو
پرلطف وپر بہار انداز میں پیش کرتے، فکر اور اسلوب دونوں اعتبار سے اردو زبان
میں اضافہ کیا ہے، خوبصورت الفاظ، حسین تراکیب اور دلکش پیرایۂ اظہار کے
آپ بادشاہ ہیں، اردو کے ان چند جلیل القدر اہلِ قلم میں شامل ہیں جنھوں نے
گیسوئے اردو کے سنوارنے اور علمی زبان بنانے میں قابل قدر کارنامے انجام
دیئے ہیں۔

دنیائے صحافت میں بھی آپ نے اپنے جوہر دکھائے، مدرسۃ الاصلاح

سے فراغت کے بعد آپ کی منزل صرف صحافت اور ادب تھی، ایک صحافی اور ادیب کی حیثیت سے اپنے دن گزارنا چاہتے تھے، انہیں صحافت اور ادب سے گہرا تعلق تھا، سب سے پہلے اپنی صحافت کو حقیقت کا روپ دینے کے لئے ''مدینہ'' بجنور اخبار سے وابستہ ہوئے یہ اپنے مضامین، اپنے رجحانات اور رنگ وآہنگ کے اعتبار سے منفرد قسم کا اخبار تھا، اس سے ہندوستان کی عظیم المرتبت شخصیات جڑی ہوئی تھیں، جو علم وفضل اور زبان وبیان کے اعتبار سے بلندیٔ آسمان پر فائز تھیں، اسی وقت آپ نے بچوں کے رسالہ ''غنچہ'' کی بھی ادارت کی جو ''مدینہ'' اخبار کے دفتر سے نکلتا تھا، اسی طرح کچھ وقت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے اخبار ''سچ'' میں بھی گزرا۔[۴۶] مذکورہ تینوں اخبارات میں مولانا اصلاحی کی خاصی تحریریں ہوں گی، لیکن افسوس کہ ان کے صفحات میں مدفون ہیں، اگر یہ تمام چیزیں منظر عام پر آجائیں تو مولانا اصلاحی کی زندگی کے ابتدائی خطوط کی نشان دہی میں بہت سہولت ہوگی۔ ۱۹۲۵ء میں جب مولانا امین احسن اصلاحی دوبارہ اپنی مادرِ علمی واپس آئے تو ۱۹۳۶ء میں ماہنا ''الاصلاح'' جاری کیا جو خالصۃً قرآنی اور علمی مجلّہ تھا، افسوس کہ اس کی قرآنی اور فکری سرگرمیاں صرف چار سال تک محدود رہیں، لیکن ان چار سالوں میں بڑے بڑے ہفت خواں طے کئے، فکرِ فراہی کی ترویج واشاعت میں نمایاں رول ادا کیا، اس میں مولانا کے مضامین اور تراجم دونوں شائع ہوتے تھے، ان کے علاوہ اداریئے بھی آپ ہی کے ضو فشاں قلم سے ترتیب دیئے جاتے تھے، جن میں مختلف سیاسی اور معاشرتی مسئلے اٹھائے جاتے تھے۔[۴۷]

۱۹۴۳ء میں جب مولانا پٹھان کوٹ سے پاکستان گئے اور جماعت سے علاحدگی ہوئی تو ۱۹۵۹ء میں ''میثاق'' نکالا۔ جو ۱۹۶۵ء تک مولانا اصلاحی کی

ادارت میں بڑی آب وتاب کے ساتھ نکلتا رہا۔[۴۸] یہ دراصل ''الاصلاح'' کی ایک دوسری شکل تھی۔ بعض موانع کے سبب مولانا ''میثاق'' سے علاحدہ ہوئے تو اپنے چند تلامذہ کے تعاون سے ۱۹۸۱ء میں ''تدبر'' جاری کیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو مدینہ، غنچہ، سچ، الاصلاح، میثاق اور تدبر میں صحافت اور علم و تحقیق سے متعلق آپ کے جو مضامین منظرِ عام پر آئے وہ صحافتی اور تحقیقی اعتبار سے سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ اب تک آپ کے اس پہلو کو موضوع بحث نہیں بنایا گیا، مولانا اصلاحی نے ہندوستانی زبان کیسی ہو؟ اس عنوان سے بڑی قیمتی باتیں تنقیدات میں کہی گئیں۔

''یہ فقرے گاندھی جی کے مختلف تحریروں اور تقریروں سے ماخوذ ہیں، ہندوستان کی مشترکہ زبان کے بارے میں گاندھی جی کا مسلک مسلمانوں کی نظر میں بہت مشکوک ہے، ڈاکٹر اشرف نے اخبارات میں ایک تحریر شائع کی ہے، اور اس میں گاندھی جی کے مسلک کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، یہ فقرے اس تحریر سے لئے گئے ہیں، ملک کی مشترکہ زبان کا مسئلہ بہت اہم ہے، اس کو کسی نہ کسی شکل میں بہر حال طے کرنا ہے، لیکن آزادی کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے اس لئے ان مسائل کو آزادی کی راہ میں روک نہیں بننا چاہئے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو یہ مسئلہ فیاضی اور رواداری کے ساتھ طے کرنا ہے، مشترکہ زبان کے بلند مقصد کے لئے ہندی اور اردو دونوں کے حامیوں کو اپنی اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی، ہندی کو اردو سے اور اردو کو ہندی سے قریب

ہونالازمی ہے، ہندی کو سنسکرت کے بجائے اردو کی طرف رخ کرنا ہوگا اور اردو کو عربی اور فارسی کے بجائے ہندی سے مانوس ہونا پڑے گا، اس طرح ایک قومی زبان جنم لے گی''۔ ۴۹؎

جنگ آزادی کے توسط سے مولانا نے مسٹر جناح کے متعلق بڑی صداقت کا ثبوت دیا، فرماتے ہیں:۔

''مسٹر جناح بڑے قابل آدمی ہیں وہ انگریزی ادب اور قانون وسیاست میں امام ہیں، ان کو ناحق دعویٰ کی ضرورت پیش آئی، یہ چیز مسلّم ہے، سنتے ہیں بسمارک نے ۵ گھنٹوں کے اندر جرمنی کا کانسی ٹیوشن املا کرادیا تھا وہ اگر راضی ہوں تو ہم ان کو ہندوستان کا بسمارک کہیں، لیکن ہم افسوس کے ساتھ ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ صرف سیاست اور قانون جانتے ہیں، مسلمانوں کی سیاست اور مسلمانوں کا قانون نہیں جانتے، مسلمانوں میں مقدس اور قیصر کا کوئی علاحدہ علاحدہ نظام نہیں ہے، یہاں تو بس ایک ہی قانون ہے جو غسل وطہارت کے مسئلوں سے لے کر ہماری تمام ملی اور بین الاقوامی سیاست پر حاوی ہے، عمر فاروق وضو وطہارت کے مسئلے بھی بتاتے تھے اور دنیا کی قوموں کے فیصلے بھی لکھتے تھے اور ان کے سامنے صرف دو ہی چیزیں ہوتی تھیں، کتاب اور سنت، اور یہ دونوں صرف باعتبار ظاہر دو ہیں، حقیقت میں ایک ہیں، ہم مسٹر جناح کی سیاست دانی

پر ایمان لاتے ہیں اور مانتے ہیں کہ وہ بہت سی چیزیں
جانتے ہیں، لیکن معلوم نہیں وہ بہت سی چیزوں کے ساتھ
ساتھ وہ ایک چیز بھی جانتے ہیں یا نہیں؟ اور صرف جاننے
ہی کا سوال نہیں ہے اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں یا نہیں''۔[۵۰]

مذکورہ دونوں اقتباس میں یہ واضح ثبوت موجود ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی حالاتِ حاضرہ کے مسائل سے باخبر رہتے تھے اور تمام معاصر مسائل میں قرآن اور سنت سے رہنمائی حاصل کرتے تھے، مولانا ایک باشعور اسلامی صحافی تھے مشترکہ قومی زبان پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے صرف عدل وانصاف کا سہارا لیا، ہندو اور مسلم دونوں کو اپنے اپنے رویئے میں لچک لانے پر زور دیا، اسی طرح مسٹر جناح کی حقیقتِ حال کو بیان کرنے میں مصلحت کوشی کا ثبوت نہیں دیا، بلکہ دوٹوک انداز میں اپنی بات کو قارئین کے سامنے رکھدیا، مولانا کی صحافت حقائق کی ترجمانی تھی، اپنی اسی صاف گوئی اور صدق پرستی کے سبب انہیں زندگی کے نشیب وفراز سے بار بار گزرنا پڑا، ثنویت کے علمبرداروں سے آپ کی نہ نبھ سکی، صرف خالد مسعود ان کے ایک ایسے شاگرد تھے، جو تمام شکوک وشبہات سے پاک تھے، انہیں اشتہار وافتخار سے کوئی علاقہ نہ تھا وہ فراہی اسکول کی طرح خاموشی کے ساتھ قرآنی حکمتوں کی تلاش وتتبع میں لگے رہے، کاش کہ مولانا کی صحافت پر کام ہوتا اور ان کے تمام صحافتی مضامین کو یکجا کر کے شائع کیا جاتا۔

پچھلی سطور میں مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر، تراجم، حدیث شریف پر گرفت، فقہی بصیرت، دعوتِ دین کا شعور، فنِ مقالہ نگاری کا نہایت اختصار کے ساتھ جائزہ پیش کیا گیا ہے، اس اختصار وایجاز میں مولانا اصلاحی کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالنے کی ممکن کوشش کی گئی، مولانا کی تمام تصانیف اور تمام مقالات سے

اظہر من الشمس ہے کہ ان میں ظاہری اور باطنی اعتبار سے فکرِ فراہی مکمل طور سے پیوست ہے، قرآنی اور دینی تمام موضوعات میں فکرِ فراہی مولانا کے لئے مشعلِ راہ اور قندیل حیات ہے، فکر فراہی کا مرکز ومحور قرآن کریم ہے اور قرآن کریم علوم ومعارف کا منبع ومخرج ہے، مولانا اصلاحی نے بیشمار دینی اور معاشرتی موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے اور ان تمام موضوعات میں کتاب الٰہی کو اوّلیت دی گئی ہے اور اسی کی روشنی میں نتیجۂ بحث اور منزلِ مقصود کے تلاش کرنے کی جدوجہد کی گئی ہے، فرقان حمید کی برکت ونعمت ہے کہ آپ کا فکر مسلکیت وعصبیت اور ژولیدگی سے پاک ہے۔

قرآن کریم کی طرح احادیث سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، لیکن قرآن کریم اور حدیث کے درمیان جوفرق ہے اسے مولانا نے ملحوظ رکھا ہے، احادیث پر دیئے گئے لکچرز میں حدیث کے مقام ومرتبہ پر پُرمغز گفتگو کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث کے باب میں افراط وتفریط سے کام لینے والوں نے نہ صرف مولانا امین احسن اصلاحی بلکہ ان کے استاذ گرامی مولانا فراہی پر بھی منکر حدیث کا الزام لگایا گیا۔

مولانا نے متعدد تشریعی اور فقہی موضوعات پر اظہار خیال کیا، لیکن ان میں فقہ کے مختلف مکاتبِ فکر سے اکتساب واستفسار نہیں کیا گیا، بلکہ ان موضوعات میں اساسی اور مرکزی حیثیت قرآن کریم اور حدیث کو دی گئی ہے، مولانا کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی قوتِ استنباط واستخراج عطا کی ہے، اسلامی ریاست اور عائلی کمیشن کی رپورٹ میں نہایت اہم موضوعات کو اٹھایا گیا ہے ان مباحث سے مولانا کی فقہی بصیرت پوری طرح عیاں ہے۔

مولانا کی تحریروں سے مترشح ہے کہ آپ کی حیثیت ایک داعی کی تھی،

زندگی بھر ملت اسلامیہ اور عوام الناس کو قرآن کریم کی دعوت دیتے رہے، ایک مفسرِ قرآن ہونے کے ناتے ان کے سامنے قرآن کریم کی آیت کریمہ "ومن احسن قولاً ممن دعاالیٰ اللہ وعمل صالحاً وقال اننی من المسلمین" (حٰم السجدہ: ۳۳/۴۱) کا پوری طرح واضح تھا، یہی وجہ ہے کہ مدرسۃ الاصلاح پر قرآن کریم کی تدریس کے ساتھ ساتھ دینی موضوعات پر تقاریر کا سلسلہ بھی جاری رہا، پاکستان جانے کے بعد تحریکِ اسلامی کے اندر اپنی دعوتِ دین سے متعلق تحریروں اور تقاریر کے ذریعہ ایک جان ڈالدی، اسی امتیازی پہلو کو پروفیسر خورشید نے اس طرح پیش کیا:۔

> "مجھے ان کی تحریر میں شبلی کی ادبیت، مولانا مودودی کی فکری گہرائی اور سلاست اور ابو الکلام آزاد کی خطابت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے، جہاں وہ ٹھوس دلائل اور محکم تحقیق کے بادشاہ تھے وہیں وہ ایک اعلیٰ انشاء پرداز اور شگفتہ بیاں ادیب اور مقرر تھے، ان کے اسلوب میں ایک منفرد شوخی اور بانکپن ہے جس میں قرآن اور بائبل دونوں کے ادب کا پرتو نظر آتا ہے"۔[۵۱]

تحریکِ اسلامی سے علاحدگی کے بعد اپنی دعوت اور رجوع الی القرآن کا کام "انجمن خدام القرآن" اور "میثاق" کے ذریعہ آغاز کیا اور پانچ سال بعد "ادارہ تدبر قرآن وحدیث" اور مجلّہ "تدبر" کے ذریعہ دعوتِ اسلام اور قرآنی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے تن من دھن سے مصروف رہے اور اس میں آپ کے شاگرد محترم خالد مسعود صاحب آپ کے لئے دستِ راست ثابت ہوئے، اس طرح زندگی کا لمحہ لمحہ دعوت دین کا کام کرتے ہوئے جان جاں

آفریں کے سپرد کردی۔

آپ کے مقالات متعدد قرآنی اور اسلامی موضوعات کو سمیٹتے ہوئے ہیں، ان مقالات کی علمی دنیا میں وہی عظمت و رفعت ہے جو مقالاتِ شبلی، مقالاتِ عرشی، مقالاتِ سید سلیمان ندوی، مقالاتِ مودودیؒ اور مقالاتِ معصومی کی ہے، ان مقالات پر قرآن کریم کی گہری چھاپ ہے، مولانا کے ذہنی اور فکری میلان کا پتہ دینے میں یہ حد درجہ معاون ہیں، مولانا کی مقالہ نگاری کی مختلف جہتوں کا جائزہ لینے کی اشد ضرورت ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی اور خوش بختی ہے کہ یہ تمام کام اردو زبان میں ہے، اس کی وجہ سے اربابِ اردو کے لئے صالح اور مستقیم فکر کا وجود عمل میں آیا، اس فکرِ سلیم اور جہت مستقیم کو ایک پاکیزہ اور سنجیدہ انداز میں پیش کیا گیا، مولانا کی تحریروں میں بادسحر گاہی کی سی لذّت اور طلوعِ صبح کی سی رنگت ہے، غضب کی رعنائی اور بلا کی انشاء پردازی ہے، آپ کی تحریر اور تقریر دونوں میں ایسی خوشبو کہ مشام جاں کو معطر کردے، ذہنی الجھنوں کا مداوا اور فکری کلفتوں کا تریاق ہے، جگہ جگہ چشم کشا اور دل کشا مناظر سے مربوط، اس میں کلام نہیں کہ فکر اور اسلوب دونوں اعتبار سے اردو کو مال مال کرنے میں مولانا نے غیر معمولی خدمات انجام دیں، انہیں مفسر اور اسلامی مفکر کے ساتھ بجا طور پر اردو کا عظیم ادیب، منفرد انشاء پرداز اور صاحبِ طرز مصنف قرار دیا جاسکتا ہے، کاش کہ اردو ناقدین و محققین اسلام پسند مصنفین و مفکرین کی نگارشات کا اس انداز سے تحلیل و تجزیہ کرتے۔[۵۲]

☆☆☆

حواشی

۱۔ شبلی کالج، شبلی اکیڈمی اور مدرسۃ الاصلاح نے اردو ادب کی تاریخ کے دامن کی توسیع میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ بندول، جیراجپور، چریاکوٹ، پھریہا، سیدھا سلطانپور اور ان کے علاوہ اعظم گڑھ کے بیشمار گاؤں ایسے ہیں جنہوں نے اردو کی عظمت و حشمت میں قابلِ قدر اقدامات کئے، اس تعلق سے حیاتِ شبلی، علماء اعظم گڑھ، علماء جیراجپور، علماء مبارک پور، شعرائے اترپردیش اور خاکسار کی ''نیر تاباں'' ملاحظہ کی جاسکتی ہیں، اسی حوالے سے ''نزھۃ الخواطر'' اور ''یادرفتگاں'' بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

۲۔ مولانا کے اردو اسلوب بیان کے لئے دیکھئے: ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۹۸ء، ۱۶۱/۱، ص: ۶۲۔

۳۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: سیرت النبی، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی ۲۰۰۳ء، ۱۲۰/۱

۴۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: تفہیم القرآن، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز نئی دہلی، اگست، ۲۰۰۳ء، ۱۲/۱۔۶

۵۔ تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، تاج کمپنی، دہلی، باراول، ۱۹۸۹ء، ۶۵/۱

۶۔ ایضاً، ۲۶۱/۱

۷۔ تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، تاج کمپنی، باراول، ۱۹۸۹ء، ۵/ ۵۰۵

۸۔ تدبر قرآن، ۱/ ۶۱۲

۹۔ تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی: تاج کمپنی، دہلی، باراول، ۱۹۸۹ء، ۹/ ۳۴۴

۱۰۔ ایضاً، ۹/ ۱۷۲

۱۱۔ ایضاً، ۹/ ۱۹۵

۱۲۔ تدبر قرآن ، امین احسن اصلاحی، مکتبۂ جدید پریس لاہور، ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء ۳/ ۶۲

۱۳۔ ایضاً، ۳/ ۶۴

۱۴۔ ایضاً، ۳/ ۲۳۰۔۲۳۱

۱۵۔ تدبر قرآن ، امین احسن اصلاحی، باراول، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ۷/ ۳۰۵

۱۶۔ تفسیر نظام القرآن، علامہ حمیدالدین فراہی (مترجم امین احسن اصلاحی) دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ، ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۰ء۔ ص: ۲۵۰

۱۷۔ ایضاً، ص: ۹۷

۱۸۔ ایضاً، ص: ۱۷۹

۱۹۔ اقسام القرآن ۔استاذ امام مولانا حمیدالدین فراہی (مترجم امین احسن اصلاحی) طبع دوم، مکتبہ چراغ راہ، کراچی، ۱۹۵۳ء، ص: ۵۶

۲۰۔ ذبیح کون ہے؟ امام مولانا حمیدالدین فراہیؒ (مترجم: امین احسن اصلاحی) طبع اول ، کوہ نور پرنٹنگ پریس، لال کنواں دہلی، (بدون

تاریخ) ص:۴۲

۲۱۔ مبادیٔ تدبر حدیث، امین احسن اصلاحی (ترتیب: ماجد خاور) طبع سوم، فاران فاؤنڈیشن، لاہور پاکستان، رجب ۱۴۲۱ھ/ اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص: ۶۲۔۶۳

۲۲۔ فہم حدیث کے تعلق سے مولانا کے لکچرز خاصے مشہور ہوئے، اسے علمی حلقوں میں پسند کیا گیا، مولانا نے بخاری اور مؤطا کے منتخب ابواب کی شرح بیان کی، اس کے لئے دیکھئے: تدبر حدیث، شرح صحیح بخاری، مولانا امین احسن اصلاحی (ترتیب وتدوین: خالد مسعود، سعید احمد، سید اسحاق علی) شرکت پرنٹنگ پریس، ۴۳، نسبت روڈ، لاہور، باراول، ۲۰۰۲ء، ۱/ ۵۷۹، نیز دیکھئے: تدبر حدیث، شرح مؤطا، امام مالک (منتخب ابواب) مولانا امین احسن اصلاحی (ترتیب وتدوین: خالد مسعود، سعید احمد) باراول ۲۰۰۰ء شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، صفحات: ۵۴۴)

۲۳۔ مبادیٔ تدبر حدیث، ص: ۱۳۔۱۴، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کی حیات وخدمات کے لئے ابویحیٰ امام خاں نوشہروی کی ''تراجم علماء حدیث ہند'' اور قاضی اطہر مبارکپوری کی ''تذکرہ علماء مبارکپور'' کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

۲۴۔ کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ، ص: ۴۳۰

۲۵۔ مبادیٔ تدبر حدیث، ص: ۵۸۔۵۹

۲۶۔ ایضاً ص: ۱۳۴

۲۷۔ تزکیۂ نفس، مولانا امین احسن اصلاحی، طبع اول، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دہلی۔ ۱۹۹۹، ۱۰۰۰، ص: ۳۸

۲۸۔ ایضاً ص: ۴۱

۲۹۔ تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، بار دوم، مکتبہ چراغ راہ، کراچی، شمارہ، ۶/اپریل ۱۹۹۸ء، ص:۵۷۔۵۸

۳۰۔ دعوتِ دین اور اس کا طریقۂ کار، امین احسن اصلاحی، طبع دوم، فاران فاؤنڈیشن، اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص:۴۴

۳۱۔ تاریخ اسلام کا ایک منفرد مفسر قرآن، عطاء الرحمٰن، ماہنامہ اشراق، (خصوصی نمبر) ۱۰/۱۔۲ جنوری۔فروری ۱۹۹۸ء ص:۴۷۔۴۸

۳۲۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: مولانا امین احسن اصلاحی کی تحریکی خدمات، صفدر سلطان اصلاحی، ششماہی مجلّہ علوم القرآن، (خصوصی اشاعت، مولانا امین احسن اصلاحی نمبر)، جنوری ۱۹۹۸ء دسمبر ۲۰۰۰ء، جلد ۱۳۔۱۵، ص:۳۹۴۔۴۵۶

۳۳۔ اسلامی ریاست، مولانا امین احسن اصلاحی، مرکنٹائل پریس، لاہور، ۱۹۵۰ء، ۱/۱۷۔۱۸

۳۴۔ اسلامی قانون کی تدوین، مولانا امین احسن اصلاحی، مکتبہ المنبر، لائل پور، جولائی ۱۹۶۳ء، ص:۴۱۔۴۲

۳۵۔ پردہ اور قرآن مجید، امین احسن اصلاحی، مکتبہ اسلامی، لہیر یا سرائے، (بدون تاریخ)، ص:۲۷۔۲۸

۳۶۔ مولانا کے اسلوب کے سلسلے میں دیکھئے: مولانا امین احسن اصلاحی کا اسلوب نگارش۔محمد الیاس اعظمی (ششماہی مجلّہ علوم القرآن (مولانا امین احسن اصلاحی نمبر) جلد ۱۳۔۱۴، ص:۲۷۲۔۲۸۷

۳۷۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: مقالات اصلاحی، امین احسن اصلاحی (ترتیب: خالد مسعود) فاران فاؤنڈیشن، لاہور، پاکستان، طبع اول، اگست

۱۹۹۱ء/صفر۱۴۱۳ھ،۱/۵۱۔۲۴۵

۳۸۔ تنقیدات، مولانا امین احسن اصلاحی، باراول، مرکزی مکتبہ جماعتِ اسلامی پاکستان، لاہور، ۱۹۵۵ء ص:۱۲۲۔۱۲۳

۳۹۔ مقالات اصلاحی، امین احسن اصلاحی (ترتیب: خالد مسعود) طبع اول، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، پاکستان، اگست ۱۹۹۱ء صفر ۱۴۲۱ھ، ۱/۳۰۰

۴۰۔ تفہیم دین، امین احسن اصلاحی، طبع اول، فاران فاؤنڈیشن، مئی ۱۹۹۲ء/ ذی قعدہ ۱۴۱۲ھ، ص:۱۷۵۔۱۷۷

۴۱۔ اس تعلق سے تفسیر سرسید، مقالات سرسید، خطبات احمدیہ اور تبیین الکلام کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، جس میں قرآنیات اور استشراق سے متعلق بیشمار مباحث ہیں، یہ حقیقت ہے کہ فہم قرآن کی راہوں کو ہموار کرنے میں اور مستشرقین کا پول کھولنے میں سرسید کی قابلِ ذکر خدمات ہیں، ''قرآنیات سرسید'' پر خاکسار کی کتاب آنا ہی چاہتی ہے۔

۴۲۔ سرسید اور فراہی کے تفسیری خیالات، ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی،

Contribution of Sir Syed Ahmad Khan. To word Islamic Studies (Edited by Abdul Ali and Syyid Ahsan) A.M.U. Aligarh. PP.: 300-339.

۴۳۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: ششماہی علوم القرآن، ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ، یوپی، جنوری۔جون ۲۰۰۳ء، ۱۸/۱، ص:۵۔۲۱

۴۴۔ حقیقتِ تقویٰ، مولانا امین احسن اصلاحی، بار دوم، مکتبہ جماعتِ اسلامی، حیدرآباد، دکن، ۱۹۴۸ء، ص: ۴۔۷

۴۵۔ حقیقتِ شرک، مولانا امین احسن اصلاحی، بار دوم، ادارۂ حمیدیہ، قرول

باغ، دہلی، ۱۹۴۶ء، ص: ۱۳۵۔۱۳۶

۴۶۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: مجلّہ علوم القرآن (اصلاحی نمبر) ص: ۴۷۲۔۴۷۴

۴۷۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: الاصلاح، ضیاء الدین اصلاحی، (مجلّہ علوم القرآن، اصلاحی نمبر، ص: ۳۳۵۔۳۷۹)

۴۸۔ اردو رسائل کے قرآنی مضامین کا اشاریہ، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، طبع اول، ادارہ علوم القرآن، ۲۰۰۵ء، ص: ۱۵

۴۹۔ شذرات از مولانا امین احسن اصلاحی، مجلّہ الاصلاح (ماہنامہ) دائرہ حمیدیہ، سرائے میر، اعظم گڑھ، صفر، ۱۳۵۶ھ مئی ۱۹۳۷ء، ۲/۵، ص: ۲۶۲۔۲۶۳

۵۰۔ شذرات از مولانا امین احسن اصلاحی، مجلّہ الاصلاح (ماہنامہ) دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ، شوال المکرّم وذیقعدہ، ۱۳۵۶ھ/جنوری ۱۹۳۸ء، ۳/۱، ص:

۵۱۔ مولانا امین احسن اصلاحی کی یاد میں، پروفیسر خورشید احمد، ماہنامہ ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۹۸ء، ص: ۵۳۔

۵۲۔ مولانا امین احسن اصلاحی کے اسلوب بیان کے لئے دیکھئے: اردو زبان وادب کے ارتقاء میں ابنائے مدرسۃ الاصلاح کا حصہ، زبیر عالم، سالانہ مجلّہ ''انجمن طلبہ'' مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ، شمارہ: ۱۶، ۲۰۰۳ء

مولانا ضیاء الدین اصلاحی
اور مجلّہ "الاصلاح۔ایک تعارف" ..... جائزہ

ابوسفیان اصلاحی

مدرسۃ الاصلاح مولانا محمد شفیعؒ، شبلیؒ اور فراہیؒ کی آرزوؤں کا ثمرہ ہے، اسلامیات خصوصاً قرآنیات میں اس ادارے کی خدمات ہمیشہ اہلِ علم کی توجہ کا مرکز رہی ہیں، یہی اس ادارے کا امتیاز ہے اور فضلاءِ ادارہ نے قرآنیات ہی کو اپنا معیار و محور بنایا، مولانا عبدالحمید فراہی نے فہم قرآن کے ایسے واضح خطوط ونقوش چھوڑے کہ جس کی اہمیت وافادیت کا اعتراف عرب وعجم میں کیا گیا، فکرِ فراہی طالبینِ قرآن کے لئے نسخۂ کیمیا ہے، اسی کو بنیاد بنا کر فارغینِ مدرسہ نے تدبرِ قرآن میں کارہائے نمایاں انجام دیئے جس کا اعتراف علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بڑے پرزور انداز میں کیا ہے[1] مولانا اختر احسن اصلاحی[2]، مولانا امین احسن اصلاحی،[3] مولانا نجم الدین اصلاحی، مولانا بدرالدین اصلاحی، مولانا ابواللیث اصلاحی[4]، مولانا داؤد اکبر اصلاحی، مولانا صدرالدین اصلاحی،[5] مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا عنایت اللہ سبحانی اصلاحی، مولانا سلطان احمد اصلاحی اور مولانا محمد اجمل اصلاحی وغیرہ نے اپنی تحقیقات سے دنیائے قرآنیات میں اضافہ کیا ہے۔

اس مضمون میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی خدمات کا ایک اجمالی

جائزہ پیش کیا جائے گا، شبلی اکیڈمی اور مدرسۃ الاصلاح دونوں کی مولانا سربراہی فرمارہے تھے، یہ دراصل علامہ شبلی نعمانی کے ان خوابوں کی ایک عملی تصویر تھی جو دونوں اداروں کو مدغم کر کے ایک مکمل جامعہ کی تشکیل کے خواہش مند تھے، علامہ حمیدالدین فراہی کے انتقال کے بعد جو کڑی ٹوٹ گئی تھی اسے ایک عرصہ کے بعد ۱۹۹۶ء میں مولانا ضیاءالدین اصلاحی کی مساعیٔ جمیلہ سے یہ مبارک سلسلہ ایک عرصہ بعد روبعمل آیا کہ دونوں اداروں کی عنانِ سیادت ایک ہی ہاتھ میں جا پہنچی، لیکن افسوس صد افسوس کہ بتاریخ ۲/فروری ۱۹۰۸ء کو مولانا کے جاں کاہ حادثہ سے یہ قیادت ایک بار پھر بکھر گئی، سقوطِ سیادت کے ساتھ ساتھ دنیائے علم خسران مبین سے گزر گئی، ارباب علم و فضل ایک عظیم ماہر قرآنیات، مدبر اسلامیات، ادبی رموز کے واقف کار اور علمی مذاکروں کے سرتاج سے محروم ہو گئے، اس سے بڑا ایک نقصان یہ ہوا کہ مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا صدرالدین اصلاحی کے سوانح ارتحال کے بعد مولانا ضیاءالدین اصلاحی کی وہ تنہا ذات تھی جو فکرِ فراہی کی حقیقی ترجمان تھی، تصانیفِ فراہی کا دقّتِ نظر سے مطالعہ کیا، مولانا فراہی کے بہت سے افکار کا بڑے سلیقے سے جائزہ پیش کیا، آپ کے انتقال پر ملال سے کئی دھچکے لگے، لیکن خدائے علیم و خبیر سے امید ہے کہ وہ اس علمی خلا کو ضرور پر کرے گا۔

قرآنیات مولانا ضیاءالدین اصلاحی کے مختلف امتیازات کا ایک روشن پہلو یہ تھا کہ آپ کے فراہی نقطۂ نظر کا نہایت گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا، معارف اور بے شمار مجلّات میں فکرِ فراہی کی توسیع و تشہیر میں متعدد مقالات تحریر کیے، قرآنیات اور فراہیات سے متعلقہ مقالات کو ''ایضاح القرآن''[۶] کے عنوان سے جمع کیا، مولانا فراہی کی معرکہ آراء تصنیف ''اسالیب القرآن'' کے مضامین کو

اس انداز سے پیش کیا کہ اس سے فکر فراہی کی سچی نمائندگی ہوئی، اردو داں حلقے کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوئی، ''اُسالیب القرآن'' سے متعلق دو مضمون مولانا نے تحریر کئے، ایک کا عنوان ''قرآن مجید کے بعض اسالیب'' اور دوسرے کا ''قرآن مجید کا طرزِ تخاطب اور طریقۂ خطاب'' ہے، اول الذکر مضمون میں قرآنی اسلوب کے مختلف گوشوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، مثلاً التفات، تصریف آیات، قصص، حذف، ایجاز، تفصیل، عود علی البدء، جملہ معترضہ، تمثیلات، تقابل اور اقسام القرآن جیسے مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے، توضیح کے لئے آیاتِ قرآن سے مثالیں پیش کی گئی ہیں، مولانا نے یہ خلاصہ ایسے دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے کہ اصل کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ے

دوسرے مضمون میں قرآن کریم کے طرزِ تخاطب اور طریقۂ خطاب سے بحث کی گئی ہے، تخاطب کی متعدد صورتیں قرآن مجید میں ہیں، اگر یہ تمام جہتیں پیشِ نظر نہ ہوں تو فہم قرآن میں غلطی کا امکان ہوتا ہے، مثلاً نبی ﷺ کے حوالہ سے کس طرح امت کو مخاطب کیا جاتا ہے، کبھی براہِ راست روئے سخن لوگوں کی جانب ہوتا ہے اور خطاب کرنے والے کی تعیین کس طرح کی جائے ان تمام موضوعات کو اس میں سمیٹا گیا ہے، نیز التفات کے فوائد پر اظہار خیال کیا گیا ہے، یہ دونوں مضمون اسالیبِ قرآن کے تئیں حد درجہ مفید ہیں۔ ۸

مولانا حمیدالدین فراہی کی کتابوں میں ایک معروف کتاب "التکمیل فی اصول التاویل" ہے، مضمون کی ابتداء میں مولانا اس کتاب کے متعلق رقم طراز ہیں:

''یہ ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی کا ایک مفید اور بلند پایہ رسالہ ہے، اس میں علم تاویل کے وہ اصول وضوابط

تحریر فرمائے ہیں، جن سے قرآن مجید کے صحیح معنی سے
واقفیت حاصل کرنے میں مدد ملی ہے، ان کے نزدیک ان
اصولوں سے قرآن مجید کے حقائق و معانی بھی بے نقاب
ہوتے ہیں اور یہ باطل اور گمراہ کن خیالات کا سدِ باب بھی
کرتے ہیں"۔ ۹

مذکورہ بالا کلمات سے مترشح ہے کہ قرآنیات کے موضوع پر یہ ایک گراں قدر کتاب ہے، اس میں تفسیر بالرائے، تدبرِ قرآن، اصولِ تاویل کے مقاصد و فوائد، تاویل کی تعریف اور اس کا حکم، تاویل، تحریف اور تفصیل کا فرق، تاویل میں غلطی کا سبب، ایک تاویل اور ایک مفہوم، متشابہات کی تاویل، اصولِ تاویل کے رہنما اصول، قرآن کی علمی اور ادبی پہلوؤں کے جاننے کا طریقہ جیسے مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ کتاب فہم قرآن اور تاویلِ آیات کے باب میں انفرادیت کی حامل ہے، تاویلِ آیات سے متعلق تحریروں میں اسے اعلیٰ مقام حاصل ہے، مولانا فراہی کے یہاں اس قدر ایجاز ہے کہ اس کی تہ میں جانا ایک امر دشوار ہے لیکن مولانا نے چونکہ فراہیات کو اپنا نکتۂ ارتکاز قرار دیا تھا اس لئے انہیں مولانا فراہی کے منفرد انداز سے واقفیت تھی۔

مولانا فراہی نے اپنی کتاب "الرأی الصحیح فیمن هو الذبیح" آیت کریمہ "ان الصفا والمروۃ" پر نہایت مدلل بحث کرتے ہوئے بتایا کہ یہاں صفا اور مروہ سے بالعموم مفسرین نے وہ مقام مراد لیا ہے کہ جہاں حضرت ہاجرہ نے پانی کی تلاش میں دوڑ لگائی تھی اور اس کی وجہ سے آبِ زمزم ابل پڑا تھا، لیکن مولانا نے اس خیال سے اختلاف کرتے ہوئے بتایا کہ اس سے مراد وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے لختِ جگر حضرت اسماعیلؑ کو حکم خداوندی کی

اتباع کرتے ہوئے ذبح کرنے کے لئے لٹایا تھا، اسی مناسبت سے اس مقام کو ''شعائر اللہ'' سے منسوب کیا گیا ہے۔[۱۰]

مولانا نے مولانا فراہی کے اس خیال پر اپنا تجزیہ ان الفاظ میں پیش کیا:

> ''اس لئے ہمارے خیال میں یہاں کنعان سے خانۂ خدا کے متعلق یہود کا اخفاء مراد ہے، کیونکہ انہوں نے خانۂ کعبہ کے معبد اور قبلہ ہونے کا اخفاء کیا تھا، واقعۂ قربانی اور موقع ذبح پر پردہ ڈالا تھا، حضرت اسماعیل کے بجائے حضرت اسحاق کو ذبیح قرار دیدیا تھا اور صفا و مروہ کے شعائر الٰہی ہونے کو چھپایا تھا''[۱۱]

قرآنیات پر مولانا کے بیشمار مقالات مختلف قرآنی مباحث سے متعلق ہیں، تاویل آیات، معانی مفردات القرآن، تفاسیر، مفسرین، نظم قرآن اور کلامِ عرب جیسے گوشوں پر مولانا نے اظہار خیال کیا ہے، ان متنوع مضامین سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مولانا نے عمر کا ایک بڑا حصہ اسی دشت کی سیاہی میں گزارا تھا، اپنے ادارہ کے امتیاز کو برقرار رکھنے کے لئے تادم واپسیں قرآنیات پر جواہر و موتی بکھیرتے رہے، اسی تشخص کے ثبات کے لئے تا عمر قلم و قرطاس سے جڑے رہے، ایک بار گفتگو میں فرمایا کہ مولانا فراہی کی گہرائیوں میں اترنے کے بعد اکثر مفسرینِ قرآن نظروں میں جچتے نہیں، تاویلِ آیات کے سلسلے میں چند گراں ترین مضامین کے عناوین اس طرح ہیں، آیات صیام کی توجیہ و تاویل[۱۲]۔ اصحاب اعراف۔[۱۳] سورہ انعام کی چند آیات میں خطاب اور ضمیروں کی تعیین۔[۱۴] القرآن میں قصۂ ابراہیم اور مستشرقین کے اعتراضات۔[۱۵] فبدل الذین ظلموا۔[۱۶] ان منکم الا واردھا۔[۱۷] اور اتبعوا ما تتلوا الشیاطین۔[۱۸]

وغیرہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ نے مولانا کو تفسیر آیات کی غیر معمولی صلاحیت عطا کی تھی، تاویلِ آیات میں مولانا نے نظمِ قرآن اور اشعارِ عرب کو مرکزی حیثیت دی ہے، کلامِ عرب سے استشہاد اور نظمِ قرآن سے استدلال فکرِ فراہی کا خاصہ ہے، اس کے مفردات کی گہرائیوں تک رسائی اور آیات کریمہ کی حکمتوں کی معرفت ممکن نہیں، تاویلِ آیات کریمہ ان دونوں چیزوں کو مولانا نے پیشِ نظر رکھا۔

اسی طرح مولانا کے بہت سے مقالات ایسے ہیں جن سے قرآن کریم کی رفعتوں اور عظمتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مثلاً سورہ فاتحہ کے بعض مباحث[۱۹] یہود اور قرآن مجید[۲۰] صفات الٰہی کا قرآنی تصور اور مولانا آزاد[۲۱] اور اصحاب الاعراف[۲۲] وغیرہ دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہ وہ تحریریں ہیں جو عمیق تفکر و تدبر کا پتہ دیتی ہیں، یہ ایک یا دو دن کا ثمرہ نہیں ہیں، بلکہ طویل غور وخوض اور تمسک بالکتاب کا ثمرہ ہیں، ایک خاص بات ان مقالات میں یہ جھلکتی ہے کہ مولانا جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے تو اس کے تمام جزئیات کا احاطہ کرتے، یہ چیز انہیں دبستانِ شبلی اور دبستانِ فراہی سے وراثت میں ملی تھی۔

مولانا کے قرآنی مقالات سے مترشح ہے کہ انہوں نے قدیم اور جدید تفاسیر کا دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا، تفاسیر کے مزاج، رجحانات اور میلانات سے بخوبی واقف تھے، ان کے محاسن اور معائب ان کی نظروں سے اوجھل نہ تھے، اس سلسلے میں آپ کے مضامین تفسیر کبیر اور اس کا تکملہ[۲۳] تفسیر ابن کثیر، رازی کی تفسیر کبیر میں ربط آیات[۲۴] قابل قدر حیثیت کے مالک ہیں، اگر اس انداز سے تفاسیر کا مطالعہ کیا جائے تو یقیناً دنیائے قرآنیات میں ایک اضافہ ہوگا، "تفسیر کبیر

اور اس کا تکملہ'' مولانا کا ایک غیر معمولی مقالہ ہے، اس تفسیر کی ایک ایک سطر کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے اسلوب، مضامین اور طرز تفسیر سے بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ کہاں تک اس میں امام رازی کی کاوشیں شامل ہیں اور کہاں تک احمد بن خلیل خولی کی، مولانا نے نتیجۂ تحقیق اس طرح پیش کیا ہے۔

''ہماری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل سے اس کتاب یعنی تفسیر کبیر کا وہ حصہ مراد ہے جو خود امام فخر الدین رازی نے لکھا تھا اور یہ قرآن مجید کے ان حصوں کی تفسیر پر ہے۔

۱۔ سورہ فاتحہ سے سورہ قصص تک۔

۲۔ سورہ صافات کے شروع سے سورہ احقاف کی تفسیر کے آخر تک۔

۳۔ سورہ حشر، مجادلہ اور حدید کی تفسیریں۔

۴۔ سورہ ملک کی تفسیر سے لے کر کتاب کے آخر تک کی تفسیریں۔

ان حصّوں کے علاوہ جو کچھ حصّے تفسیر میں شامل ہیں، وہ احمد بن خلیل خولی کی تصنیف ہیں اور یہ خولی کی طرف مسنوب تکملہ کا ایک جزء ہے، کیونکہ اس کا تکملہ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے اصل کی تعلیق پر مشتمل ہے۔'' ھذا ظھرلی واللہ اعلم [۲۵]''

قرآنیات سے متعلق مولانا کے بیشمار مقالات ہندوپاک کے مجلّات میں شائع ہوئے ہیں، کاش کہ انہیں جمع کر کے شائع کیا جاتا۔

حدیث:

فضلاءِ مدرسۃ الاصلاح کے تئیں بڑی فراخ دلی سے اعتراف کیا جاتا ہے کہ انہوں نے قرآنیات کے باب میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں، لیکن احادیث کے باب میں انہیں کوتاہ قد قرار دیا گیا ہے، جب کہ احادیث پر

مولانا امین احسن اصلاحی کے خطباتِ علمی دنیا میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے گئے ہیں، ان خطبات کو مولانا کے شاگرد خالد مسعود نے بڑی ریاضتوں سے ''تدبر حدیث'' کے عنوان سے ترتیب دیا ہے[۲۶] اسی طرح مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی ''تذکرۃ المحدثین'' غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے، دو حصوں پر مشتمل یہ کتاب ۸۷۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، حصہ اول میں دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات وسوانح اور ان کی خدمات حدیث کی تفصیل بیان کی گئی ہے، دوسرے حصہ میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور اور صاحبِ تصنیف محدثین کرام کے حالات، سوانح اور ان کی علم و حدیث سے متعلقہ خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے[۲۷]۔

اس کتاب کی روشنی میں یہ بات بغیر کسی تامل کے کہی جاسکتی ہے کہ محدثین کے احوال اور علمی خدمات کی تلاش و تفحص میں نہ جانے کتنی مہمات طے کی ہیں، تمام اہم مراجع و مصادر کو کھنگالا ہے، اس طرح محدثین کے تذکروں میں بڑی قیمتی چیزیں جمع کردی ہیں، محدثین کے تذکروں میں ان پہلوؤں کو پیش نظر رکھا گیا ہے مثلاً نام و نسب، ولادت، خاندان، وطن، اساتذہ، تلامذہ، رحلت وسفر، حفظ وثقاہت، حدیث میں درجہ، رجال، فقہ وقضا، مذہب ومسلک، وفات، تصنیفات اور معجم الصحابہ جیسے موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں، یہ کتاب مولانا کے تحقیقی مزاج پر دال ہے، بڑی علمی کوہ کنی کے بعد ان حالات کو ترتیب دیا ہے، یہ مبنی بر حقیقت ہے کہ مفسرین اور محدثین دونوں پر مولانا کا مطالعہ وسیع تھا۔

وفیات:

ماہنامہ معارف کے متعدد امتیازات ہیں، اس میں سے ایک امتیاز یہ ہے کہ ارباب علم و فضل، علماء، ادباء، شعراء اور مختلف سماجی مشاہیر کے انتقال پر

مدیر معارف نے انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، علامہ سید سلیمان ندوی، شاہ معین الدین ندوی، صباح الدین عبدالرحمٰن پرواز اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے سیکڑوں ارباب ذکر وفکر کے احوالِ زندگی، معاشرتی خدمات، علمی اور ادبی فتوحات پر اظہار خیال کیا، اگر معارف میں مذکورہ شخصیات کو یکجا شائع کر دیا جائے تو اسے ضرور انسائیکلوپیڈیا کا درجہ حاصل ہوگا، سید صاحب اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن پرواز نے جن شخصیات پر اظہارِ خیال کیا تھا اسے کتابی شکل میں ''بزم رفتگاں'' کے عنوان سے دو جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے[۲۸]، کاش کہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی وفیات کو بھی شائع کر دیا جاتا۔ مولانا نے ایک سو سے زیادہ قابلِ ذکر اشخاص پر اظہارِ خیال کیا، ان شخصیات کا مختلف شعبہائے زندگی سے تعلق تھا اور انہیں کسی نہ کسی حیثیت سے باوقار تصور کیا جاتا تھا، اس میں متعدد شخصیات ایسی ہیں جن کا مولانا کی مادر علمی مدرسۃ الاصلاح سے تعلق تھا، مثلاً مولانا بدرالدین اصلاحی[۲۹]، مولانا ابوبکر اصلاحی[۳۰]، مولوی ابوالحسن علی فراہی اصلاحی[۳۱]، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی[۳۲]، مولانا امین احسن اصلاحی[۳۳]، مولانا صدرالدین اصلاحی[۳۴]، عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی[۳۵] اور مولانا عبدالمجید ندوی[۳۶] وغیرہ۔ ان مضامین سے ایک طرف مذکورہ بالا شخصیات کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف مدرسہ کے عز و وقار کا پتہ چلتا ہے، یہاں بطور نمونہ ایک اقتباس نقل کیا جا رہا ہے جس کا تعلق مولانا بدرالدین اصلاحی سے ہے۔

''مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم اپنی وفات کے وقت اپنے استاذ مولانا فراہی کے علمی متروکات اور مسودات مولانا بدرالدین اصلاحی کو سپرد کر گئے تھے، اس بیش بہا متاع کو نہ صرف یہ کہ انہوں نے حفاظت کی بلکہ ہمیشہ اس کی

ترتیب واشاعت کے لئے فکر مند بھی رہے، انہوں نے مولانا کی متعدد مطبوعہ کتابوں کو جو دستیاب نہ تھیں دوبارہ طبع کرایا اور کئی غیر مطبوعہ تصنیفات کو اپنے فاضلانہ عربی مقدمے کے ساتھ شائع کیا، ان کے فارسی کلام کو بھی از سرنو شائع کیا اور اس پر فارسی زبان میں بیش قیمت مقدمہ تحریر کیا۔

ان کے محققانہ اردو مضامین اور عربی و فارسی کے عالمانہ مقدمے دیکھ کر کوئی شخص یہ باور نہیں کرے گا کہ وہ ایک گاؤں کے علم و ادب کش ماحول میں جہاں نہ کتابیں میسر تھیں اور نہ کوئی کتب خانہ تھا بیٹھ کر لکھے گئے ہیں"۔

علم و فن سے اشتغال ہی کی بناء پر وہ بعض رسالوں میں کبھی کبھی مضامین بھی لکھتے تھے، ۱۹۳۶ء میں ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی کی تصنیفات اور ان کے اردو ترجمے کی اشاعت کے لئے دائرۂ حمیدیہ کا قیامِ عمل میں آیا جس کی طرف سے "الاصلاح" کے نام سے ایک ماہوار علمی و تحقیقی رسالہ مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں نکلا جو گوشعلۂ مستعجل کی طرح اپنی چمک دمک دکھا کر بہت جلد غائب ہو گیا، تاہم اس نے مختلف موضوعات خصوصاً قرآنیات پر جو بلند پایہ اور فکر انگیز مضامین شائع کئے وہ آج بھی قرآن مجید کے طالب علموں کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہیں، الاصلاح کے چند گنے چنے مضمون نگاروں میں ایک اہم نام مولانا بدر الدین صاحب کا بھی ہے۔[۳۷]

اس کے علاوہ متعدد علماء کرام اور ماہرین اسلامیات کو مولانا نے موضوعِ بحث بنایا، ان کے اخلاق عالیہ اور علمی امتیازات پر روشنی ڈالی، مدیر معارف کو ہمیشہ احساس رہا کہ علماء کرام کے انتقال سے ملت کو بڑے خسارے کا سامنا ہوتا ہے، اسی لئے معارف کے توسط سے اس خسارے سے ملّت کو ہمیشہ باخبر کیا گیا، مولانا نے درج ذیل علماء کرام کے باب میں اپنے

تأثرات کا اظہار کیا، ابوالجلال ندوی [۳۸]، احتشام علی ندوی [۳۹]، اسلام احمد [۴۰]، قاضی اطہر مبارکپوری [۴۱]، مولانا افتخار فریدی [۴۲]، مولانا امتیاز علی عرشی [۴۳]، امیر شریعت مولانا عبدالرحمن [۴۴]، حبیب الحق ندوی [۴۵]، سید ابوالحسن علی ندوی [۴۶]، زین العابدین سجاد میرٹھی [۴۷]، ظفر احمد عثمانی [۴۸]، مولانا عبدالرؤف رحمانی [۴۹]، عبدالفتاح غدہ [۵۰]، مولانا محب اللہ لاری ندوی [۵۱]، مولانا محمد اسحاق سنبھلی [۵۲]، مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی [۵۳]، مولانا محمد تقی امینی [۵۴]، مولانا محمد مفتی شفیع [۵۵]، قاری محمد طیب [۵۶]، مولانا محمد منظور نعمانی [۵۷] اور محمد عبدالرشید نعمانی [۵۸] وغیرہ کی شخصیات کے متعلق مولانا نے اپنے تأثرات پیش کئے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ تین چار صفحات میں مدیر معارف بہت کچھ پیش کر دیا کرتے تھے اور علمی دنیا کے لئے معارف کے یہ صفحات بڑی اہمیت کے حامل ہوتے، اور اس کی ترتیب کے لئے کافی تلاش و تفحص سے گزرنا پڑتا تھا، یہاں مولانا امتیاز علی عرشی سے متعلق ایک اقتباس نقل کیا جارہا ہے تاکہ مولانا کے اندازِ بیان کا ایک عکس سامنے آسکے:۔

> ''مخطوطات کی تحقیق و دریافت، ان کی تلاش و جستجو اور ان کو محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ ایڈٹ کر کے شائع کرنا عرشی صاحب کا خاص امتیاز ہے، وہ متن کی تصحیح و تحشیہ کے کام سے اس وقت تک مطمئن نہ ہوتے جب تک کہ ان کے تمام نسخوں کو ملاحظہ نہ کر لیتے، اس کے لئے ان جگہوں کا سفر کرتے تھے، جہاں ان کے نسخے موجود ہوتے یا ان کی نقلیں مہیا کرتے، ان کی تحریر میں عالمانہ وقار و سنجیدگی کے ساتھ ہی سادگی، لینت، سلامت روی اور دل آویزی ہوتی تھی''۔[۵۹]

اسی طرح دارالمصنفین کی قدیم روایت کے مطابق اردو کے ادباء،

شعراء اور محققین کی وفات پر مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے ان کے کارناموں کے اعتراف کے لئے قلم وقرطاس کا سہارا لیا، اور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ مختصراً ان کے احوالِ زندگی اور ادبی، شعری اور تحقیقی کاوشوں پر اظہارِ خیال کرتے، مولانا کا یہ سلسلہ علمی اور ادبی دنیا کے لئے حد درجہ مفید تھا، اس طرح مولانا کے ادبی رجحانات دلچسپیوں اور تنقیدی رجحانات کا بھی پتہ چلتا تھا، علاّمہ شبلی کے قابلِ قدر دونوں اداروں دارالمصنفین اور مدرسۃ الاصلاح میں یہ ادبی سرگرمیاں جاری وساری ہیں جبکہ بالعموم ہمارے اسلامی ادارے اس طرح کی ادبی سرگرمیوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں، جبکہ ادب کا فہمِ قرآن اور فہمِ دین کے باب میں کلیدی کردار رہا ہے، مولانا نے درجِ ذیل شخصیات پر اپنے تأثرات قلم بند کئے، مثلاً آنند نارائن ملاّ [۶۰] پروفیسر خواجہ فاروقی [۶۱] اردو کا سردار چلا گیا (علی سردار جعفری [۶۲]) امجد علی غزنوی [۶۳] حیات اللہ انصاری [۶۴] رام لعل نابھوی [۶۵] عبدالسلام سندیلوی [۶۶] محمد مجیب [۶۷] اور میکش مرادآبادی [۶۸] وغیرہ کی ادبی اور شعری کاوشیں ہر عہد میں قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھی جائیں گی، یہ اربابِ ادب جنھوں نے ادبی ولسانی افق کو اعتبار بخشا، ان کی انہی معتبر جہتوں کی مولانا نے بازیافت کی ہے، آیئے دیکھئے کہ انہوں نے کس طرح سردار جعفری کے شعری محاسن کا تذکرہ کیا ہے۔

> ''ابتداء ہی سے وہ مارکس کے خیالات سے متاثر تھے جو برابر ان کی شاعری پر چھائے رہے، ۱۹۳۶ء میں منشی پریم چند کی سربراہی میں ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی، تو وہ اس میں شامل ہوگئے اور اپنی انقلابی شاعری سے مجاہدین آزادی کے دلوں میں فرنگیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ بھڑ

کاتے رہے، وہ ترقی پسند تحریک کو جنگ آزادی کا ایک بازو سمجھتے تھے، اس کے زیر اثر ان کے انقلابی خیالات اور انگریزوں کے خلاف باغیانہ جذبات میں مزید شدت پیدا ہوئی اور وہ عمر بھر اس تحریک کو قوت و توانائی دیتے اور اس کے ادبی سرمایہ کو مالا مال کرتے رہے، ''ترقی پسند ادب'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی، اس کی اشاعت اور سجاد ظہیر کے انتقال کے بعد ترقی پسند تحریک کی نظریاتی باگ ڈور عملاً انہیں کے ہاتھوں میں آ گئی تھی، ان کے خیال میں ترقی پسند تحریک میں سوویت یونین کے زوال کے بعد بھی کوئی بکھراؤ نہیں ہوا، البتہ تحریک کے ابتدائی دور میں جس پایہ کے شاعر اور افسانہ نگار پیدا ہوئے بعد کی نسل میں اس پایہ کے لوگ نہیں پیدا ہو سکے، مگر اس کو وہ اس عجیب و غریب تاریخی عمل کا نتیجہ بتاتے ہیں جس میں بہار کے بعد خزاں کے دور سے گزر رہا ہے، جو نئی بہار کی آمد کا اعلان ہے''۔[۶۹]

علماء کرام اور اہل ادب کی خدمات کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ معارف میں مختلف سماجی، سیاسی اور دیگر ملی امور سے عبارت شخصیات کے انتقال پر بھی حزن و غم کا اظہار کیا جاتا تھا، ان شخصیات کے متعلق معلومات اکٹھا کرنا اور اسے مضامین کی شکل دینا ایک دشوار ترین مسئلہ ہوتا لیکن مولانا نے ان تمام مشکلات کو سر کیا اور نہایت اطمینان بخش میں ان کے کوائف اور سماجی خدمات کو پیش کیا، مثلاً اے کے بروہی [۷۰]، بدر الدین طیب جی [۷۱]، کرنل بشیر حسین زیدی [۷۲]، جنرل ضیاء الحق [۷۳]، حکیم عبد الحمید [۷۴]، منشی عبد العزیز انصاری [۷۵]، محب اللہ

لاری ندوی[٧٦]، کوثر نیازی[٧٧]، حکیم محمد سعید[٧٨]، میر واعظ محمد فاروق[٧٩]، محمد فاروق نعمانی[٨٠] اور نیاز احمد بیگ[٨١] وغیرہ کے شخصی خاکوں سے صفحاتِ معارف کو مزیّن کیا اور ان شخصیات کے امتیازی پہلوؤں پر اپنے تأثرات پیش کئے، یہاں حکیم محمد سعید سے متعلق تأثرات میں سے ایک اقتباس نقل کیا جارہا ہے، حکیم محمد سعید کے ساتھ دشمنانِ انسانیت نے جو کچھ کیا اسے تاریخ میں ہمیشہ سیاہ حروف سے رقم کیا جاتا رہے گا، اس بربریت کو سوچ کر ذہن مرتعش ہو جاتا ہے، آپ یہ شہادت اور یہ رتبۂ بلند ناقابل فراموش ہے، خاکسار کی ملاقاتیں آپ سے رہی ہیں، انہیں سب کچھ کہنے کے بجائے صرف فرشتہ صفت انسان کہنے پر اکتفا کروں گا، مولانا ضیاء الدین اصلاحی رقم طراز ہیں:۔

> ''حکیم صاحب کی طبیعت میں بڑی بوقلمونی اور عجیب رنگارنگی تھی، ایک طرف وہ تو احیائے طب کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھے اور اس کے لئے ملک ملک کی خاک چھانتے رہے، مگر ان کی یہ جہاں گردی اور بادیہ پیمائی اور ہمہ تن مشغولیت قلم وقرطاس اور تصنیف وتالیف میں مانع نہ بنتی، انہوں نے سینکڑوں کتابیں لکھیں جن میں کئی سفرنامے ہیں، ۱۹۳۶ء ہی سے روزنامچہ لکھنے کا معمول تھا، ہمدرد صحت کی ادارت کی ذمہ واری اس پر مستزاد، نونہال کی ادارت ان کے معتمد جناب مسعود احمد برکاتی کے سپرد تھی مگر اس کے صفحات پر بھی وہ موجود ہوتے، ہر شمارے میں پاکستان کے نونہالوں کو جاگنے اور جگانے کی وہی تلقین بھی وہی کرتے تھے، افسوس ہے کہ ایسے جاگنے اور جگانے والے کو بھی بے رحموں نے

ہمیشہ کے لئے سلا دیا"۔[۸۲]

الاصلاح:

مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی شخصیت فضلاء مدرسۃ الاصلاح کے مابین سنگِ میل کی حامل ہے، تاریخ مدرسۃ الاصلاح، فکرِ فراہی، مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی قرآنی اور علمی خدمات پر انہیں دسترس حاصل تھی، جس کے ادراک کی جھلک ان کے کاموں میں موجود ہے، اسی سلسلہ کی آپ کی قابلِ قدر تصنیف "الاصلاح : ایک تعارف" ہے "الاصلاح" دراصل وہ مجلّہ ہے، جو ۱۹۳۶ء میں مولانا امین اصلاحی کی زیر ادارت منظرِ عام پر آیا تھا، جس کا اختصاص قرآن کریم تھا، اس کے دو امتیاز تھے، ایک تو مولانا حمید الدین فراہی کی قرآنی تحقیقات شائع کی جاتی تھیں اور دوسرے قرآنیات کے بہت سے توضیح طلب گوشوں پر اظہار خیال کیا جاتا تھا، ہندوستان میں شاید اس معیار کا قرآنی مجلّہ اب تک منظر عام پر نہیں آیا، لیکن افسوس کہ ۱۹۳۹ء کے بعد قرآنی دنیا اس رسالے سے محروم ہوگئی، اس حادثہ کو مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے "شعلۂ مستعجل" سے یاد کیا ہے، مجلّہ "الاصلاح" کی اہمیت کا اعتراف مولانا نے یوں کیا ہے۔

> "الاصلاح" اپنی نوعیت کا ایک منفرد رسالہ تھا "الندوہ" (مولانا شبلی) کے علاوہ مدارس کی تاریخ میں اس پایہ و معیار کا کوئی رسالہ نہیں نکلا، بہت قلیل مدت میں بھی وہ اپنے لازوال نقوش چھوڑ گیا، اس نے کتاب الٰہی، دینِ خداوندی اور علم و دین کی خدمت اور مسلمانوں کی رہنمائی کا بے نظیر کام انجام دیا مگر حیرت ہوتی ہے کہ معمولی معمولی رسالوں کا جو سال بھر تک

شائع نہیں ہوئے، ڈنکا پیٹا جا رہا ہے اور اردو کے ادبی رسائل وجرائد میں ان پر طویل مضامین نکل رہے ہیں، مگر بہت سے بیش قیمت رسالوں کو جنہوں نے علم ومذہب اور زبان وادب کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں بھلا دیا گیا ہے اور اب لوگوں کو ان کے نام بھی نہیں معلوم ہیں، ''الاصلاح'' بھی ان ہی فراموش شدہ رسالوں میں ہے''۔[۸۳]

مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے ۸۳ صفحات میں اس مجلّہ کا تعارف پیش کیا ہے، بڑی گہرائی سے اس کی مختلف خصوصیات کا جائزہ لیا ہے، اس کتاب کی سب سے اہم چیز اس کے حواشی ہیں، جس میں ''رجال الاصلاح'' کا جامع تعارف پیش کیا گیا ہے، یہ معلومات مولانا نے بڑی محنت سے جمع کی ہیں، علمی دنیا خصوصاً متوسلین فکرِ فراہی کے لئے حدّ درجہ مفید ومعاون ہے، بعض چیزیں تو ایسی ہیں جن پر مولانا ہی اظہار خیال کر سکتے تھے، ان حواشی کے سلسلے میں راقم الحروف بھی کچھ کہنے کی جسارت کرے گا۔

حاشیہ نمبر:۱۔حاجی حافظ ڈاکٹر حفیظ اللہ اور مولوی حفیظ احمد خاں کے متعلق ہے، ڈاکٹر حفیظ اللہ کے متعلق پروفیسر ظفر الاسلام کا مقالہ ''ڈاکٹر حفیظ اللہ اور مولانا امین احسن اصلاحی'' ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جو ''علوم القرآن'' میں شائع ہوا ہے (دیکھئے: علوم القرآن، جلد ۱۳۔۱۵، جنوری ۱۹۹۸ء۔ دسمبر ۲۰۰۰ء، شعبان ۱۴۱۸ھ، رمضان ۱۴۲۱ھ، ص: ۵۳۰۔۵۰۵)

حواشی نمبر:۱۸۔ میں مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کا تعارف پیش کیا گیا ہے، مولانا کی خدمات کے لئے ''حیاتِ نو'' کا خاص نمبر دیکھا جاسکتا

ہے(دیکھئے: مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی: شخصیت کے چند نمایاں پہلو، سلطان احمد اصلاحی ادارہ علم وادب، علی گڑھ مئی وجون ۱۹۹۶ء ،صفحات ۶۳، نیز دیکھئے: مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی، سید جلال الدین انصر عمری (زندگی نو، دہلی، جنوری ۱۹۹۱ء، ۱۳/۱ص:۲۔۸)

حاشیہ نمبر:۱۹۔ میں ڈاکٹر احمد غلوش (متوفی ۱۹۶۸ء) کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ڈاکٹر صاحب کا تعلق مصر سے تھا، وہ شراب نوشی کے حد درجہ مخالف تھے، آپ سماجی کارکن کی حیثیت سے مشہور تھے، تاحیات مسکرات کے خلاف ستیزہ کار رہے، وہ ایک قلم کار اور خطیب کی حیثیت سے بھی جانے جاتے تھے، انہیں انگریزی پر عبور حاصل تھا، اسی زبان میں دعوتِ اسلامی کے عنوان سے ایک کتاب ترتیب دی جس کے چھ ایڈیشن منظر عام پر آئے، عربی میں آپ کی کتاب "الخمر والحیاۃ" کے عنوان سے ہے، ۱۹۶۸ء میں قاہرہ کے اندر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

حاشیہ نمبر: ۲۰۔ میں مولانا اختر احسن اصلاحی کا تعارف شامل ہے، اس کے لئے دیکھئے: شیدائے قرآن، محمد عنایت اللہ اسد سبحانی، ادارہ احیاء دین، بلریا گنج، اعظم گڑھ، پہلی بار، جولائی ۱۹۸۱ء، دوسری بار، ۲۰۰۰ء، صفحات:۶۔۷۸۔

حاشیہ نمبر:۲۱۔ میں مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس سلسلے میں "جامعہ" کا اسلم نمبر (مارچ تا مئی ۱۹۸۲ء) ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جو پندرہ مقالات پر مشتمل ہے، اس کے صفحات ۱۸۴ ہیں۔مزید دیکھئے: مولانا محمد اسلم جیراجپوری: حیات وخدمات، ڈاکٹر ابوسفیان

اصلاحی، ارورا پرنٹرس، دہلی، مئی ۲۰۰۱ء (صفحات: ۱۴۰)۔ پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری نے اپنی کتاب ''کچھ یادیں، کچھ باتیں'' میں مولانا پر اظہار خیال کیا ہے، اس کے علاوہ ڈاکٹر شاہد نوخیز مولانا آزاد اردو نیشنل یونیورسٹی حیدر آباد نے بھی مولانا جیراجپوری پر ایک کتاب ترتیب دی ہے۔

حاشیہ نمبر:۲۲۔ میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کا تعارف کرایا گیا ہے، اس سلسلے میں دیکھئے: ماہنامہ ''الحسن'' اس کی اشاعت خاص (اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۸۷ء) جو سات سو سے اوپر صفحات پر مشتمل ہے، اسے مدیر مسئول محمد اکرم کاشمیری نے ترتیب دیا ہے۔ مزید دیکھئے: سیرت مولانا اشرف علی تھانوی، منشی عبدالرحمٰن خاں، فرید بکڈپو، نئی دہلی (بدون تاریخ) ۱/ ۵۶۰، ۲/ ۴۰۔ نیز دیکھئے: مولانا اشرف علی تھانوی: حیات اور کارنامے۔ ڈاکٹر عبدالجبار قاسمی، آر ورا پرنٹرس اینڈ کمپیوٹر سینٹر، دہلی اشاعت اول، مارچ ۲۰۰۳ء (صفحات: ۱۵۴)

حاشیہ نمبر:۲۴۔ میں مولانا اقبال احمد خاں سہیل پر روشنی ڈالی گئی ہے، اقبال سہیل پر رشید احمد صدیقی کے تأثرات نہایت مفید ہیں۔ مزید دیکھئے: اقبال سہیل کا فن، مرتبہ: ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، سن اشاعت اول ۲۰۰۷ء (صفحات: ۲۰۶)۔

حاشیہ نمبر: ۲۵۔ میں مولانا امین احسن اصلاحی کی شخصیت موضوع بحث ہے، اس سلسلے میں ''تدبر'' اور ''علوم القرآن'' کے اصلاحی نمبر مولانا کی زندگی اور خدمات پر دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں، (دیکھئے: علوم القرآن اصلاحی نمبر) جلد ۱۳۔ ۱۵ جنوری ۱۹۹۸ء، دسمبر ۲۰۰۰ء،

صفحات: ۵۸۹، نیز دیکھئے: تدبر (لاہور) مولانا امین احسن اصلاحی کی یاد میں (مرتبہ خالد مسعود) شمارہ نمبر ۶۰، اپریل ۱۹۹۸ء، صفحات: ۱۱۲، نیز دیکھئے: شمس الاسلام (بھیرہ سرگودھا، پاکستان) مدیر اعلیٰ: صاحبزادہ ابرار احمد، ۲/۲۷-۳ فروری، مارچ ۱۹۹۸ء، صفحات: ۸-۷۔

حاشیہ نمبر: ۲۷۔ میں مولانا فراہی پر تحریر کیا گیا ہے، اس سلسلے میں تین مراجع اہمیت کے حامل ہیں۔ دیکھئے: (۱) حیاتِ حمید، مرتبہ: عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی، مطبع معارف اعظم گڑھ، (بدون تاریخ) (صفحات: ۶۴)

(۲) ذکر فراہی، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، اعظم گڑھ، ۲۰۰۱ء (صفحات: ۸۴۰)

(۳) علامہ حمید الدین فراہی: حیات وافکار، دائرہ حمیدیہ، اعظم گڑھ ۱۹۹۲ء (صفحات: ۵۹۲)

حاشیہ نمبر: ۳۰۔ میں مولانا داؤد اکبر اصلاحی کی شخصیت زیر بحث ہے، جس میں مولانا کی اہم تصنیف ''مشکلات القرآن'' کا ذکر نہیں ہے۔

حاشیہ نمبر: ۳۲۔ میں سید سلیمان ندوی کا ذکر ہے، اس سلسلے میں چار مراجع اہم ہیں دیکھئے: حیات سلیمان، شاہ معین الدین ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء، صفحات ۷۲۹، نیز دیکھئے: علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ، ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء، بار اول، صفحات: ۴۳۶، نیز دیکھئے: سید سلیمان ندوی، مرتبہ: پروفیسر عتیق احمد صدیقی شعبۂ اردو، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، طبع اول، ۱۹۸۵ء، صفحات: ۱۴۳،

نیز دیکھئے سید سلیمان ندوی: حیات اور ادبی کارنامے، ڈاکٹر سید محمد ہاشم، شعبۂ اردو، اے ایم یو۔علی گڑھ، اشاعت اول ۱۹۹۵ء (صفحات:۴۲۴)

حاشیہ نمبر:۳۵۔ میں مسٹر عبدالحکیم کا ذکر ہے، محترم عبدالحکیم صاحب نے مختلف رسالوں مثلاً زندگی، دعوت اور ذکریٰ وغیرہ میں متعدد مقالات تحریر کئے، دوران ملازمت وہ شہر اعظم گڑھ میں درسِ قرآن دیا کرتے تھے، خاکسار نے آپ کے بیٹے جناب ڈاکٹر جمال احمد (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سے درخواست کی کہ وہ اپنے والدمحترم کے مقالات ترتیب دے کر کتابی صورت میں شائع کردیں، انہوں نے کافی چیزیں تلاش کرلی ہیں، کاش کہ وہ اس مبارک فریضہ کوانجام دے سکتے۔

حاشیہ نمبر:۳۶۔ میں مولانا عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی جامعی کا ذکر کیا گیا ہے، اس میں اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ مولانا ایک صاحبِ قلم ہیں، ڈاکٹر محمد خلیل الرحمٰن اعظمی سے آپ کے گہرے مراسم رہے ہیں، آپ نے اپنے نام نامی آئے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی کے مکاتیب کو''مکتوباتِ خلیل'' کے نام سے ترتیب دیا، اس کے علاوہ مولانا اختر احسن اصلاحی کے مقالات کو''مباحث القرآن'' کے عنوان سے جمع کیا، مولانا عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی جامعی نے مجلّہ''الاصلاح'' کے علاوہ ہندوپاک کے مختلف مجلّات میں بیشمار مقالات اور تراجم شائع کئے، آپ کا وجود مدرسۃ الاصلاح اور فضلاءِ اصلاح کے لئے باعثِ سعادت تھا۔مولانا اصلاحی جامعی کی حیات وخدمات کے

لئے دیکھئے: نیر تاباں۔ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی۔ قرآنک ریسرچ سنٹر، کبیر کالونی علی گڑھ، طبع اول، اگست ۲۰۱۱ء، ص: ۹۵۔۱۰۸

حاشیہ نمبر: ۳۷۔ میں جناب عبداللطیف اعظمی کا ذکر ہے، اس حاشیہ میں جناب اعظمی صاحب کی ایک خاص علامت کا ذکر نہیں کیا گیا کہ آپ کا نہرو خاندان کی خدمات پر گہرا مطالعہ تھا، مولانا آزادؒ کو بھی دقتِ نظر سے پڑھا تھا، کانگریس کے زبردست مؤید تھے، مولانا امین احسن اصلاحی کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے، خاکسار سے کئی بار مولانا اصلاحیؒ نے جناب اعظمی صاحب کی خیریت دریافت کی، ہندوستان میں موجودہ چار مرحوم شخصیات کے متعلق بڑی تفصیل سے مولانا اصلاحی دریافت کیا کرتے تھے، وہ اس طرح ہیں مولانا نجم الدین اصلاحیؒ، مولانا بدرالدین اصلاحیؒ، عبداللطیف اعظمی اور مولانا ابواللیث اصلاحی کے احوال بڑی بے چینی سے معلوم کیا کرتے تھے، یہ ذکر یہاں مناسب ہوگا کہ ڈاکٹر عرفان احمد نے عبداللطیف اعظمی کے خطوط ترتیب دیئے ہیں۔

حاشیہ نمبر: ۴۰۔ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا ذکر ہے، اس سلسلے میں یہ وضاحت مناسب ہوگی کہ آپ کے احوال وکوائف کے لئے آپ کی ''آپ بیتی'' اور علمی خدمات کے لئے مولانا علی میاں ندوی کی ''پرانے چراغ'' کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر جناب سعید الظفر چغتائی اپنے نام آئے ہوئے مولانا کے خطوط ترتیب دے رہے، اس کے علاوہ مولانا کے خطوط ''مکتوباتِ ماجدی'' کے عنوان سے محترم ہاشم قدوائی نے پانچ

جلدوں میں ترتیب دیئے۔

حاشیہ نمبر:۴۶۔ میں استاذ محمد فرید ابو حدید (۱۹۶۸ء۔۱۸۹۳ء) کا ذکر ہے، لیکن مولانا نے کوئی معلومات نہیں پیش کی ہے، محمد فرید ابو حدید ایک ادیب اور مصری استاذ ہیں، قاہرہ کی ''المجمع اللغوی'' کے ممبر تھے، دمنہور اور دسونس میں آپ کی نشو ونما ہوئی، ''مدرسۃ المعلمین العلیاء'' کے شعبۂ ادب سے ۱۹۱۴ء میں فراغت حاصل کی، اس کے بعد ''مدرسۃ الحقوق الملکیہ Evening Teaching سے وابستہ ہوئے، مصر، لیبیا اور مغرب میں تعلیمی شعبوں سے وابستہ رہے، مطبوعات کے انچارج بنائے گئے، اس کے بعد ''دارالکتب'' کے سکریٹری متعین ہوئے. اور ''معہد التربیہ'' کے پرنسپل منتخب ہوئے، وزارتِ تعلیم میں انہیں ادبی مشیر کا اعزاز عطا کیا گیا، وہ آزاد شاعری کے نقیب تھے، وہ تقریباً تیس کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں سے اکثر کا تعلق داستان سے ہے۔ آپ کی کچھ تصانیف کے عناوین اس طرح ہیں:

(۱) صحائف من حیا
(۲) مقتل سیدنا عثمان
(۳) سیرۃ عمر مکرم
(۴) الملک الضلیل
(۵) المهلهل
(۶) زنوبیا
(۷) عنترہ

(۸) سهراب ورستم

(۹) أزهار الشوک

(۱۰) ابنة الملوک

(۱۱) دعائم السلام

(۱۲) صلاح الدین الایوبی وعصره

(۱۳) فتح العرب لمصر

(۱۴) عیدالشیطٰن

(۱۵) أمتنا العربیة

(۱۶) تاریخ العصور الوسطیٰ وغیرہ

ڈاکٹر منصور ابراہیم الحازمی نے آپ کی حیات وخدمات کا جائزہ لینے کے لئے ایک کتاب ''محمد فرید ابو حلید کاتب الروایة'' کے عنوان سے ترتیب دیا ہے، محمد فرید کا قاہرہ میں انتقال ہوا، (دیکھئے: الاعلام، خیرالدین الزرکلی، دارالعلم للملایین، بیروت، لبنان، الطبعة التاسعة، نومبر ۱۹۹۰ء، ۶/۳۲۹)

حاشیہ نمبر: ۴۷۔ میں مولوی نیاز احمد صدیقی کا ذکر کیا گیا ہے، شبلی کالج کے ایک قدیم طالب علم جناب شاہ محی الحق فاروقی نے ان کی شخصیت کا ایک حقیقی روپ اس طرح پیش کیا ہے، اپنی کتاب ''بیدار دل لوگ'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یہ تھے وہ حالات جن میں شبلی جارج اسکول کو ایک ہیڈ ماسٹر کی ضرورت تھی، کچھ دنوں عارضی انتظامات سے کام چلتا رہا، ایک معزز استاذ اور اسکول کے نائب صدر مدرس

نیاز احمد صدیقی کو جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، ہیڈ ماسٹر بننے کی پیش کش کی گئی، نیاز صاحب اتنے مہذب اور نیک انسان تھے کہ انہیں عارضی ہیڈ ماسٹر بننا بھی گوارہ نہ تھا، غالباً انہیں کی تحریک پر ایک قریبی شہر فیض آباد کے ایک اسکول کے ایک استاذ بشیر احمد صدیقی صاحب کو دعوت دی گئی اور انہوں نے اس چیلنج کو قبول کرلیا" (دیکھئے: بیدار دل لوگ شاہ محی الحق فاروقی، اکاڈمی بازیافت، پہلی اشاعت، مئی ۲۰۰۳ء، ص:۲۹)

حاشیہ نمبر:۵۴۔ میں فراق گورکھپوری کا بڑا جامع تعارف پیش کیا گیا ہے، یہاں یہ ذکر اہلِ علم وادب کے لئے یقیناً نفع بخش ہوگا کہ فراق گورکھپوری کی تنقیدی بصیرت اور شعری عظمت تک رسائی کے باب میں "اردو ادب" کا فراق نمبر اہمیت کا حامل ہے، دیکھئے: اردو ادب (فراق نمبر) ایڈیٹر خلیق انجم، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی، ۸۴-1983ء شمارہ نمبر (۴) شمارہ نمبر (۱) و (۲)، صفحات: ۲۰۸، اس کے علاوہ "نیا دور" کا فراق دوجلدوں میں اہمیت کا حامل ہے۔

مولانا کے یہ حواشی رجال الاصلاح کے کوائفِ زندگی اور علمی خدمات کے باب میں نہایت قیمتی ہیں، لیکن چونکہ علم وتحقیق کا سلسلہ رکتا نہیں بلکہ مستقلاً آگے کی طرف رواں رہتا ہے، اسی کے پیش نظر یہ اضافہ بھی ہوا ہے، اس اضافے سے معلومات اور مصادر ومراجع کا دائرہ مزید وسیع ہوا ہے، مجھے امید ہے کہ قارئین اسے قدر کی نظروں سے دیکھیں گے۔

مولانا ابوالکلام آزاد:

مولانا ابوالکلام آزاد کا علامہ شبلی اور دارالمصنفین نیز اربابِ دار المصنفین سے گہرا ربط رہا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ آزاد کے فکر و فلسفہ پر علامہ شبلی کا اثر رہا ہے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا، یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا کی تربیت میں علاّمہ کا خاصّا حصّہ رہا ہے، اسی تربیت کا ایک مظہر یوں نمایاں ہوا کہ علامہ نے انتقال سے چار روز قبل مولانا آزاد سے اپنی خواہش کا مندرجہ کلمات میں اظہار کیا:

''اگر آپ اس اثناء میں مل جاتے تو سیرت نبوی کی اسکیم کا
کچھ انتظام ہوجاتا ورنہ سب کارروائی بے کار ہوجائے،
سید سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلان سمجھا دیتا۔''[8]

مذکورہ تحریر سے پوری طرح واضح ہے کہ علامہ کو ان کے فکر و فلسفہ پر کس قدر اعتبار تھا، اسی اعتبار کو ملحوظ رکھتے ہوئے مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے مولانا آزاد کے فکر و فلسفہ کی ترویج و تشہیر کو اپنا فریضۂ اوّلین تصوّر کیا، یہ کتاب اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ مولانا اصلاحی نے مولانا کی کثیر الجہات شخصیت کا بڑا ابھرپور مطالعہ کیا تھا، خصوصاً ''ترجمان القرآن'' پر مولانا کی اچھی نظر تھی، مولانا نے مولانا آزاد کی مختلف کاوشوں کو اصلاً دو وجوہ کی بناء پر موضوعِ بحث بنایا، ایک تو خود وہ مولانا کے شیدائی تھے اور دوسرے مولانا آزاد دارالمصنفین کے طرفداروں میں تھے، مولانا نے اپنے مقدمہ میں بجا لکھا ہے:

''دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی سے مولانا آزاد کا تعلق اظہر من
الشمس ہے وہ مولانا شبلی کے عزیز دوست اور تربیت یافتہ
تھے، مولانا شبلی نے الندوہ کی ادارت میں ان کو اپنا شریک
بنایا، سیرت نبوی کی تالیف اور دارالمصنفین کی تاسیس میں ان
سے مشورہ وتبادلۂ خیال کیا، سیرت کے بعض حصّے پہلی مرتبہ

الہلال میں شائع ہوئے اور اسی میں دارالمصنفین کی اسکیم بھی شائع ہوئی۔

مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی سے بھی مولانا آزاد کا خاص تعلق تھا، یہ دونوں حضرات الہلال کی ادارت سے وابستہ رہے، مولانا کی کتاب ''جامع الشواہد'' پہلی دفعہ دارالمصنفین سے چھپی، ان کو اس ادارہ سے جو غیر معمولی تعلق واخلاص تھا اس کا اندازہ ان کے مکاتیب کے ان اقتباسات سے ہوگا[۸۵]''

مذکورہ سطور کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی یہ کتاب اسی سلسلۂ زریں کی ایک کڑی ہے، یایوں کہئے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو اس انداز سے خراج عقیدت پیش کیا گیا کہ ان کی مختلف الجہات شخصیت ابھر کر سامنے آگئی، اس کتاب میں مولانا آزاد کے تین پہلوؤں ترجمان القرآن (سورہ فاتحہ) صحافت اور سیاسی خدمات کو موضوع بحث بنا یا گیا ہے، پہلے حصہ میں مولانا اصلاحی نے سورہ فاتحہ کا خلاصہ پیش کیا ہے، سورہ فاتحہ کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' کلیدی حیثیت کی حامل ہے، اس میں بہت سے دیگر علوم کا سورہ فاتحہ کی روشنی میں مولانا آزاد نے جائزہ پیش کیا ہے سورہ فاتحہ کی تفسیر سے مولانا آزاد کی قرآنی اور علمی مقام کا تعین اس کتاب میں کیا گیا ہے، مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

''گویا یہ قرآن مجید کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، اس لئے مصنف نے ضروری اور مناسب خیال کیا کہ قرآن مجید کے مقدمہ ودیباچہ کو اچھی طرح قارئین کے ذہن نشین کرادیں تاکہ

اگر وہ پورا قرآن نہ بھی پڑھ سکیں تو اس کے دیباچہ کو پڑھ کر اس کی اصلی روح اور بنیادی تعلیم سے بخوبی واقف ہو جائیں، سورہ فاتحہ کی یہ تفسیر گوناگوں اہم اور مفید مطالب ومعارف پر بھی مشتمل ہے، لیکن یہاں نہ تو ان تمام خصوصیات وخوبیوں کی نشان دہی ممکن ہے اور نہ ان حقائق ودقائق اور اسرار ونکات کا احاطہ ہی کیا جا سکتا ہے جو مولانا کے گہر بار قلم نے اس سورہ کی تفسیر میں جا بجا قلم بند کئے ہیں[۸۶]"۔

پرفیسر الطاف احمد اعظمی نے مولانا آزاد کی تفسیر سورہ فاتحہ کا ایک جائزہ پیش کیا ہے، آپ کا نقطۂ نظر مولانا اصلاحی کے نقطۂ نظر سے خاصا مختلف ہے۔ پروفیسر اعظمی رقم طراز ہیں:

"ہندی مفسرین میں مولانا فراہی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اس سورہ کی شرح وتفسیر بڑی خوبی اور باریک بینی کے ساتھ کی ہے، فراہی کی تفسیر کا سب سے اہم حصہ وہ ہے، جس میں انہوں نے سورہ فاتحہ کا انجیل کی دعا سے موازنہ کر کے سورہ فاتحہ کی عظمت وفضیلت کو واضح کیا ہے، مولانا آزاد نے جو تفسیر لکھی ہے وہ بڑی مفصل اور مدلل ہے لیکن اس میں ایک نقص بھی ہے وہ یہ ہے کہ مباحث کے دائرے کو انہوں نے غیر ضروری حد تک وسیع کر دیا ہے اور اس میں بعض ایسے مباحث داخل کر دیئے ہیں جن کا سورہ فاتحہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے میری مراد تصور اللہ کے فلسفیانہ مباحث

سے ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ تفسیر اپنی جگہ قابلِ قدر ہوتے
ہوئے بھی عام مسلمانوں کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں
ہے"۔ ۸۷ے

اس کتاب کا دوسرا بنیادی وصف مولانا آزاد کی صحافت کا تحلیل و تجزیہ ہے، لسان الصدق، الہلال اور البلاغ کے علاوہ مولانا کی صحافت کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، خاکسار کے ناقص علم کے مطابق مولانا کی صحافت پر اتنا وقیع مضمون شاید ہی ملے، اس میں بعض گوشوں کو اٹھایا گیا ہے جو عموماً نظروں سے مخفی تھے، مثلاً یہ بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ "الجامعة" کے نام سے ایک عربی رسالہ کلکتہ سے جاری کیا تھا، بہر کیف ہندوستان کی اردو صحافت کو ایک معتبر رخ دینے میں مولانا آزاد کا گراں قدر حصہ ہے۔ جس کا اعتراف مولانا نے اس طرح کیا ہے۔

"صحافت کو مولانا نے بڑی عظمت، عزت اور وقار عطا
کیا، ان کے اس فن کی جانب متوجہ ہونے سے اردو صحافت
میں چار چاند لگ گئے اور وہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی
صحافت کے ہم پایہ اور علم و ادب کی صف میں آ کھڑی ہوئی،
مولانا کی صحافتی گھن گھرج سے غیر ملکی جابرانہ و مستبدانہ قوتوں
کے ہوش و حواس بجانہ رہے اور ملک کے متعصب اور تنگ
نظر، فرقہ پرستوں کے مکر و فریب، شرانگیزی و فتنہ سامانی کی
دھجیاں بکھر گئیں، مظلوموں، بے کسوں اور انصاف و حریت
کے شیدائیوں کی تمنائیں بر آئیں، غرض مولانا نے قومی اور
بین الاقوامی سیاسی شعور دے کر سیاست، معاشرت اور ادب
میں ایک انقلاب برپا کر دیا"۔ ۸۸ے

اس کتاب کا تیسرا موضوع یہ ہے کہ مولانا آزاد کی قومی وسیاسی جدوجہد اور اتحاد ویکجہتی کے لئے ان کی مساعی کی کسی قدر تفصیل سے بیان کی گئی ہیں، ان مباحث سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد کی تعمیر وتاسیس میں مولانا کا کتنا اہم رول رہا ہے، لیکن آج کی مسموم ذہنیت کو یہ تمام خوبیاں نظر نہیں آتی ہیں اور ان کی مسیحائی پر پردہ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے، مولانا نے ہندوستان اور امتِ مسلمہ کے لئے وہ کارنامے انجام دیئے جس کی شہادت تا قیامت تاریخ کے صفحات بیان کرتے رہیں گے، مولانا اصلاحی کے جذبات کی ترجمانی کچھ اس طرح کی جا سکتی ہے کہ:

الہلال کے ذریعہ مولانا نے انقلاب وآزادی کا جو پرشور نعرہ بلند کیا تھا اس کی گونج ہندوستان کے باہر بھی سنائی دینے لگی، اس کے نتیجے میں پوری اسلامی دنیا کی قیادت سنبھالنے کی انہیں دعوت ملی۔[۸۹]

مولانا ضیاء الدین اصلاحی کہ یہ کتاب مولانا آزاد کے علمی کارناموں اور سیاسی ومعاشرتی خدمات کی تفہیم وتفسیر میں حددرجہ مدومعاون ہے، سورہ فاتحہ پر مولانا کی گفتگو نہایت جامع ہے، اسی طرح صحافت کا بڑا تسلی بخش جائزہ پیش کیا گیا ہے، لیکن تیسرا حصہ خاصا کمزور ہے، مولانا نے اس کتاب کی ترتیب میں بعض اہم اردو مراجع سے استفادہ نہیں کیا ہے، اسی طرح مولانا کی شخصیت پر بہت کچھ انگریزی میں تحریر کیا گیا ہے، لیکن اس کتاب میں انگریزی مراجع سے بالکل ہی استفادہ نہیں کیا گیا ہے۔

☆☆☆

حواشی

۱۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی، ھند، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص: ۵۲۶-۵۲۳

۲۔ مولانا اختر احسن اصلاحی کی حیات وخدمات کے لئے دیکھئے: شیدائے قرآن، محمد عنایت اللہ سبحانی، مکتبہ ذکریٰ، رامپور، یوپی، پہلی بار، جولائی، ۱۹۸۱، (صفحات: ۱۱۲)

۳۔ مولانا امین احسن اصلاحی کی حیات وخدمات کے لئے دیکھئے: علوم القرآن (مولانا امین احسن اصلاحی نمبر) جنوری ۱۹۹۸ء، دسمبر، ۲۰۰۰ء، (شعبان، ۱۴۱۸ھ/ رمضان، ۱۴۲۱ھ) سرسید نگر، علی گڑھ، یوپی (صفحات: ۵۹۸)

۴۔ مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کی حیات وخدمات کے لئے دیکھئے: مولانا سلطان احمد اصلاحی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی: شخصیت کے چند نمایاں پہلو، ادارہ علم وادب، علی گڑھ مئی وجون ۱۹۹۶ء (صفحات: ۶۳)

۵۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: مولانا صدرالدین اصلاحی: حیات و خدمات (ناشر، انجمن طلبۂ قدیم مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی، الھند) مئی، ۲۰۰۷، (صفحات: ۵۰۴)

۶۔ ایضاح القرآن، چودہ قرآنی مقالات پر مشتمل ہے، یہ کتاب فکر فراہی کی ممثل وترجمان ہے، یہ ۲۸۸ صفحات کا احاطہ کرتی ہے۔

۷۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: قرآن مجید کے بعض اسالیب (ایضاح

القرآن، ضیاء الدین اصلاحی، یونائٹیڈ بک کارپوریشن، کراچی، پاکستان، بار اول، (بدون تاریخ) ص: ۵-۲۸

۸۔ ایضاً ص: ۵-۲۹

۹۔ ایضاح القرآن، ص: ۲۸۹

۱۰۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: ایضاح القرآن، ص: ۱۲۷-۱۳۵

۱۱۔ ایضاح القرآن، ص: ۱۴۵

۱۲۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: ایضاح القرآن، ص: ۱۴۶-۱۶۶

۱۳۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: ایضاح القرآن، ص: ۱۶۷-۱۸۴

۱۴۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، مئی ۱۹۸۹ء، ۱۴۳/۵، ص: ۳۷۴-۳۸۹

۱۵۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: ایضاح القرآن، ص: ۵۰-۷۵

۱۶۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: ایضاح القرآن، ص: ۱۰۴-۱۱۳

۱۷۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: ایضاح القرآن، ص: ۱۸۵-۲۰۵

۱۸۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: ایضاح القرآن، ص: ۱۱۴-۱۲۳

۱۹۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: ایضاح القرآن، ص: ۷۶-۱۰۳

۲۰۔ دیکھئے معارف، اعظم گڑھ، نومبر، ۱۹۷۵ء، نومبر، دسمبر، ۱۹۷۶ء، جنوری وفروری، ۱۹۷۷ء، جون، جولائی، اگست، ۱۹۷۸ء، ۱۱۶/۵، ۲۲۵-۲۴۴، ۱۱۸/۵، ۳۴۸-۳۶۴، ۱۱۸/۶، ۴۲۲-۴۴۴، ۱۱۹/۲، ۱۰۹-۱۲۴، ۱۲۱/۶، ۴۰۵-۴۲۱، ۱۲۲/۱، ۵-۲۲، ۱۲۲/۲، ۸۵-۹۹

۲۱۔ دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، فروری ۱۹۹۰ء، ۱۴۵/۲، ص: ۸۵-۱۱۴

۲۲۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: ایضاح القرآن، ص: ۱۶۷-۱۸۴

۲۳۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: ایضاح القرآن، ص: ۲۰۶۔۲۴۸

۲۴۔ ماہنامہ معارف، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی الہند، جنوری، 1995، ۱۵۵/۱، ص: ۵۔۳۵

۲۵۔ ایضاح القرآن، ص: ۲۴۸

۲۶۔ حدیث کے تعلق سے مولانا اصلاحی کی ایک کتاب ''مبادئ تدبر حدیث'' ہے ایک دوسری تصنیف ''تدبر حدیث'' ہے جو شرحِ صحیح بخاری پر مشتمل ہے اور اسی عنوان سے دوسری جلد شرحِ مؤطا امام مالکؒ پر مبنی ہے

۲۷۔ ''تذکرۃ المحدثین'' تین جلدوں پر مشتمل، (۱/۴۳۰، ۱۹۶۸ء، ۲/۴۴۵، ۱۹۹۷ء، ۳/۴۱۲، ۱۹۹۰ء، پہلی بار، معارف پریس، اعظم گڑھ۔

۲۸۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: بزم رفتگان، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، پہلی بار، نومبر ۱۹۸۱ء (۱/۳۶۰)، بزم رفتگان، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، (بدون تاریخ) (۲/۲۹۱)

۲۹۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: آہ بدر کامل غروب ہوگیا: مولانا بدرالدین اصلاحی، معارف، اعظم گڑھ، یوپی، ۱۵۸/۱، جولائی ۱۹۹۶ء، ص: ۱۷۔۷۷

۳۰۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی انڈیا، مئی، ۱۹۹۸ء، ص: ۳۹۰

۳۱۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، فروری، ۱۹۸۷ء، ۲/۱۳۹، ص: ۱۵۴

۳۲۔ وضاحت کے لئے دیکھئے، معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، دسمبر، ۱۹۹۰ء، ۶/۱۴۶، ص: ۴۰۲۔۴۰۴

۳۳۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، جنوری، ۱۹۹۸ء، ۱۶۱/۱، ص: ۵۵۔۶۹

۳۴۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، دسمبر، ۱۹۹۸ء، ۱۶۲/۶، ص: ۴۶۷۔۴۶۹

۳۵۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، دسمبر، ۱۹۸۴ء، ۱۳۴/۶، ص: ۴۵۵۔۴۶۵ ۔

۳۶۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، جون، ۱۹۹۱ء، ۱۴۷/۶، ص: ۴۷۰۔۴۷۱

۳۷۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، جولائی، ۱۹۹۶/۷، ص: ۷۳۔۷۴

۳۸۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، اگست، ۱۹۹۴ء، ۱۵۴/۲، ص: ۱۰۹۔۱۳۷

۳۹۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، جنوری، ۲۰۰۰ء، ۱۶۵/۱، ص: ۷۷

۴۰۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، جنوری، ۱۹۹۴ء، ۱۵۳/۱، ص: ۷۰۔۶۹

۴۱۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، اگست، ۱۹۹۶ء، ۱۵۸/۲، ص: ۱۴۴۔۱۵۰

۴۲۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، نومبر، ۱۹۹۸ء، ۱۶۲/۵، ص: ۳۸۶۔۳۸۷

۴۳۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، مارچ،

۱۹۸۱ء، ۱۲۷/۳، ص: ۲۳۰۔۲۳۵

۴۴۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، نومبر، ۱۹۹۴ء، ۱۵۴/۵، ص: ۳۲۴

۴۵۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، مارچ، ۱۹۹۸ء، ۱۶۱/۳، ص: ۱۶۳۔۱۶۴

۴۶۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، فروری، ۲۰۰۰ء، ۱۶۴/۲، ص: ۸۲۔۹۴

۴۷۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، مئی، ۱۹۹۱ء، ۱۴۷/۵، ص: ۳۲۴

۴۸۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، مارچ، ۱۹۷۵ء، ۱۱۵/۳، ص: ۲۲۰۔۲۲۱

۴۹۔ وضاحت کے لئے دیکھئے، معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، دسمبر، ۱۹۹۹ء، ۱۶۴/۶، ص: ۴۷۲۔۴۷۳

۵۰۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، مارچ، ۱۹۹۷ء، ۱۵۹/۳، ص: ۱۶۴

۵۱۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، جنوری، ۱۹۹۴ء، ۱۵۳/۱، ص: ۶۸

۵۲۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، جنوری، ۲۰۰۰ء، ۱۶۵/۱، ص: ۷۴۔۷۶

۵۳۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ یوپی، انڈیا، نومبر، ۱۹۹۱ء، ۱۴۸/۵، ص: ۳۹۱۔۳۹۳

۵۴۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، مارچ، ۱۹۹۱ء، ۱۴۷/۳، ص: ۲۲۸۔۲۳۸

۵۵۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، نومبر، ۱۹۷۶ء، ۱۱۸/۵، ص: ۳۷۸۔۳۹۲

۵۶۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، اگست، ۱۹۸۳ء، ۱۳۲/۲، ص: ۲۸۲۔۲۸۴

۵۷۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، جون، ۱۹۹۷ء، ۱۵۹/۶، ص: ۴۷۰۔۴۷۸

۵۸۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، ستمبر، ۱۹۹۹ء، ۱۶۴/۳، ص: ۲۲۸

۵۹۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، معارف اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، مارچ ۱۹۸۱ء، ۱۲۷/۳، ص: ۲۳۴

۶۰۔ وضاحت کے لئے دیکھئے معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، جولائی، ۱۹۹۷ء، ۱۶۰/۱، ص: ۷۵

۶۱۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، فروری، ۱۹۶۶ء، ص: ۱۵۲۔۱۵۶

۶۲۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، اگست، ۲۰۰۰ء، ۱۶۶/۲، ص: ۱۴۴۔۱۴۹

۶۳۔ وضاحت کے لئے دیکھئے، معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، جنوری، ۱۹۹۷ء، ۱۵۹/۱، ص: ۴

۶۴۔ وضاحت کے لئے دیکھئے، معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، مارچ،

سنہ ۱۹۹۹ء، ۱۶۳/۳، ص: ۲۳۴-۲۳۶

۶۵۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، اپریل، سنہ ۱۹۹۵ء، ۱۵۵/۴، ص: ۳۱۱

۶۶۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، اکتوبر، سنہ ۲۰۰۰ء، ۱۶۶/۴، ص: ۲۴۴

۶۷۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، فروری، سنہ ۱۹۸۵ء، ۱۳۵/۲، ص: ۸۴

۶۸۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، مئی، سنہ ۱۹۹۱ء، ۱۴۷/۵، ص: ۳۲۴

۶۹۔ اردو کا سردار چلا گیا (علی سردار جعفری) معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، اگست سنہ ۲۰۰۰ء ۱۶۶/۲، ص: ۱۴۵

۷۰۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، جنوری، سنہ ۱۹۸۸ء، ۱۴۱/۱، ص: ۴

۷۱۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، فروری، سنہ ۱۹۹۶ء، ۱۵۷/۲، ۱۴۹-۱۵۲

۷۲۔ وضاحت کے لئے دیکھئے، معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، اپریل سنہ ۱۹۹۲ء، ۱۴۹/۱، ص: ۳۱۳-۳۱۹

۷۳۔ وضاحت کے لئے دیکھئے، معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، ستمبر، سنہ ۱۹۸۸ء، ۱۴۲/۳، ص: ۱۶۲-۱۶۴

۷۴۔ وضاحت کے لئے دیکھئے، معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، اگست، سنہ ۱۹۹۹ء، ص: ۸۲-۸۴

۷۵۔ وضاحت کے لئے دیکھئے، معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، دسمبر، ۱۹۸۸ء، ۱۴۲/۶، ص:۴۰۳۔۴۰۴

۷۶۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، جنوری، ۱۹۹۴ء، ۱۵۳/۱، ص:۶۸

۷۷۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، اپریل، ۱۹۹۴ء، ۱۵۳/۴، ص:۳۰۹۔۳۱۱

۷۸۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، نومبر، ۱۹۹۸ء، ۱۶۲/۵، ص:۳۸۷۔۳۹۷

۷۹۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، جولائی، ۱۹۹۰ء، ۱۴۶/۱، ص:۲۔۳

۸۰۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، مئی ۱۹۹۷ء، ۱۵۹/۵، ص:۳۲۳

۸۱۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: معارف اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا، فروری، ۱۹۹۸ء ، ۱۴۱/۲، ص:۸۴

۸۲۔ حکیم محمد سعید، مولانا ضیاءالدین اصلاحی، معارف، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا ،نومبر ۱۹۹۸ء ۱۶۲/۵، ص:۳۹۵

۸۳۔ ''الاصلاح'' ایک تعارف، ضیاء الدین اصلاحی، دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ، ۱۴۲۷ھ/۲۰۰۷ء، ص:۷

۸۴۔ مکاتیب شبلی (مرتبہ: مولانا سید سلیمان ندویؒ، طبع چہارم، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء، ۱/۲۸۹ (اس خط کے متعلق مرتب کا بیان ہے کہ یہ مولانا کا سب سے آخری پیغام ہے جو وفات سے چارروز قبل تحریر

کیا گیا)

۸۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد: مذہبی افکار، صحافت، قومی جدوجہد، ضیاء الدین اصلاحی، معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، فروری، ۱۹۹۸ء، ص:۵

۸۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد: مذہبی افکار، صحافت قومی جدوجہد، ص:۳

۸۷۔ سورہ فاتحہ: ایک تحقیقی مطالعہ، الطاف احمد اعظمی (علیگ) ادارہ تحقیقات واشاعت علوم قرآن، جونپور، باراول، ۱۹۸۷ء، ص:۵

۸۸۔ مولانا ابوالکلام آزاد: مذہبی افکار، صحافت، قومی جدوجہد، ص:۱۶۴

۸۹۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: مولانا ابوالکلام آزاد: مذہبی افکار، صحافت قومی جدوجہد، ص:۲۳۸

☆☆☆

مولانا ابوالکلام آزاد: تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی

مولانا آزاد نے جن اہلِ علم کے اثرات قبول کئے ان میں سب سے ممتاز شخصیت علاّمہ شبلی نعمانی کی تھی، آپ کی علمی ذہانت وفکری فطانت کے پیشِ نظر علامہ آپ کی ذہنی اور فکری تربیت کے خواہاں تھے، اسی نقطۂ نظر کی بنیاد پر انہیں ''الندوہ'' کی ادارت سے وابستہ کیا، مولانا کی صحافت کی قلمی اور فکری معاونت میں علامہ اوران کے تلامذہ کا اہم رول رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ علاّمہ کے لگائے ہوئے باغ ''دارالمصنفین'' سے مولانا کے گہرے مراسم رہے اور مولانا آزاد سے علاّمہ کے قلبی لگاؤ اور جذباتی تعلق پر مندرجہ سطور دال ہیں:

''ان باتوں سے کام نہیں چلتا، اگر آپ اس موقع پر نہ آئے تو میں قیامت تک کلکتہ نہ آؤں گا بلکہ بعد قیامت بھی، میرے برابر کا کمرہ بالکل خالی، اور آپ کے لئے محفوظ ہے، اکثر احباب آرہے ہیں اور آچکے ہیں۔

دیر ویران سہی کعبہ مرا آباد رہے
یعنی مؤمن ہوں، چلا جاؤں گا میں، یاد رہے

شبلی

۲۱ دسمبر ۱۹۱۰ء''[۱]

جس طرح مولانا آزاد سے علاّمہ کا قلبی لگاؤ تھا اسی طرح فکری وابستگی

بھی کم نہ تھی، چنانچہ سیرت کے نامکمل کاموں کے باب میں جہاں اپنے دیگر تلامذہ پر آپ کی نگاہ ٹکتی تھی، اسی طرح مولانا آزاد کے اندر اتنی صلاحیت محسوس کرتے تھے کہ وہ بھی بخوبی اس ادھورے کام کی تکمیل فرما سکتے تھے، علامہ فرماتے ہیں:

"اگر آپ اس اثناء میں مل جاتے تو سیرتِ نبوی کی اسکیم کا کچھ انتظام ہو جاتا، ورنہ سب کارروائی بے کار ہو جائے گی سید سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلان سمجھا دیتا"۔[۲]

علامہ کے ساتھ ساتھ مولانا حمید الدین فراہی کے قرآنی اثرات کو بھی مولانا آزاد نے قبول کیا، جس کی طرف سید صاحب نے اس طرح اشارہ کیا ہے:

"۱۹۰۵ء میں" مولانا شبلی سے بمبئی میں ملے اور یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی کہ ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا مولانا شبلی مرحوم ان کو اپنے ساتھ ندوہ لائے اور ایک زمانہ تک ان کو اپنے پاس ندوہ میں رکھا، وہ ان کی خلوت وجلوت کی علمی صحبتوں میں شریک رہتے اور اپنی مستثنیٰ فطری صلاحیتوں کی بدولت ہر روز آگے بڑھتے جاتے تھے، یہیں انہوں نے مولانا حمید الدین صاحب کے ساتھ کچھ دن بسر کیے، جن کو قرآن پاک کے ساتھ عشقِ کامل تھا اور اس مشق کا اثر صحبت کی تاثیر سے مولانا ابوالکلام میں سرایت کر گیا اور یہی رنگ تھا جو نکھر کر ہلال میں نظر آیا"۔[۳]

مذکورہ سطور سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ مولانا آزاد کا علامہ شبلی نعمانی، مولانا حمید الدین فراہی اور دارالمصنفین سے کس طرح کا تعلق تھا، چنانچہ تقسیم کے بعد جب دارالمصنفین پر نازک گھڑی آن پڑی تو مولانا نے اپنی

وزارتِ تعلیم سے اسے ساٹھ ہزار کی خطیر رقم دلوائی۔ جس کی طرف مولانا شاہ معین الدین ندوی نے اپنی ماتمی تحریر میں اشارہ کیا ہے کہ ''ابھی چند سال ہوئے جب دارالمصنفین سخت مالی مشکلات میں مبتلا ہو گیا تھا اور اس کے چلنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، مولانا ہی کی امداد و دستگیری سے اس کو دوبارہ زندگی ملی اس کی امداد واعانت برابر ان کے پیش نظر رہتی تھی اور جب بھی اس کا کوئی موقع آتا تھا تو دار المصنفین کو نہ بھولتے تھے۔ اس وقت بھی یہ مسئلہ ان کے سامنے تھا، ابھی ۱۷/فروری کو راقم الحروف ان سے ملا تھا حسب معمول بڑی شفقت سے پیش آئے، دارالمصنفین کے حالات پوچھتے رہے۔''[۴]

ماضی کے انہی تابندہ نقوش کی بنیاد پر وقتاً فوقتاً تجدید وفا کے مدِ نظر مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا آزاد کے فکری پہلوؤں کو موضوعِ بحث بناتے رہے اور ان مباحث کو عاشقِ آزاد جناب محمد امین مسعود صدیقی (لکھنؤ) کے اصرار پر ''مولانا ابوالکلام آزاد'' کے عنوان سے دارالمصنفین نے شائع کیا، یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے، ایک حصّہ میں سورہ فاتحہ کی تفسیری خصوصیات بیان کی گئی ہیں، دوسرے حصّہ میں مولانا کی صحافتی خدمات پیش کی گئی ہیں اور تیسرے حصّہ میں مولانا کی قومی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے،، مجموعی اعتبار سے مولانا کے تفسیری، فکری اور صحافتی عوامل ومراحل کے استقصاء میں یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے، لیکن یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ سورہ فاتحہ سے متعلق مضمون میں کسی طرح کا تحلیل وتجزیہ نہیں ہے، اس کے محاسن ونقائص کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے، ۱۶۰ صفحات میں صرف سورہ فاتحہ کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے، مولانا آزاد کے تفسیری آراء سے تائید یا تنقید سے اجتناب کیا گیا ہے، جبکہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا ایک ایسے مکتبِ فکر سے تعلق تھا جس کی شناخت صرف تفکر وتدبر ہے، وہ

قرآن کریم کو چشمِ بصیرت سے پڑھتا ہے، ہموار راستوں پر چلنے کے بجائے خود
اہلِ علم وخرد کے لئے راہیں ہموار کرتا ہے۔

مولانا آزاد کی تفسیر سورہ فاتحہ کے متعلق دو نقطۂ نظر ہیں، ایک طبقہ کا
خیال ہے کہ یہ تفسیر اپنی جامعیت و معنویت کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کی
حامل ہے۔۵ دوسرے مکتبِ فکر کی رائے یہ ہے کہ اس میں غیر معمولی طوالت
سے کام لیا گیا ہے۔۶ یہ تفسیر ۵۵۴ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں الٰہیات، مختلف
مذاہب کے خیالات، مفسرین کی آراء اور جدید سائنس وغیرہ کے نکات پیش
کرتے ہوئے تفسیرِ آیات کی گئی ہے، یہ حقیقت ہے کہ مولانا وسیع النظر تھے، لیکن
اپنی وسیع النظری کو مدلل اور مختصر انداز میں پیش کرنے سے ہمیشہ محروم رہے، مولانا
چونکہ بنیادی طور پر شاعر اور انشاء پرداز تھے، اس لئے تحقیقی موضوعات پر بھی قوتِ
انشاء پردازی سے باز نہ آسکے، قرآن کریم نے باریک سے باریک ترین بات کو
مدلل، مختصر اور دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے، اس لئے مفسرین کی ذمہ داری ہے
کہ توضیح آیات کریمہ میں اسی قرآنی فلسفہ کو اختیار کریں اس لئے اس پہلو سے
تفسیرِ سورہ فاتحہ کا جائزہ لیا جائے تو اس کمی کا مولانا کے یہاں شدت سے
احساس ہوتا ہے، اس تفسیر سے قرآن کریم کا ہدایتی پہلو متاثر ہوا ہے، قارئین
مولانا کی انتہائی درجہ کی تحقیقات واکتشافات میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔

اس تفسیر میں مختلف الفاظ کی توضیح وتشریح کی گئی ہے، مثلاً مولانا فرماتے
ہیں کہ الرحمٰن صفتِ عارضہ کے لئے اور الرحیم صفتِ قائمہ کے لئے آتے ہیں،
مزید رقم طراز ہیں کہ ''الرحمٰن'' کا مفہوم رحمت والی ذات کے ہیں اور ''الرحیم'' کا
مفہوم یہ ہے کہ وہ ایسی ذات ہے جس سے ہمیشہ رحمت کا ظہور ہوتا رہتا ہے اور
ہر وقت اور ہر لمحہ کائنات کی خلقت اس سے فیض یاب ہوتی رہتی ہے۔۷

یہاں ''الرحمٰن'' کی صحیح توضیح نہیں کی گئی ہے، اس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ اللہ کی رحمتیں بے حد وحساب ہیں، اس کی کثرت اور پہنائیوں کا اندازہ لگانا سعی لاحاصل ہے، نہ اس کی نعمتوں کو بیان اور نہ ہی قلم بند کیا جا سکتا ہے، اسی کو قرآن کریم نے اس انداز سے بیان کیا ہے:

"وإن تعدوا نعمة الله، لا تحصوها إن الله لغفور رحيم" (النمل: ۱۶/۱۸)

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو تم انہیں شمار نہیں کر سکتے ہو، یقیناً اللہ نہایت بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اسی مفہوم کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا گیا:

"ولو أنما فى الأرض من شجرة أقلام والبحر يمده من بعده سبعة أبحر ما نفدت كلمات الله" (لقمان: ۳۱/۲۷)

اور اگر سطح زمین کی تمام درختوں کے قلم ہوں اور سمندر دوات بن جائے، جسے مزید سات سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں (لکھنے سے) ختم نہ ہوں گی۔

''الرحیم'' کا مفہوم تو مولانا نے صحیح بتایا ہے کہ جس طرح اللہ کی نعمتیں ناقابلِ بیان اور ناقابلِ تصوّر ہیں، اسی طرح یہ نعمتیں غیر منقطع اور مسلسل ہیں، اس کا تسلسل ختم ہوتا ہی نہیں، یعنی یہ سلسلہ لامتناہی ہے، اسی طرح ''الرحمٰن'' کا مفہوم بے حد وحساب تو ''الرحیم'' کا مطلب لامتناہی ہے۔[۸]

مولانا آزاد نے ''اسراف'' اور ''تبذیر'' کے مابین فرقِ لطیف کو واضح کیا ہے، اسراف کا مفہوم یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا، مثلاً کھانے میں خرچ کرنا ایک ضرورت ہے، لیکن ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے، یعنی

ڈشز بیشمار ہوں، سو آدمیوں کو کھانا کھلانے کے لئے دو سو لوگوں کے کھانے بنالئے جائیں تو اسراف ہے، اور ''تبذیر'' کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جائز و مطلوب مقامات پر خرچ کرنے کے بجائے ناجائز و غیر مطلوب مقامات پر روپے لٹاتا ہے تو یہ تبذیر ہے، مثلاً یتامیٰ و مساکین کی دستگیری کے علی الرغم اپنے پیسوں کو پتھروں، قبور اور بڑے لوگوں کی تعظیم و تکریم میں بہاتا ہے تو یہ تبذیر ہے۔[9] مختصر یہ ہے کہ اسراف اور تبذیر میں مقدار اور محل کا فرق ہے۔

مولانا نے ''اعتداء'' اور ''عدوان'' کے متعلق فرمایا کہ دونوں ایک ہی مادہ سے ہیں اور دونوں کا مفہوم بھی حد سے گزر جانا ہے۔[10] یہاں وضاحت ضروری ہے کہ عربی زبان میں ہم معانی الفاظ نہیں ہوتے، مفاہیم ایک سطح پر مل سکتے ہیں لیکن معانی میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا، اس لئے اعتداء اور عدوان کا مفہوم ایک نہیں ہوسکتا، عدوان کا مفہوم دراصل معاملہ سے تجاوز کرنا اور ہٹ جانا ہے اور اعتداء کا مفہوم حق سے ہٹنا اور حق کو دبا دینا ہے، یہیں سے یہ مفہوم بھی صادر ہوا کہ جب جانور کسی کمزور جانور پر شکار کے لئے حملہ کرتا ہے تو اسے بھی اعتداء کہیں گے، یعنی عدوان صرف معاملہ سے ہٹنا اور اعتداء حق سے ہٹنے کو کہیں گے، یہ لطیف فرق دونوں میں ہے، لیکن آگے چل کر دونوں کا مفہوم ظلم میں شامل ہوجاتا ہے۔

مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں صفاتِ الٰہی سے متعلق متکلمین کی تمام موشگافیوں کو لایعنی قرار دیا ہے، اور یہی حقیقت بھی ہے، بہت سے دیگر مفکرین و مفسرین کی طرح مولانا آزاد نے بھی صفاتِ الٰہی کو متشابہات کے زمرہ میں شامل کیا ہے۔[11] لیکن احقر کے نزدیک یہ متشابہات کے خانہ میں نہیں آتی ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ خالی الذہن ہوکر کائنات کا مطالعہ کیا جائے، اس میں حسن طلب اور

صدق نیت ہو تو اللہ کی تمام صفات اسے صاف وشفاف شکل میں نظر آئیں گی، اور اس باب میں وہ تمام شکوک وشبہات سے نکل آئے گا، قرآن انسان سے یہی مطالبہ کرتا ہے اور اسی لئے اس کتاب کو اس نے متقی بندوں کے لئے کتاب ہدایت قرار دیا ہے۔[۱۲]

مولانا نے اپنی تفسیر میں اسلام کے تین مدارج بتائے ہیں اسلام، ایمان اور احسان، اس تقسیم پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ احسان کا درجہ ذاتی تجربے اور کشف سے حاصل ہوتا ہے، تعلیمی اور احکامی عقائد کا اس میں دخل نہیں ہے، یہ خود کرنے اور پانے کا معاملہ ہے، بتلانے اور سمجھانے کا نہیں جو یہاں تک پہنچ گیا ہے وہ یہی بتلائے گا کہ میری طرح بن جاؤ پھر جو کچھ دکھائی دیتا ہے دیکھ لو۔[۱۳]

مذکورہ سطور کی روشنی میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسلام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں مکمل ہو چکا تھا، یہ ذاتی تجربات اور کشف کا ہرگز محتاج نہیں ہے، اسلام کے تعلیمی اصول اور احکامی عقائد ہی ہماری کامیابی کی ضمانت ہیں لیکن مولانا کا خیال ہے کہ درجہ احسان کے حصول کے لئے یہ چیزیں بے معنی ہیں، گویا یہ دنیا دراصل دنیائے رسالت سے ایک الگ دنیا ہے، اسی کو دیگر الفاظ میں دنیائے تصوف کہیں گے جو خود ساختہ بستی ہے جس میں صوفیہ کرام سکونت پذیر ہیں، اس کا اسلام اور قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے تصوف دراصل ایک فلسفہ ہے اور فلسفی تمام قیود وقدغن سے آزاد ہے، یہ کسی مذہب اور نبوت کا محتاج نہیں۔

اس تفسیر میں مولانا نے "وحدۃ الوجود" کا بھی مسئلہ اٹھایا ہے اور اسی تناظر میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ "اگر میں مسئلۂ وحدۃ الوجود کو ثابت کرنا چاہوں تو قرآن وحدیث کے تمام نصوص وظواہر سے اس کو اثبات کرسکتا ہوں"۔[۱۴]

شاہ صاحب کے اس خیال پر مولانا آزاد نے اظہارِ نکیر کیا ہے نیز یہ بھی فرمایا کہ شاہ صاحب قرآن کریم کے حقیقی معنی سے دور چلے گئے ہیں اور صدر اول کے مخاطبین کے مفاہیم سے انحراف کیا ہے۔[15] دراصل مسئلۂ وحدۃ الوجود ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے اور اس مسئلہ کی وجہ سے اعمال و اعتقاد میں گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں، نیز دین اسلام کی خالص وحدانیت متاثر ہوتی ہے، نظریہ وحدۃ الوجود اور سورہ اخلاص کے مفاہیم میں یکسر تضاد ہے، اور مفسرین کو اس کا اعتراف ہے کہ سورہ اخلاص میں خالص توحید کی تعلیم دی گئی ہے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ جس میں مولانا آزاد کی صحافتی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ حصہ اس کتاب کی جان ہے، اسے مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے نہایت تحقیقی انداز سے تحریر کیا ہے، اس میں آپ کا تحقیقی و علمی انداز جھلکتا ہے، اور پورے طریقے سے مولانا آزاد کی صحافتی عظمت کو سمجھا جا سکتا ہے، اس میں آپ کی متعلقہ خدمات کا استقصاء بھی کیا گیا ہے اور ہندوستان کی صحافت میں آپ کے اثرات کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

مولانا اصلاحی نے آپ کے متعلق یہ نہایت مناسب بات کہی ہے کہ دنیائے عرب کے متعدد اخبارات و رسائل آپ کی خدمت میں آتے تھے، ان تمام رسائل و اخبارات کو پڑھتے، ان میں جرجی زیدان کے ''الہلال'' اور رشید رضا مصری کے ''المنار'' کو بہت پسند کرتے تھے،[16] یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ ہندوستان میں عربی اخبارات و رسائل کہ آمد کا سلسلہ علامہ شبلی نعمانیؒ کی کوششوں سے ہوا، جس کی شہادت مکاتیبِ شبلی اور سفرنامہ روم و مصر و شام میں مل جائے گی، اس لئے یہ کہنا ہرگز نامناسب نہ ہوگا کہ مولانا آزاد کے اندر عربی اخبارات و رسائل کے تئیں دلچسپی درحقیقت علاّمہ کی وجہ سے پیدا

ہوئی، عربی اخبارات ہی کے معیار پر ''الہلال'' کو ترتیب دیا اور ان کے بہت سے مقالات اور خبریں مترجم صورت میں اپنے اخبارات میں شائع کرتے تھے، اس کے علاوہ جدید عربی ادب کا ایک بڑا سرمایہ تراجم کی مدد سے اپنے اخبارات میں منظر عام پر لے آئے، ان تمام کاوشوں کے پیچھے علاّمہ شبلی نعمانی کے خیالات کارفرما ہیں۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے اس مضمون میں یہ پہلو بھی اٹھایا کہ وہ کون سے اخبارات ہیں، جن میں مولانا آزاد کے مقالات چھپتے تھے، یا وہ کون سے اخبارات ہیں جن کی ادارتی ذمہ داریاں آپ نے انجام دیں، مثلاً ایڈورڈ گزٹ، الندوہ، وکیل اور دارالسلطنت وغیرہ کی ادارتی ذمہ داریوں میں مولانا آزاد نے حصہ لیا اور صحافتی لیاقت سے انہیں آگے بڑھایا، ان کے علاوہ الہلال، البلاغ، اقدام، پیغام اور پیام وغیرہ کے خود آپ مالک تھے اور آپ کی ادارت میں نکلتے تھے۔

یہاں یہ ذکر مناسب ہوگا کہ اردو صحافت کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد نے عربی صحافت کے ارتقاء میں نمایاں کردار ادا کیا، سب سے پہلے ۱۳ اگست/ ۱۰ رمضان ۱۳۳۱ھ کو الہلال میں اعلان کیا کہ الہلال کی طرح ایک عربی اخبار ''البصائر'' نکالنے کے خواستگار ہیں لیکن افسوس کہ یہ منظر عام پر نہ آسکا، اس کے علاوہ مولانا نے ''الجامعۃ'' کے نام سے بھی ایک عربی رسالہ نکالا، جسے اپریل ۱۹۲۳ء میں کلکتہ سے جاری کیا، اس کا ایک مقصد یہ تھا کہ عربوں کو ہندوستان کی سیاسی سرگرمیوں سے باخبر کیا جائے، اس کا دوسرا مقصد اتحادِ اسلامی اور اتحادِ مشرق تھا، چنانچہ جب انگریزوں کی دست درازیاں حرمین شریفین تک جا پہنچیں تو آپ نے اس کے خلاف آواز بلند کی، چنانچہ شریف حسین کی مخالفت اور ابن

سعود کی حمایت شروع کردی گئی، جس کی وجہ سے اسے دھمکیوں اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑا، انہی مخالفتوں کے سبب ۲۴ مارچ ۱۹۲۴ء کو بند کرنا پڑا، لیکن اسے اپنے اہداف میں کامیابی نصیب ہوئی، جیسا کہ عبدالرزاق ملیح آبادی رقم طراز ہیں:

> ''الجامعۃ'' کی تحریک صحیح اور بر وقت تھی، جلد ہی کامیاب ہوگئی، حرمین کی آزادی کے بعد ''الجامعہ'' کی ضرورت باقی نہ رہی اور اسے بند کردیا گیا''۔ [۱۷]

اس کے بعد مولانا نے اپنی وزارت کے دوران ''ثقافۃ الھند'' کے نام سے ایک عربی مجلّہ نکالنے کا فیصلہ کیا، اس کے مقاصد میں عرب ممالک کے سامنے ہندوستان کے سیاسی، ثقافتی اور علمی نمائندگی مقصود تھی، نیز ہندوستان کے تئیں بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ مطلوب تھا، چنانچہ ''انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز'' کی جانب سے ۱۹۵۰ء میں اس کا اجراء ہوا، اسکی وجہ سے ہندوستان کی تصویر کو عربوں نے نہایت واضح شکل میں ملاحظہ کیا، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا یہ اظہار خیال مناسب ہے:

> کونسل نے اپنا سہ ماہی رسالہ ''ثقافۃ الھند'' جاری کیا، اور رسالے کے مضامین نے مسلم دنیا پر برقی لہروں کی طرح اثر پیدا کیا، مسلم دنیا ہندوستان کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے لگی، مصر، عراق، سیریا اور ایران کے پرچوں نے اس اس رسالے کو بڑھ چڑھ کر تعریف کی اور اس کے مضامین نقل یا ترجمہ کرلئے، ان ملکوں کے نامور اہل قلم اور مصنفوں نے رسالے کو اور اس کی خدمات کو سراہا، رسالے کے بعض مضامین تو اس قدر مقبول ہوئے کہ عراق کی ایک سوسائٹی

نے انہیں کتابی صورت میں شائع کردیا، ایران میں بھی یہ مضامین فارسی میں ترجمہ ہوئے اور کتاب کی شکل میں شائع کیے گئے، انگلینڈ فرانس اور اٹلی کے مشہور مستشرقوں نے رسالے کے بعض مضامین کا اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا"۔۱۸

مذکورہ بالا اقتباس سے اس رسالے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، گوکہ اس میں مولانا آزاد کی کوئی تحریر شائع نہ ہوئی، لیکن مولانا کے مقاصد کی اس سے ضرور تکمیل ہوئی، اپنے پیغام کو پوری دنیا خصوصاً عربوں میں عام کیا، ہاں یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ قدیم آدٹ کی بہت سی نایاب تصاویر ایسی تھیں جن کی باریکیوں اور خصوصیات کو مولانا نے اردو میں واضح کیا جسے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے عربی میں ترجمہ کیا۔۱۹

بہر کیف البصائر، الجامعہ اور ثقافۃ الہند کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اردو صحافت کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں عربی صحافت کے ارتقاء میں مولانا کا غیر معمولی رول رہا ہے، یہ سب علاّمہ شبلی نعمانی کے متروکہ کام تھے، جسے مولانا آزاد نے آگے بڑھایا، عربی صحافت کو جن جذبات وخیالات کے پیشِ نظر اختیار کیا تھا انہی وجوہات کی مدِّنظر علاّمہ نے اس کا آغاز کیا تھا، جدید عربی زبان وادب اور صحافت کا آغاز فی الحقیقت علی گڑھ سے ہوا تھا، جسے بہت سے لوگوں نے بعد میں آگے بڑھایا۔

مولانا کی اردو اور عربی صحافت سے مترشح ہے کہ آپ جمال الدین افغانی، ان کے تلامذہ اور بہت سے دیگر ادباء ومفکرین سے متاثر ہوئے، یہی وجہ ہے کہ جدید عربی ادب سے متعلق بیشمار چیزیں آپ کے اخبارات ومجلاّت میں

شائع ہوئیں، افغانی عبدہ، رشید رضا اور بہت سے دیگر مصری مفکرین وادباء اور شعراء کی بہت سی نگارشات صفحات کی زینت بنائی گئیں، مثلاً رشید رضا کے ایک مقالہ کو اردو میں منتقل کر کے ''پیام'' کے اندر تین اقساط میں شائع کیا گیا۔[۲۰]

''لسان الصدق'' پر مولانا اصلاحی نے الگ سے ایک مضمون تحریر کیا، جس میں اس کی اہمیت وافادیت اور اس کے اہداف واغراض پر اظہار خیال کیا گیا، اس سے مولانا اصلاحی کی تجزیاتی صلاحیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، دیگر رسائل کی طرح اس میں بھی دیگر مسائل کے ساتھ عربی ادب کو موضوع بحث بنایا گیا، اس میں نئی عربی کتب کی طباعت کی اطلاع دی جاتی تھی، یہ تمام اشتہارات رسائل سے ماخوذ ہوتے تھے، اسی طرح عربی رسالہ ''المحاکم'' سے ایک اشتہار کو ''لسان الصدق'' میں منتقل کیا گیا، اس میں درج کتب کا اشتہار تھا۔

۱۔ (یتیمۃ الدھر فی محاسن اھل العصر (ابو منصور عبدالملک بن محمد بن اسمٰعیل الثعالبی النیسابوری) یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے، یہ کتاب پہلی مرتبہ دمشق سے ۱۳۰۱ھ میں شائع ہوئی۔[۲۱]

۲۔ النھایۃ فی التعریض والکنایۃ (ابو منصور الثعالبی النیسابوری) یہ ادب کے موضوع پر ایک مستند کتاب ہے جو ۱۳۰۱ھ میں مکہ مکرمہ سے شائع ہوئی۔[۲۲]

۳۔ فقہ اللغۃ (ابو منصور الثعالبی النیسابوری) یہ ادب ولغت کی ایک معروف کتاب ہے، جو مصر سے ۱۲۸۴ھ، ۱۸۸۵ء میں بیروت سے شائع ہوئی۔[۲۳]

۴۔ لطائف المعارف (ابو منصور الثعالبی النیسابوری) ۱۸۶۷ء میں پہلی بار لائڈن سے چھپ کر منظر عام پر آئی۔[۲۴]

۵۔ سحر البلاغة[۲۵] (الثعالبی النیسابوری)

۶۔ مونس الوحید (الثعالبی النیسابوری) یہ کتاب ۱۸۲۹ء میں نہایت اہتمام کے ساتھ جرمنی میں ترجمہ کر کے اسٹریا سے شائع کی گئی[۲۶]

۷۔ التمثیل والمحاضرة[۲۷] (الثعالبی النیسابوری)

۸۔ المبہج والنہایة[۲۸] (الثعالبی النیسابوری)

۹۔ کتاب الاعجاز والایجاز (الثعالبی النیسابوری) یہ ادب وحکمت اور فصاحت وبلاغت کی ایک نمائندہ کتاب ہے، اس میں اعجاز قرآن کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم، خلفاء راشدین اور صحابۂ کرام کے اقوال جمع کئے گئے ہیں، ان تمام نوادر کے علاوہ شاہانِ فارس، فلاسفۂ یونان، خلفاء اموی اور عباسی کے باب میں بھی بہت سی چیزیں اس میں جمع کر دی گئی ہیں، نیز شعراء، ارباب قلم، زہاد اور مزاح نگار وغیرہ بھی موضوع بحث بنائے گئے ہیں، اس کا ایک نسخہ کتب خانہ خدیوی میں موجود ہے، جسے رسالہ ''المحاکم'' کے ایڈیٹر سکندر آصاف نے تہذیب وتشریح کے بعد ۱۸۹۷ء میں شائع کیا ہے۔

''لسان الصدق'' کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا کہ اس میں سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک کی تائید کی گئی۔ مئی ۱۹۰۴ء کے شمارہ میں محسن الملک کا ایک مضمون شائع کیا گیا جس میں سرسید اور ان کے ادارے کی خصوصیت بیان کی گئی ہے،[۳۰] اسی طرح اگست اور ستمبر ۱۹۰۴ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے تعلق سے ایک مقالہ شائع کیا گیا،[۳۱] اس کے علاوہ بعض دیگر مضامین اور اداریوں میں تحریکِ سرسید کی تعریف وتوصیف کی گئی، اگر کہیں اختلاف کیا گیا تو لہجے میں نرمی اور ملائمت ہوتی۔

''لسان الصدق'' کی طرح مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے ''الہلال'' پر بھی ایک وقیع اور مبسوط مقالہ تحریر کیا اور اس کے موضوعات ومباحث پر اپنے خیالات پیش کئے، مولانا آزاد کی بہت سی تشریحات ایسی ہیں جن سے مفکرین کو اختلاف کی گنجائش ہے، چنانچہ ''جہاد'' کا جو تصور مولانا آزاد نے پیش کیا ہے اس سے اتفاق کرنا ممکن نہیں ہے، کیونکہ قرآن کریم کی رو سے اس میں تعارض وتضاد ہے، اس کے متعلق مولانا کا خیال ہے۔

> ''ہندوؤں کے لئے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے، لیکن مسلمانوں کے لئے یہ ایک دینی فریضہ اور داخل جہاد فی سبیل اللہ ہے، اللہ نے ان کو اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے، جو حق وصداقت اور انسانی بندواستبداد وغلامی کو توڑنے کے لئے کی جائے'' ۔۳۲

یہاں کسی تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے، لیکن اتنا اشارہ ضروری ہے کہ اگر کسی غیر مسلم فرد یا مملکت پر ظلم وتشدد ہو رہا ہو اور اس کی آزادی کا گلا گھونٹا جا رہا ہو تو اس کی مدد کرنا ہر صاحب ایمان کا اخلاقی فریضہ ہے، اگر مملکت جمہوریت پر مبنی ہو، مسلم باسیوں کا اس پر برابر کا حصہ ہو تو اس پر آئی ہوئی مصیبت کا ٹالنا اس کا اخلاقی اور ملکی فریضہ ہے، لیکن فرد مسلم ہو اور مملکت اسلامی ہو تو اس پر ڈھائے جانے والے مظالم ومصائب کے خلاف جدوجہد کرنا دراصل جہاد ہے اس طرح چیرہ دستیوں کے خلاف ایک مسلم کی کوششوں کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے، ایک کوشش کو اخلاقی اور ملکی کوششوں کے زمرہ میں رکھا جائے گا اور ایک کوشش کو دینی اور جہاد کے خانہ میں ڈالا جائے گا، جہاد صرف اسلامی کاز

سے عبارت ہے، جہاد کو عام کردینا اور ہر سعی وکوشش کو جہاد کا رنگ دے دینا مناسب نہیں ہے، اس لئے مولانا آزاد کے مذکورہ خیال سے اتفاق کرنا ممکن نہیں ہے، بعض فقہاء کے یہاں جہاد کے لئے اسلامی ریاست کا ہونا شرط ہے، خاکسار کی حقیر رائے میں اسلامی قیادت کا ہونا شرط ہے۔

ہمارے ہندو بھائیوں نے آزادئِ وطن کے لئے جو کوششیں کیں اسے بھی مولانا آزاد نے جہاد کا نام دیا ہے[۳۳] جبکہ جہاد کے لئے ایمان شرط ہے، ایمان کے بغیر جہاد ممکن نہیں، بہر کیف قرآن کریم کی بعض اصطلاحات کی جو تعبیر وتشریح مولانا نے کی ہے وہ ہرگز قابلِ قبول نہیں، مناسب تھا کہ مولانا اس طرح کے خیالات پر قرآنی نقطۂ نظر پیش کرتے۔ لیکن یہ کتاب اس طرح کے تحلیل وتجزیہ سے محروم ہے۔

''البلاغ'' پر بھی مولانا اصلاحی نے ایک قابلِ قدر مقالہ تحریر کیا جو نومبر ۱۹۱۵ء میں منظرِ عام پر آیا، اس کی متعدد خصوصیات میں سے ایک نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ اس کے تعلق سے قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ اس کے دو ابتدائی شماروں میں ''فاتحة البلاغ'' کے نام سے اداریہ تحریر کیا جس میں امتِ مسلمہ کی پستی کی تصویر کشی کی گئی ہے، مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے اس کا ماحصل اس طرح پیش کیا ہے۔

> ''اس کے پہلے اور دوسرے شمارے میں مولانا نے عربی زبان میں ''فاتحة البلاغ'' کے نام سے ایک طویل افتتاحیہ قلم بند کیا جس میں مسلمانوں کی موجودہ پستی اور زبوں حالی زیر بحث آئی ہے اور ان کے تشتت وافتراق، تعصب وتحزب اور تقلید میں گرفتار ہوکر دین کا حلیہ بگاڑ

لینے کا ذکر کیا گیا ہے، مولانا کے نزدیک قرآن کو مہجور اور اس
کی دعوت تعلیم کو متروک بنا دینے کے نتیجہ میں یہ سارا فساد
رونما ہوا ہے، جس کی اصلاح کے لئے انہوں نے دعوت
و تبلیغ کو ضروری بتایا ہے''۔[۳۴]

البلاغ کی اسی خصوصیت کی طرف نیاز فتح پوری نے اس طرح اشارہ
کیا ہے:

''البلاغ ایک مذہبی تبلیغی آرگن تھا، جس کا خطاب زیادہ
تر مسلمانوں سے تھا، تا کہ ان کے ذہن و دماغ سے رسم
و روایات کے نقوش محو کر کے ان کو صحیح تعلیمِ قرآنی سے
آشنا کیا جائے اور وہ سمجھ سکیں کہ اسلام کا حقیقی مقصد انسانیت
پرستی کے سوا کچھ نہیں اور جو ماورائے دیر و حرم ''ہر جا کنیم سجدہ
بداں آستاں رسد'' کا مبلغ ہے''۔[۳۵]

مولانا آزاد ''البلاغ'' کے توسط سے قرآن کے پیغام کو عام کرنا چاہتے
تھے، اس میں انہیں خاصی کامیابی ملی جس کی طرف مولانا اصلاحی نے نہایت
خوبصورتی کے ساتھ اشارہ کیا ہے، مولانا اصلاحی نے اس کتاب میں مولانا آزاد
کا تصوّرِ قومیت بیان کیا، مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں
ہندوستان کی ایک نا قابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہوں، میں اس متحدہ قومیت کا
ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ
جاتا ہے،[۳۶] میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک عامل (Factus) ہوں،
لیکن میں اپنے اس دعوئ سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا'' اس سے قبل مولانا

آزادرقم طرازہ ہیں:

''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹا سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم واسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں، بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں، اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے''۔[۳۷]

مولانا کے مذکورہ بالا دونوں اقتباس میں تضاد ہے، پہلے اقتباس سے متبادر ہے کہ قومی ومذہبی اعتبار سے مسلم قوم اور دیگر اقوام میں فرق ہے بلکہ خاکسار کے نزدیک فرقِ کثیر وفرقِ طویل ہے، لیکن ان فروق کے باوجود مختلف اقوام ایک ملک میں بآسانی رہ سکتی ہیں، اسلام میں دوسری اقوام کے ساتھ رہنے کے آداب بتائے گئے ہیں، نیز امتِ مسلمہ کا فریضہ ہے کہ دیگر اقوام کی حمیت وآزادی کا پاس ولحاظ رکھے، کسی کا دل دُکھانے کے علی الرغم اس کے غموں کو خود اوڑھ لے، دینِ اسلام میں نباہ کی مختلف صورتیں موجود ہیں، لیکن خود کو کسی میں مدغم کردیں یہ ممکن نہیں، آخری اقتباس میں مولانا نے یہی خیال پیش کیا ہے، خاکسار ایک ہندوستانی Resident ہے، اس رو سے اس کا فریضہ ہے کہ ملک کی تعمیر وترقی میں پیش پیش رہے، اس ہیکل کا عنصر بن جانا اور اس تکوین کا عامل ہو جانا ایک ایسا تصور ہے جو شرک کی طرف لے جاتا ہے، ایک مسلم صرف ہیکل

امتِ اسلامی کا عنصر ہے اور تکوین اسلام کا عامل ہے جو اسلام دنیا میں ابتداء آفرینش سے رہا ہے۔

یہاں اس پہلو کو اٹھانا مناسب ہوگا کہ مسلم لیگ کا یہ خیال کہ دو قومیں ایک ساتھ نہیں رہ سکتی ہیں اس سے اتفاق ممکن نہیں ہے، بالکل اسی طرح جس طرح مولانا آزاد کے تصور متحدہ قومیت سے، ہاں مولانا نے مسلم اور ہندوؤں کے درمیان جس اتحاد و اتفاق کی بات کی ہے وہ ضرور ممکن ہے، مولانا کے یہ تصورات ہندوستان کو ٹوٹنے سے بچا سکتے ہیں۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب نے مولانا آزاد کی متحدہ قومیت کے تصوّر سے مکمل اتفاق کیا ہے:

> ''مسلمانوں کو بھی حقیقت پسندی سے کام لے کو قدرت کا یہ فیصلہ ماننا ہوگا کہ ہندوستان غیر مسلم اکثریت کے ساتھ مشترک زندگی ان کا مقدر بن چکی ہے، جو سانچہ وجود میں آگیا ہے، اسے توڑا نہیں جا سکتا''۔[۳۸]

مذکورہ کلمات سے یہی نقطۂ نظر سامنے آتا ہے کہ مولانا اصلاحی نے بھی مولانا آزاد کے خیالات کی تائید و توثیق کی ہے، مولانا اصلاحی کا یہ کہنا کہ مشترک زندگی مسلمانوں کا مقدر بن چکی ہے کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتا کیونکہ تقدیر اور آنے والے دنوں کے بارے میں اللہ کے علاوہ کسی کو کچھ معلوم نہیں، اللہ کا ارشاد ہے۔

وماتدری نفس ماذا تکسب غدا (لقمان ۳۱/۳۴)	کسی نفس کو کچھ پتہ نہیں کہ کل اس کے حصے میں کیا آئے گا

مولانا اصلاحی نے جس سانچے کی بات کہی ہے وہ سانچۂ انسانی ہے، ہمارا سانچہ درحقیقت ''صبغة اللہ'' ہے اور اسی میں قرآن کریم نے ڈھلنے اور

رنگنے کی بات کہی ہے، رہا اس ملک کو جنت نشاں بنانے کا مسئلہ تو اس میں ہندستانی مسلمان دیگر ہندستانی اقوام کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے، لیکن اپنے تشخص اسلامی کو بہر حال باقی رکھیں گے۔

تفسیر سورہ فاتحہ کو تفسیر کے بجائے تحقیق اور فلسفہ کا نام دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا، یہ تفسیر ۵۵۴ صفحات پر مشتمل ہے جس میں قرآنیات، الٰہیات، مذاہب، قدیم اقوام، عرب مفکرین کے افکار اور تاریخ سے بحث کی گئی ہے، اس تحقیق وتدقیق میں سورہ فاتحہ کی روح دب کر رہ جاتی ہے، اس میں ایک دعائیہ انداز اور بندۂ مخلص کی جو تڑپ ہے وہ کھو کر رہ جاتی ہے، مولانا اصلاحی نے صرف اس کا خلاصہ پیش کیا ہے، ۱۶ صفحات پر مشتمل اس خلاصہ میں کہیں تحلیل وتجزیہ اور تبصرہ نہیں ملے گا، مناسب تھا کہ اس تفسیر کے نقائص کو واضح کیا جاتا اور بعض تسامحات کو موضوع بحث بنایا جاتا، مولانا اصلاحی کا قرآنیات کے ماہرین میں شمار ہے لیکن یہ کتاب اس پہلو سے خالی ہے۔

اس کتاب کی جان مولانا اصلاحی کی وہ تحریر ہے جس کا تعلق مولانا آزاد کی صحافت سے ہے، مولانا آزاد کی زیر ادارت نکلنے والے اخبارات ورسائل، آپ کی زیر نگرانی جاری ہونے والے مجلّات نیز دیگر اخبارات ومجلّات میں شائع ہونے والے آپ کے مقالات کا مولانا اصلاحی نے جائزہ لیا ہے، جس سے مولانا آزاد کی صحافت کی ایک واضح تصویر سامنے آجاتی ہے، مولانا کی صحافت کے موضوعات، ملکی وبین الاقوامی مسائل، عالمی سطح پر امتِ مسلمہ کے درپیش عوارض وموانع، اسلامیات، قرآنیات اور عربی ادب کے مباحث تھے، بالخصوص قرآنیات کو اپنا خصوصی محور بناتے ہوئے حالاتِ حاضرہ پر اظہارِ خیال کیا، مولانا کا ایک خصوصی موضوع عرب اور عربی ادب تھا، کیونکہ مولانا کی نظریں بلاد عربیہ

کی صحافت پر ٹکی ہوئی تھیں، وہی ان کا معیار ومحور تھا، یہ مقیاس ومیزان انہیں وراثت میں علاّمہ شبلی سے ملا تھا۔

کتاب کے اخیر میں مولانا کی سیاسی جدوجہد کا بھی ذکر کیا گیا ہے، یقیناً ہندوستان کی سیاست میں وہ سنگِ میل کی مانند ہیں، یہاں کی جمہوریت کو معنی خیز جمہوریت بنانے میں مولانا کا اہم رول رہا ہے، لیکن انہوں نے جہاد اور متحدہ قومیت کی جو تصویر کشی کی ہے اس سے اتفاق کرنا بڑا مشکل ہے کیونکہ قرآنی اور اسلامی نقطۂ نظر سے یہ میل نہیں کھاتی، مولانا اصلاحی نے مولانا کے اس تصوّر سے کلّی اتفاق کیا ہے کتاب کا یہ آخری مضمون مزید توجہ اور تفصیل کا متقاضی ہے، بہر کیف اتنا تو طے ہے کہ مولانا آزاد ایک عبقری انسان تھے۔[۳۹] اور آپ کی عبقریت کے لئے المعری کا یہ شعر پڑھا جاسکتا ہے۔

وإنی وإن کنتُ الآخیر زمانه

لآتِ بما لم تستطعه الأوائل۔[۴۰]

حواشی

۱۔ مکاتیب شبلی۔ (مرتبہ: سید سلیمان ندوی) مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۲۸ء، ۱/۲۷۵

۲۔ ایضاً، ۱/۲۸۹

۳۔ حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء، ص: ۴۴۴، ۸۱/۳، ص: ۱۶۵

۴۔ آہ مولانا ابوالکلام آزاد: علم ودانش کا آفتاب غروب ہوگیا، شاہ معین الدین احمد ندوی، (معارف، شعبان المعظم ۱۳۷۷ھ، مارچ ۱۹۵۸ء، ۸۱/۳، ص: ۱۶۵-۱۶۴

۵۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت، حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی، مکتبہ رحمتِ عالم، لال کنواں، دہلی، ۱۹۸۸ء، ص: ۵۳

۶۔ پروفیسر الطاف احمد اعظمی نے مولانا آزاد کی سورہ فاتحہ کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور مولانا کے بہت سے تسامحات کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

۷۔ ترجمان القرآن، مولانا ابوالکلام آزاد (پیش لفظ از ڈاکٹر ذاکر حسین) ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی، پہلی بار، ۱۹۶۴، ۱/۸۳-۸۴

۸۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحی، باراول، ۱۹۸۹ء، تاج کمپنی، ۱/ ۴۸

۹۔ ترجمان القرآن، ۱/۲۲۹

۱۰۔ ایضاً،۱/۲۳۰

۱۱۔ ایضاً،۱/۳۰۹۔۳۰۸

۱۲۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: تدبر قرآن،۱/۸۸۔۸۹

۱۳۔ ترجمان القرآن،۱/۲۳۲۔۲۳۱

۱۴۔ وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر شاہ صاحب نے ''فیوض الحرمین'' میں بحث کی ہے، دیکھئے: ص:۸۱۔۸۵ (مشاہدات ومعارف ترجمہ فیوض الحرمین، حضرت شاہ ولی اللہ، (ترجمہ از محمد سرور) سندھ ساگر، اکاچی، لاہور)

۱۵۔ ترجمان القرآن،۱/۲۳۳

۱۶۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: مولانا ابوالکلام آزاد،ص:۱۷۱

۱۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد، عابد رضا بیدار،

۱۸۔ ذکر آزاد، ملیح آبادی، دفتر آزاد ہند، کلکتہ، پہلا ایڈیشن، فروری ۱۹۶۰ء، ص:۴۵۵۔۴۵۶

۱۹۔ وضاحت کے لئے دیکھئے: ذکر آزاد،ص:۴۴۶۔۴۴۷

۲۰۔ مولانا ابوالکلام آزاد،ص:۱۹۴

۲۱۔ کتاب کا عنوان اور سن طباعت غلط دیا ہوا ہے، عنوان ''یتیمة الدهر فی شعراء أهل العصر'' ہے اور ۱۳۰۱ھ کے بجائے ۱۳۰۳ھ میں شائع ہوئی دیکھئے: معجم المطبوعات،ص:۶۶

۲۲۔ کتاب کا عنوان ''النهاية فی التقريض والكناية'' ہے، جو ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے، دیکھئے: معجم المطبوعات،ص:۶۶۰

۲۳۔ اس کتاب کا پورا نام ''فقه اللغة وسر العربية'' ہے، جسے شیخ لویس نے ترتیب وتحقیق کے بعد شائع کیا، دیکھئے: معجم المطبوعات،ص:۶۵۸

۲۴۔ یہ کتاب استاذ دی یونغ کی تحقیق وتحشیہ کے ساتھ شائع ہوئی، دیکھئے: معجم المطبوعات، ص:۶۵۹

۲۵۔ اس کتاب کا پورا عنوان ''سحر البلاغة وسر البراعة '' ہے، اس میں شعراء اور نثر نگاروں کے تراجم بیان کئے گئے ہیں، دیکھئے: معجم المطبوعات، ص:۶۵۸

۲۶۔ اس کا پورا عنوان ''مؤنس الوحید فی المحاضرات '' ہے، دیکھئے: معجم المطبوعات، ص:۶۶۰

۲۷۔ دیکھئے: معجم المطبوعات، ص:۶۵۷

۲۸۔ دیکھئے: ایضاً، ص:۶۵۹

۲۹۔ یہ کتاب ۳۰۴ صفحات پر مبنی ہے، مطبع عمومیہ سے شائع ہوئی ہے، دیکھئے: معجم المطبوعات، ص:۶۵۷

۳۰۔ لسان الصدق، مئی ۱۹۰۴ء، دارالسلطنت، کلکتہ، ۲/۵، ص:۱۹۔۳۲ (پراونشل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بنگال اور مسئلہ محمڈن یونیورسٹی، نواب محسن الملک بہادر)

۳۱۔ لسان الصدق، (محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علاقہ بمبئی اور مرحوم سرسید احمد خاں) دارالسلطنت کلکتہ، اگست، ستمبر ۱۹۰۴ء، ۲/۸و۹، ص:۲۹۔۳۲

۳۲۔ الہلال، ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء، ص:۱۱

۳۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ص:۲۴۲

۳۴۔ ایضاً، ص:۲۵۲

۳۵۔ مولانا آزاد کی صحافتی عظمت، نیاز فتح پوری، آجکل، سالنامہ ابوالکلام نمبر، جلد ۱۷، اگست ۱۹۵۸ء دہلی، ص:۲۲

۳۶۔ خطبات آزاد، (مرتبہ: مالک رام) پہلی بار، ۱۹۷۴ء ساہتیہ اکادیمی رابندر بھون، نئی دہلی، ص: ۹۷۔۹۸

۳۷۔ ایضاً، ص: ۲۹۷

۳۸۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ص: ۲۹۷

۳۹۔ مولانا آزاد کی مختلف خدمات کے اعتراف کے لئے ''ثقافة الهند'' کا مولانا آزاد نمبر (۳۹/ ا۔۲، ۱۹۸۸ء، ۳۹/ ۳۔۴، ۱۹۸۸ء) نکالا گیا جو دو جلدوں پر مشتمل ہے پہلی جلد ۳۴۶ صفحات پر اور نثار احمد دوسری جلد ۳۹۶ صفحات پر مبنی ہے، اس کے لئے ہم مرحوم پروفیسر فاروقی کے شکر گزار ہیں کہ جن کی پیہم ریاضتوں سے یہ وقیع نمبر منظر عام پر آسکا۔

۴۰۔ اس شعر میں المعری اپنی شعری عظمت پر نازاں ہے، یہ افتخار و تعلی شعراء کے یہاں عموماً ملتی ہے، معری کا خیال ہے کہ مجھے پچھلا زمانہ ملا پھر بھی میں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جسے متقدمین انجام دینے سے قاصر ہیں۔ اس شعر کی شرح اس طرح بیان کی گئی ہے:

''أی إنی وإن کنتُ الذی آخر زمانه ، أفعل من الأمور العجیبة ما عجزت الأولون زماناً عن أمثاله أی سبقتُ الأمائل فی المساعی وإن تأخر زمانی'' (شرح التنویر علی سقط الزند تألیف أبی العلاء المعری، مطبعة مصطفیٰ محمد ، مصر، الجزء الأول، ص: ۱۶۳)

☆☆☆

ذاکرِ علی گڑھ

(محمد ذاکر علی خاں)

ابوسفیان اصلاحی

بھولے پن، پاکیزگی، شفافیت اور روایات علی گڑھ کا دوسرا نام محمد ذاکر علی خاں ہے (۲۰۱۲-۱۹۲۴ء) مجھے کیا معلوم کہ ایسا عظیم شخص، درس گاہ سرسید کا ایسا لائق سپوت اور دنیا جہاں میں بسنے والے علیگ بھائیوں کا ننھا سا، پیارا سا اور چاند جیسا بھائی ہم سب لوگوں کو چھوڑ کر اپنے دائمی سفر پر نکل جائے گا۔ آٹھ فروری ۲۰۱۲ء کی گھڑی کس قدر جاں کاہ اور جاں گسل تھی جب موت کے فرشتہ نے آپ کی روح قبض کر لی، ایسی روح فرسا خبر سنتے ہی ذاکر صاحب کے بھائی راشد صاحب کے گھر ''سمن زار'' کی طرف چل پڑا۔ ہم دونوں مل کر نوحہ کرتے رہے اور آپ کی عظمتوں کو سلام کرتے رہے خدا بھلا کرے امریکہ میں رہنے والے اپنے علیگ بھائی شہیر کا جنہوں نے فون پر بتایا کہ ذاکر بھائی کو Blood Cancer ہوگیا ہے آپ ان سے جلد از جلد بات کرلیں کیوں کہ ایسے مریضوں کا کیا پتہ کب تار نفس ٹوٹ جائے؟ فون پر ذاکر صاحب سے بات ہوئی تو آواز میں حد درجہ نقاہت تھی لیکن یاد داشت پوری طرح محفوظ، بستر مرگ پر بھی مادر علمی کی فکر، نواب ابن سعید خاں چھتاری، نواب رحمت اللہ خاں شروانی (میں کیسے بتاتا کہ اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں) مہر الٰہی ندیم اور راحت ابرار کو سلام و دعا بھیجنے کی فکر مندیاں، باتیں بڑھانا چاہ رہے تھے۔ جملے کٹ

کٹ کر بڑی اذیت کے ساتھ ادا ہو رہے تھے۔ اپنی تمام تر نقاہتوں اور اذیتوں کے باوجود صرف اس لیے نہیں رک رہے تھے کہ یہ آواز انہیں اپنی مادر علمی سے سنائی دے رہی تھی۔ آپ کے شہر آرزو سے انہیں یاد کیا جا رہا تھا اور طاق حرم میں جلنے والی شمع کی روشنی بھی انہیں یاد آ رہی تھی۔ یہی تمام وجوہ ہیں جن کی وجہ سے وہ ایسا حسین سلسلہ منقطع کرنے کو تیار نہ تھے لیکن خاکسار کے اندر آپ کی لرزتی ہوئی آواز سننے کی تاب نہ تھی۔ چنانچہ سلام کے بعد فون رکھ دیا۔ اور آج یہ خبر ملی کہ سب سے عظیم علیگ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ایسے پیارے شخص سے اکثر فون پر دیروں تک دنیا بھر کی باتیں ہوتیں۔ لیکن ان باتوں میں دو باتیں وہ بھول جائیں یہ ممکن نہیں۔ ایک اپنے مادر علمی کی خیریت اور دوسرے ساکنان رامپور واہل علی گڑھ کے احوال جاننے کی ہزار خواہشیں۔

ذاکر صاحب ادیب، خاکہ نگار، مدیر، مزاح نگار، خدمت گار، اور ادارۂ سرسید کے پرستار سب کچھ تھے۔ لیکن ان سب خصوصیات کے ساتھ نمبر اول کے عاشق رسولؐ، اسی عشق رسولؐ نے آپ کی روح پروازی کے لیے ربیع الاول کے ماہ مبارک کو پسند کیا جس میں ظہور قدسی کا آغاز اور اختتام دونوں ہوا۔ اس ماہ مبارک میں آپ کا سانحۂ ارتحال آپ کے حب رسول پر پوری طرح سے دال ہے۔ حج کے تین سفر ناموں ایک میاں کی انٹریا تلے، مرحبا الحاج اور حدیث حرم کو لکھ کر عاشقین رسول کو ایسی روحانی غذا فراہم کی کہ اسے رہتی دنیا تک فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کی تحریروں میں ایسی روحانی کیفیت و مقناطیسیت ہے کہ قاری اس سحر سے خود کو آزاد نہ کر سکے، ''میاں کی اٹریا تلے'' پڑھئے تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو جائیں اور قاری پر لگا کر ہمیشہ کے لیے طیبہ کا ہو جائے۔ ذرا دیکھئے کہ شہر جلال سے شہر جمال کو جاتے ہوئے اپنے احسانات کو

کس ڈھنگ اور کس عقیدت سے پیش کیا ہے؟

''واقعی محبت کس کس انداز سے جلوہ گر ہے، اگر یہ کرم خصوصی نہ ہوتا تو نہ جانے کتنے کم نصیب اس افضل ترین نعمت اعلیٰ عبادت سے محروم رہ جاتے۔ اور اس نقصان کا احساس تک نہ ہوتا، اس دیار پر بہار دارالقرار کا تو ہر پتھر اور پتھر کا ہر ذرہ واجب تعظیم ہے۔ ہر مقام جبیں طلب ہے، لیکن پھر بھی چند مقامات گو کہ مجموعۂ انوار ہیں، فضلیت حاصل ہے۔ ان میں سب سے قریب جنت البقیع ہے۔ قبرستان اگر چہ ہر جگہ عبرت کا نمونہ ہے۔ اس لیے عام انسان بخوشی جانے سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن یہ نرالا قبرستان ہے کہ جس میں بڑی کشش ہے، بھر پور جاذبیت ہے۔ رحمت کی نمائش ہے، یہاں مرنے والوں کو ہی نہیں زندہ انسانوں کو بھی سکون ملتا ہے، جدھر دیکھو انوار کی چادریں پھیلی ہوئی ہیں اور پھر کیوں نہ۔ کیسی کیسی ہستیاں یہاں آرام فرما ہیں۔ حق کی موجوگی سے یہ عبرت کدہ سکون وراحت کدہ معلوم ہوتا ہے''

اسی طرح کی حلاوت وسلاست سے پوری کتاب مملوٗ ہے، یہی جاذبیت دوسرے سفرنامہ ''حدیث حرم'' میں ہے، ان دونوں کتابوں سے یہی مترشح ہے کہ ذات اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ کو کس درجہ تعلق تھا یہی تعلق اور یہی گرویدگی ان تحریروں میں موج زن ہے عقیدت وحمیت کا سماں آپ کے نعتیہ مجموعہ ''رخت سفر'' میں بھی جلوہ افروز ہے۔ شاعری کے لحاظ سے اسے کیا درجہ دیا جائے اس پر کچھ کہنے سے قاصر ہوں لیکن اتنا کہنے میں مجھے ذرہ برابر تامل وتردد نہیں کہ اس

کے ایک ایک شعر سے حب رسولؐ ہویدا ہے۔ ذاکر صاحب کو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی امیدیں تھیں۔

میں تشنہ کام ہوں بس اک نظر کا اے ساقی — نہ مجھ کو مینا کی حاجت نہ جام لایا ہوں

خطا شعار ہوں لیکن کسے خبر ذاکر — چھپا کے دل میں حمیت کا نام لایا ہوں

بناتے رہتے ہو بگڑی سبھوں کی اے آقا — مری بنی ہے، نہ بگڑی یہ کام لایا ہوں

لٹا کے جان و جگر جب نہ ہو سکی تسکیں — تو نذر کرنے کو آخر کلام لایا ہوں

ذات اقدس پر اسی فدائیت اور والہانہ وابستگی کی وجہ سے قسام اجل نے آپ کے لیے ''ماہ ربیع الاول'' کا انتخاب کیا اللہ سے دعا ہے کہ ایسے عاشق رسول کو خلد بریں عطا ہو، یہ سب درس گاہ سرسید کا فیض ہے کہ لوگوں کو ''آقائے نام دار'' کا شیدائی بنا دیتی ہے۔ یہ سب خطبات احمدیہ اور جلاء القلوب بذکر المحبوب (۱۹۴۲ء میں دہلی سے شائع ہوئی) کی کرشمہ سازیاں ہے۔ علامہ شبلی کی ''سیرت النبیؐ'' بھی انہیں سلاسل کا ایک سلسلۂ زریں ہے۔ یہاں وہ شمع فروزاں ہے جو لوگوں کے دلوں میں حب خدا اور حب رسول رچ دے۔

ذاکر صاحب ایک ایسے علیگ تھے جس پر ہر علیگ جان وتن سے فدا کیوں کہ آپ جس نے اپنی زندگی کا لحظہ لحظہ فکر سرسید کے نام لکھ دیا، تاحیات فانوس بن کر ''فکر سرسید'' کے محافظ رہے۔ آپ کی ہر آواز اور ہر ادا فکر سرسید کی ترجمان تھی۔ دوران طالب علی ہاکی کے ایسے کھلاڑی اور ایسے کپتان رہے کہ ہند اور بیرون ہند علی گڑھ کا جھنڈا گاڑ کر آئے، اپنی کتاب ''روایات علی گڑھ'' میں ہاکی کی ایسی داستان سرائی کی ہے کہ قاری اس میں گم ہو جائے، ویسے یہ کتاب ہی ایسی ہے کہ اس کے لفظ لفظ میں درس گاہ سرسید کی تصویر نظر آئے، یہ

ادارۂ سرسید کی انجیل ہے اس کے بغیر اس کی روایات رفتہ کو اس عہد انحطاط میں سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ ادارہ سرسید کے ایام شباب کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ یہاں کی تہذیب اور اعلیٰ مذاق اور ذہانت وفطانت کی عکاس ہے، اس کے بغیر یہاں کے ماضی کا نہ تو دیدار ممکن ہے اور نہ ہی اس پر اظہار خیال، آج ''روایات علی گڑھ'' کا مرتب ہم سے بہت دور جاچکا ہے۔ یہ ایک ایسا مینار اور ایک ایسا شاہ کار تھا کہ جس کے انہدام سے آج علی گڑھ برادری سوگ وار ہے۔

۱۹۴۹ء میں یہاں سے میں پاکستان گئے تو تسکین جاں کے لیے تصویر سرسید کو رفیق سفر بنایا، جس نے ہر دلدل سے نکالنے کا کام کیا، جرأت وشجاعت کا جذبہ ملا اور اپنی بات کے اظہار کا حوصلہ بھی۔ ۱۹۶۰ء میں علی گڑھ اولڈ بوائز کا قیام عمل میں آیا۔ ذاکر صاحب اولڈ بوائز کے بانی سکریٹری منتخب ہوئے۔ ایک طرف اپنی ملازمت اور دوسری طرف اولڈ بوائز لیکن دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے رہے۔ سرکاری ملازمت کے حقوق کی ادائیگی میں کوئی کمی رہ جائے یہ ناممکن ، واٹر بورڈ میں چیف انجینئر تھے پورا کراچی مٹھی میں، جو چاہتے کرتے لیکن کبھی ایک حبہ ناجائز جیب میں آیا ہو۔ یہ سوال ہی نہیں، ایک مرتبہ رشوت کا ذکر چلا تو خود فرمانے لگے سفیان! نیت خراب ہوئی ہو اللہ کے فضل سے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ پاکستان جانے کے بعد ابتدا میں مسائل ومصائب تھے لیکن نفس کو کبھی لڑکھڑانے نہ دیا۔ ہمیشہ اس پر قابو رہا، بڑے سے بڑے وزراء سے بھڑے لیکن پیروں میں لرزش آجائے یہ ممکن نہیں کیوں کہ انہیں منافقین کے متعلق قرآن کریم کا یہ فرمان یاد تھا ''وغرتکم الأمانی حتی جاء أمر الله وغركم بالله الغرور'' (اور تمہیں تمہاری فضول تمناؤں نے دھوکے ہی میں رکھا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آپہنچا اور تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ دینے والے نے دھوکہ ہی میں

رکھا) ایک بار ایک صاحب تشریف لائے اور انہوں نے درخواست کی کہ ان کے گھر کے سامنے ہینڈ پائپ لگا دیا جائے۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ یہ مفادِ عامہ کے لیے ہے اسے ہم پبلک پلیس پر ہی لگاتے ہیں، چنانچہ وزیر تک کی سفارش آئی لیکن اپنے مقصد میں ناکام رہے، ایک بار آفس میں آکر کہنے لگے ذاکر صاحب آج کی دنیا میں سب کچھ ممکن ہے بس جیب گرم کردی جائے، ذاکر صاحب کہنے لگے۔ سفیان! اس کے بعد تو آپے سے باہر ہو گیا اور جو آیا انہیں سناتا گیا اور ڈانٹتے ہوئے انہیں آفس سے باہر نکال دیا۔ یہ جذبۂ شجاعت انہیں اپنے مسقط الراس رامپور اور مادرِ درس گاہ سرسید سے ودیعت ہوا تھا۔

اسی طرح کہیں بڑے پروجیکٹ پر کام چل رہا تھا۔ حاسدین ذاکر اور خواستگاران رشوت نے مرحوم ذوالفقار علی بھٹو سے شکایت کر ڈالی کہ جو P.V.C Pipes لگنے تھے اس کی جگہ گھٹیا درجہ کا لگا کر ذاکر صاحب کمائی کر رہے ہیں، ایک دن اچانک بھٹو صاحب Inspection کے لئے آگئے، ان کے ساتھ انجینئرز کی ایک ٹیم تھی تمام چیزیں چک ہوئیں لیکن ایک چیز بھی طے شدہ چیزوں سے الگ نہ مل سکی، پھر تو بھٹو مرحوم نے بھی ذاکر صاحب کی پیٹھ تھپتھپائی اور انہیں اسی جگہ حاسدین کے سامنے امانت و دیانت کا پروانہ تھما دیا، ذاکر صاحب ہمیشہ اپنی ملازمت کے وفادار رہے۔ کبھی ایک کوڑی ہاتھ پر آجائے اس کا سوال ہی نہیں۔ اس کے باوجود اللہ نے انہیں بہت فراخی دی، اپنی فراخی اور خوش حالی کے متعلق ایک بار بتانے لگے کہ کسی طرح ایک قطعہ زمین لے لی۔ اسی زمین نے ہمیں مالا مال کر دیا۔ اسی زمین کو بیچ کر اپنا اور بھائی کا مکان بنوایا کچھ دنوں بعد یہ مکان فروخت کر کے دوسرا مکان خریدا اور کچھ روپے بینک میں ڈال دیئے۔ قلیل عرصہ بعد اسے بھی فروخت کر کے ایک نیا مکان بنایا اور دو پلاٹس لئے، اسی نئے مکان

میں ذاکر صاحب نے آخری سانس لی، ذاکر صاحب کے مال دار بنانے میں ان زمینوں کا خاصہ رول رہا۔

بات چلی تھی اولڈ بوائز کے قیام کی، اسے ایک مستحکم ادارہ بنانے اور توانا ایسوسی ایشن کی تعمیر میں ذاکر صاحب کا موثر رول رہا ہے، نظامی صاحب ہر جگہ ستون کام کرتے رہے۔ لیکن ذاکر صاحب نے کراچی کی علیگ برادری کو جوڑنے اور ان کے دلوں کو ملانے کا کام کیا۔ کبھی کوئی مسئلہ ہو، کبھی مسائل پر اختلاف ہوں تو اسے کافور کرنے کا کام ذاکر صاحب ہی کیا کرتے تھے ذاکر صاحب مانند شمع تھے۔ سینئر اور جونیئر سبھی آپ پر فدائی۔ محترم پروفیسر ابواللیث صدیقی سب سے بزرگ تھے لیکن وہ بھی ذاکر صاحب کو نہ صرف اپنی شفقتوں سے نوازتے بلکہ احترام بھی کرتے تھے، محترم مشتاق یوسفی صاحب ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ اولڈ بوائز کی تمام رونق ذاکر صاحب کے دم سے ہے، وہ تو غضب کے آدمی ہیں، کاموں سے تھکتے نہیں۔ کام ان سے تھک جاتے ہیں، اپنا آفس دیکھنا، اولڈ بوائز سنبھالنا، انشائیہ اور خاکے لکھنا، علی گڑھ کی تبلیغ کرنا، ہفتہ میں ایک دن علی گرھ والوں کو جمع کر کے ٹھٹھیں مارنا، ماہنامہ تہذیب۔ کو ترتیب دینا، سرسید یونیورسٹی کے بکھیڑوں سے نمٹنا اور پابندی سے ڈھیروں خطوط کے جواب دینا، آئے دن مختلف تقاریب میں تقاریر کرنا، شادی کارڈز لکھنا اور کتنے گھروں کے چولھوں میں آگ جلانا آپ کے دائمی فرائض تھے اور ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ ایک Sport man بھی تھے۔ ہندوستان میں رہے تو ہاکی میں کسی کو آگے نہ جانے دیا، اپنی مادر درس گاہ کو ہر جگہ فائز و فائق ہی رکھا، پاکستان گئے تو وہاں کے بڑوں میں بڑا نام کمایا، ان کا کہنا تھا کہ اسپورٹ ایک اسپرٹ کا نام ہے، یہ اسپرٹ جدھر پھر جائے کایا ہی پلٹ دے، اسی اسپرٹ نے انہیں

جانباز اور علامہ اقبال کا شاہن بنایا۔ یہ تو طے ہے کہ اگر ادارہ سرسید کے کھیلوں کی تاریخ رقم کی جائے تو اس کے ہیرو ذاکر علی خان ہی ہوں گے۔

اسی اسپرٹ کو لے کر جب ذاکر صاحب ۱۹۴۹ء میں پاکستان گئے تو وہاں علی گڑھ تحریک کے متعارف کرانے میں اپنی تمام طاقت اور اپنی تمام تر توجہ جھونک دی، اس کے لیے ۱۹۸۳ء سے پابندی کے ساتھ ماہنامہ تہذیب نکالا۔ اس کا کبھی ناغہ ہوا ہو یہ ممکن نہ ہوا۔ اس میں تحریک علی گڑھ پر مقالات ہوتے۔ علیگ برادری میں کسی کا انتقال ہو جائے تو اس پر تحریر ہوتی، علیگ برادری کے مضامین اس میں شائع کیے جاتے، اور اس کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس میں سرسید، بانیان علیگڑھ تحریک اور مختلف مواقع کی نایاب تصاویر اس میں شائع کی جاتیں۔ ہندوستان اور دنیا کے مختلف ممالک سے آنے والے علیگ کی تصاویر سے مزین ہوتا، علی گڑھ تحریک کے فروغ کے لیے ذاکر صاحب دامے، درمے، اور سخنے تیار ہے، ذاکر صاحب اور نظامی صاحب نے طے کیا کہ اب یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جائے، چنانچہ اس کے لئے کاروائی شروع ہوگئی معاملہ اسمبلی میں پہنچا اور جس دن یونیورسٹی کے قیام کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ اس دن کی تصویر کشی کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے بتایا کہ سفیان! ہم سب اسمبلی کے باہر یہ فیصلہ سننے کے لیے ایک پیر پر کھڑے تھے، ہم لوگوں کے ہاتھ رب کائنات کے حضور اٹھے ہوئے، نگاہیں آسمان پر تنی ہوئیں اور زبانیں بے تکان چل رہی تھیں جب اندر سے خبر آئی کہ سرسید یونیورسٹی کے قیام کا فیصلہ ہو چکا ہے تو ہم سب اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔ یہ تھی ذاکر صاحب وغیرہ کی علی گڑھ تحریک کے ساتھ وفاداری اور یہ تھی اپنی مادر علمی کے ساتھ اخلاص، ذاکر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ان دنوں گورنر مسیحائے ملت شہید حکیم محمد سعید تھے جن کے بھائی عبدالحمید پر کتاب ترتیب دیتے

ہوئے عابد رضا بیدار صاحب نے اس کا عنوان ''عبدالحمید: طبیب نہیں، حکیم'' سے موسوم کیا یہی عنوان حکیم محمد سعید مرحوم کی شخصیت کو بھی دیا جا سکتا ہے دونوں بھائیوں نے قومی بیداری اور قومی ارتقاء میں نمایاں رول ادا کیا، سرسید یونیورسٹی کے قیام میں حکیم محمد سعید صاحب کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے، اتنی مخالفتیں تھیں کہ یونیورسٹی کی تاسیس کا فیصلہ ہوتے ہوئے ممکن نہیں نظر آرہا تھا۔ لیکن حکیم صاحب کی حکمتوں اور ذاکر صاحب جیسے مخلصین کی ریاضتوں ۔نے اسے ممکن بنادیا۔

ذاکر صاحب کے کن کن محاسن ومحامد پر قصائد سنائے جائیں اس بحر بے بیکراں کی وسعتوں اور گہرائیوں کا ادراک ممکن نہیں، بس یوں جانئے کہ نادر روزگار یا دریتیم تھا علی گڑھ کے نام پر ذاکر صاحب پاگل ہوجاتے، یہاں سے کوئی ایرا غیرا چلا جائے اس کے لیے فرش راہ بن جاتے، اسے استقبالیہ دیتے، اس کی دعوتیں کرتے اس کے لیے کار کا انتظام کرتے اور اسے بار بار اولڈ بوائز بلاتے، تحائف سے اسے لاد دیتے، مولانا آزاد لائبریری کے لیے تہذیب کے شمارے اور اپنی کتابیں دیتے، اس کے علاوہ مختلف حضرات کے لیے خطوط اور اپنی تصانیف حوالہ کرتے۔ اگر کوئی علیگ پاکستان میں Job-Less ہے تو اسے ملازمت دلانے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ ہمارے پروفیسر جناب فضل الرحمٰن گنوری صاحب کراچی جاکر پریشان رہے تو خاکسار نے اس کا ذاکر صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے ایک پروفیسر کی حیثیت سے انہیں سرسید یونیورسٹی میں لگالیا اسی طرح خاکسار کی درخواست پر ایک صاحب کو اور لگایا ۔اپنے وطن رام پور سے جانے والوں کی بھی غیر معمولی مدد کی۔ چونکہ مدد کرنا اور چاک گریباں کی رفوگری آپ کے خون میں شامل تھی۔ ایسا محنتی، ایسا رفوگر اور

چارہ گر نہ دیکھا۔ جب پہلی مرتبہ ۱۹۸۵ء میں خاکسار کی آپ سے ملاقات ہو رہی تھی جب وہ محض ایک طالب علم تھا، بالکل گمنام اور مجہول و مستور، علی گڑھ کی دہائی دینے والے مرحوم انجم اعظمی کے ساتھ جناب اقدس میں حاضر ہوا تو رونق جناب کا حال نہ پوچھئے۔ بالکل گورا، خوبصورت کی مکمل تعریف، قد آسمانی لیکن غضب کی خندہ پیشانی، شلوار قمیص میں یہ فرشتہ، واٹر بورڈ کی چمچماتی ہوئی بلڈنگ میں جلوہ افروز، دیکھتے ہی چمٹا لیا جس طرح مرغیاں اپنے بچوں کو اپنے پروں میں چھپالتی ہیں، اس دن سے آخری سانس تک ذاکر صاحب کی شفقتوں سے پیہم سرفراز ہوتا رہا۔ سیکڑوں ملاقاتیں رہیں، پہلے تین تین ماہ کراچی میں رہتا اور ہر دوسرے تیسرے آپ کے اصرار پر خدمت اقدس میں حاضر رہتا۔ اگر گھر پر ہوتا تو فون کرتے کہ تمہارا لنچ پر انتظار رہے گا، گاڑی جا رہی ہے اس سے آجاؤ، یہ تھی ذاکر صاحب کی دارفتگی اور اپنوں سے اپنائیت اور مجھ جیسے مجہول الاسم کے ساتھ شفقت والفت کا یہ انداز بے مثال۔

ذاکر صاحب کی محبت کے کتنے قصے سناؤں، ایک بار ذاکر صاحب سے ذکر کیا دو چار شرٹز لینی ہیں اگر کسی صاحب کو میرے ساتھ کر دیں تو نوازش ہوگی، ایک صاحب لے کر گئے اور شرٹیں خریدی گئیں، آج سے دس سال قبل کا واقعہ، شرٹوں کی قیمت دس ہزار ہوئی خاکسار کی جیب میں ڈھائی ہزار تھے، اندر سے عجیب شرمندگی کہ آج ہندوستان کی مفلسی بالکل تشت از بام ہو جائے گی، لیکن اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا ڈھائی ہزار میں اپنا کام چلایا جائے۔ راہنما سب کچھ بھانپ گیا، اس نے کہا جناب کیوں اب پریشاں ہیں ذاکر صاحب نے روپئے دیئے ہیں، خاکسار نے کہا یہ کیسے ممکن ہے؟ میں کسی طرح راضی ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا، اتنے میں ذاکر صاحب سے شکایت کی گئی تو انہوں نے مجھے ایسی

ڈانٹ پلائی کہ ہوش ٹھکانے لگ گئے کیا ایسی محبت آج کی دنیا میں ممکن ہے۔ ہاں ممکن ہے اگر پکا علیگ ہو، اور ذاکر صاحب سے پکا علیگرین کہاں مل سکتا ہے؟ اس طرح کی متعدد مثالیں ذاکر صاحب کے یہاں مل جائیں گی، محترم پروفیسر سید محمد امین صاحب نے بتایا کہ مجھے بھی پانچ سو روپئے عنایت کئے گئے، ظاہر ہے محترم پروفیسر نہ تو حاجت مند تھے اور نہ کسی غربت کا شکار، ذاکر صاحب نے اپنے بڑے پن کا ثبوت دیا اور محمد امین صاحب نے اپنی صغرسنی کا، یہ روایت اسلام ہے جس سے روایات علی گڑھ کا گہرا رشتہ ہے، راحت ابرار صاحب کو بھی ایک سوٹ کا کپڑا عنایت کیا گیا خاکسار پر تو کچھ زیادہ ہی رحیم وکریم، ہمیشہ آپ کی نوازشوں سے گراں بار رہا آپ کی فیاضیوں سے سرفراز ہونے والوں کی ایک طویل فہرست ہے، ۲۰۰۸ء میں انہیں پہلے سرسید ایوارڈ سے نوازا گیا تو ساتھ میں پانچ لاکھ کی ایک رقم بھی پیش کی گئی جسے انہوں نے اپنی مادر علمی کے نادار طلبہ کے نام کر دی، اسی طرح میں جب امریکہ میں قائم شدہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے لائف ٹائم اچیومنٹ (Life Time Achivement) کے ساتھ جو انہیں ایک خطیر رقم دی گئی تو اسے بھی آپ نے اپنی مادر علمی کے نام سپرد کر دی۔ ذاکر صاحب اپنی علیگ برادری اور اپنی مادر علمی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔

پاکستان میں علی گڑھ تحریک کو متعارف کرانے میں ذاکر صاحب کو اولیت حاصل ہے، معاشرتی اور تعلیمی میدانوں میں اپنی فتوحات کے ساتھ ادبی میدان میں بھی اپنے جھنڈے بلند کئے، رشید احمد صدیقی کے بعد اگر کوئی بڑا نام ہے تو وہ ذاکر صاحب کا نام ہے جن کی تحریروں میں علی گڑھ کی برسات ہے، اس سلسلے میں ''روایات علی گڑھ'' کو نمایاں حیثیت حاصل ہے، یہ ایک ذریعہ ہے جس کے تعلق سے دور انحطاط میں علی گڑھ کے دور زریں کی تصاویر دیکھی جاسکتی ہیں،

اس کے علاوہ آپ کی دیگر تصانیف میں بھی مادر علمی کے جھونکوں سے مشام جاں کو معطر کیا جاسکتا ہے، ذاکر صاحب ایک مزاح نگار بھی تھے، جس کی جھلکیاں دیوان عام، برائے نام اور یادوں کے دسترخوان میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ اردو کے قابل ذکر مزاح نگاروں میں آپ کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ رام پور کے نوابین پر اس حوالے سے آپ کی ظرافت قابل ستائش ہے۔ ضرورت ہے کہ اس نقطہ نظر سے ذاکر صاحب کا مطالعہ کیا جائے۔ علی گڑھ نے تین مزاح نگار رشید احمد صدیقی، مشتاق یوسفی اور محمد ذاکر علی خاں پیدا کیے جنہوں نے ظرافت کی تاریخ بنانے میں اہم اقدامات انجام دیئے۔ ذاکر صاحب ادبی خدمات کا ایک روشن پہلو خاکہ نگاری ہے۔ اپنی والدہ کا خاکہ بڑے مؤثر اور دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ اس حوالہ سے تین تحریریں آسمانی درجہ کی حامل ہیں، قدرت اللہ شہاب نے ''شہاب نامہ'' میں اپنی ماں کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ اردو میں اس کی مثال مفقود تھی، لیکن حالیہ دنوں میں پروفیسر اطہر صدیقی نے اپنی والدہ محترمہ پر غضب کی تحریر پیش کی ہے۔ صدیقی صاحب کو صاحب طرز مصنفین میں شمار کیا جائے گا۔

مجھ نابلد اور غیر ناقد کا خیال ہے کہ قدرت اللہ شہاب اور صدیقی صاحب کی ماں سے متعلقہ تحریر یں ماسٹر پیس کا درجہ رکھتی ہیں اور ٹیگور کی اپنی ماں سے متعلقہ نظم بھی، فراق نے بھی اپنی ماں کو بہترین منظوم خراج پیش کیا اور مولانا علی میاں نے بھی اپنی ماں کی عظمتوں کو خوبصورت انداز میں قلم بند کیا ہے۔ انہی سلاسل کا ایک سلسلہ ''مائی باپ'' میں ذاکر صاحب کا اپنی ماں پر خاکہ ہے، قدرت اللہ شہاب اور ذاکر صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے لیکن صدیقی صاحب کا قلم روز بروز ایک نیا طلسم ہوش ربا تعمیر کرنے میں مصروف ہے، اللہ

ان کے قلم میں سمند کی برق رفتاری لائے اور انہیں صحت کاملہ سے نوازے۔ آپ کی معروف آپ بیتی ''میں کیا میری حیات کیا'' کے بارے میں رائے دینے سے قاصر ہوں لیکن اتنا طے ہے کہ ادارۂ سرسید کے اہم ترین اردو اساطین میں آپ کا نام نامی ضرور شامل ہوگا۔ چلئے بروقت اسے چھوڑیئے اللہ نے وقت دیا تو کسی وقت پروفیسر اطہر صدیقی کی شخصیت پر اپنے عاجزانہ احساسات کو قلم بند کروں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ صدیقی صاحب کو میری ٹیڑھی لکیریں کب پسند آنے والیں لیکن ''دھوپ چھاؤں'' جیسا اسلوب بے نظیر کہاں سے لاؤں؟ میرے دادا تو ایک کسان ٹھہرے، حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسا دادا جسے مل جائے، اسے صاحب طرز ادیب بننا جوئے شیر لانے کے ہرگز مترادف نہیں، بہرکیف کچھ تو بنا، خلیل الرحمٰن اعظمی کے والد محترم مولانا محمد شفیعؒ اور سرسید نہ ہوتے تو آج خاک چھانتا یا اپنی ندی ''کنور'' میں مچھلیاں پکڑتا اور اگر بہت بنتا تو کسی مکتب میں چھڑی لے کر نونہالوں کو پیٹتا اور انہیں قاعدہ بغدادی پڑھاتا۔

ذاکر صاحب کی ایک خصوصیت خطونگاری ہے، دنیا کے بے شمار لوگوں کو ذاکر صاحب پابندی سے خط لکھا کرتے تھے، انہیں خوش نصیبوں میں یہ احقر بھی ہے۔ اس کے نام سینکڑوں خطوط ہوں گے جو ۲۷ سالہ عرصے پر محیط ہیں، ان خطوط میں ذاکر صاحب کی شفقتیں، عظمتیں اور علی گڑھ کی قدریں فروزاں ہیں۔ ذاکر صاحب کے بہت سے مکاتیب خود ان کے پاس بھی موجود تھے۔ علی گڑھ میں نواب ابن میاں، مہر الٰہی ندیم، اصغر عباس، راحت، ابرار اور خاکسار کو خطوط لکھا کرتے تھے اگر انہیں جمع کر کے شائع کر دیا جائے تو مزے کی چیز ہوگی، انشائیہ اور مزاحیہ ادب کی شان دوبالا ہوئے گی۔

ذاکر علی گڑھ کی کتنی نغمہ سرائی کی جائے، مثالی علیگ تھے، ادیب، ظریف اور حبیب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شیدائی عمیق تھے، اسے مرحوم کہنا سراسر ناانصافی ہے۔ وہ اپنی تحریروں، خاکوں، مزاحیہ مضمونوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا، ارسطو، امرء القیس، معری، ابن سینا، افغانی، ٹیگور، سرسید، علامہ اقبال اور رادھا کرشنن کیا زندہ نہیں ہیں؟ کیا ان کے راگ الاپے نہیں جاتے؟ اسی کہکشاں کے ایک تابندہ ستارہ ذاکر صاحب ہیں، انسان کا مادی وجود فکری وجود کے بالمقابل بے معنی ہے، ذاکر صاحب کے افکار واذکار انہیں کبھی طاق نسیاں کے سپرد نہ ہونے دیں گے۔ فکر لافانی ہے، ہمیں پکا یقین ہے کہ ذاکر صاحب اخروی حسنات سے ضرور سرفراز ہوں گے، عیال اللہ کا دم بھرنے والے کی ضمانت خود اللہ نے لی ہے ذاکر صاحب کا سب سے بڑا اخراج عقیدت یہ ہے کہ ان کے منہاج زندگی کو اپنا لباس زندگی بنانے کی سعی کی جائے۔

ذاکر علی گڑھ

ابوسفیان اصلاحی

شاعر، ناقد اور رشید احمد صدیقی کے شاگرد انجم اعظمی سے کون واقف نہیں جن کی رگ وپے میں سرسید اور تحریک علی گڑھ سمایا ہوا تھا، جن کی زندگی کی اولین خواہش علیگ بھائیوں کی رفاقت ومصاحبت تھی۔ ۱۹۸۵ء میں جب اعظمی صاحب سے ملاقات ہوئی تو دن دن بھر کراچی کے علیگ بھائیوں اور سرسید کے سپوتوں سے ملواتے۔ ایک روز ایک خوبصورت سی بلڈنگ میں چمچماتے ہوئے کمرے یا یوں کہئے بقعۂ نور میں ایک حسین وجمیل، دراز قد اور بارعب وباوقار انسان کے پاس مجھے لے کر بیٹھ گئے، رنگ اتنا سپید کہ چاند بھی شرما جائے، غالباً ابن انشاء نے شاید اسی وجیہ وشکیل کے لئے کہا تھا ؎

کل چودھویں کا چاند تھا، شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نہ کہا چاند ہے، کچھ نے کہا چہرہ ترا

میں مستقل اس کی خوبروئی میں گم، ٹائی اور سوٹ میں غضب کی سلیقہ مندی، اس پرکشش شخصیت کے سبب ٹائی اور سوٹ میں بلا کی جاذبیت، پیشانی کی کشادگی سے اس کی قائدانہ صلاحیت کی غمازی، ہر لفظ اور ہر جملے سے مسکراہٹوں کی وابستگی، طبیعت میں ایسی ظرافت کہ غالب بھی ماند پڑ جائیں۔ ملنے والوں کا لامتناہی سلسلہ لیکن استقبال میں وارفتگی، وہی نشاط اور وہی دل میں جاگزیں ہو جانے والی مسکراہٹیں، اس کی محفل میں شام اودھ اور صبح بنارس دونوں کا سماں اور مجھ جیسے عربی کے طالب علم کے نزدیک سوق عکاظ کی رونق، اس شخص

کی محفل تو اس مے خانے کے مانند ہے جس کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا، ہر آن وہی قلقل مینا اور وہی جام وساغر کی کھنک۔ آپ سوچ رہے ہوں گے "اللہ جانے کون بشر ہے؟" تو سنئے اس بشر کا نام محمد ذاکر علی خاں ہے۔

یہ وہی ذاکر علی خاں ہیں جن کی ہر سانس سر سید اور تحریک سر سید سے ہو کر گزرتی ہے، جن کے نزدیک ادارۂ سر سید کی زیارت کارِ ثواب ہے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شہر سر سید کا عشق دنیا کے تمام جھمیلوں سے بے نیاز کر دیتا ہے، یہی عشق اس کی زندگی، یہی عشق اس کا مستقبل اور یہی عشق اس کی تاریک راہوں کا سراج منیر۔ یہ عشق ہی ہے کہ آپ کی گردن پر مادر علمی کا مونوگرام "علم الانسان مالم یعلم" سجا ہوا ہے۔ یہ وہ سجاوٹ ہے جو انسان کو تمام سجاوٹوں سے مستغنی کر دے۔ ذاکر صاحب کی محفل کی بسم اللہ علی گڑھ سے اور اس کا اختتام بھی علی گڑھ پر، یہی وجہ ہے کہ مشیت ایزدی نے انہیں "ذاکر" سے موسوم کیا تا کہ ذاکر علی گڑھ بن سکیں اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس ذکر جمیل کو عام کر سکیں، اگر ماضی میں رشید احمد صدیقی کو "علی گڑھ کا مغنی" کہا گیا تو بڑے اعتماد کے ساتھ انہیں "ذاکر علی گڑھ" کہا جا سکتا ہے۔

مادر علمی سے محبت اور فکر سر سید سے تعلق ہی کی بنیاد پر علیگ اور علی گڑھ سے جانے والے طلبہ، اساتذہ اور خدام کا اس جوش وجذبے کے ساتھ استقبال کرتے ہیں کہ اس کی مثال مشکل سے ملے۔ علی گڑھ کا کوئی مل جائے تو مادر علمی کی ایک ایک چیز کو کرید کرید کر پوچھنا اور اس کی ایک ایک بات کو نہاں خانہ قلب میں محفوظ رکھنے کی ہر کوشش اور ہر سبیل اور ایک سوال لازمی ہوگا کہ ہاکی کا کیا حال ہے؟ احوال جان کر مایوسی، اس مایوسی میں دوبارہ ہاکی گراؤنڈ پر اتر جانے کا عزم۔ ذاکر صاحب ہاکی کے کپتان رہے اور اس کپتان نے نہ جانے کتنی

فتوحات حاصل کیں، افغانستان تک میں جا کر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑے۔ ذاکر صاحب کو ہاکی کا صلاح الدین ایوبی کہا جائے تو ہرگز مبالغہ نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہماری ٹیم نے مادر وطن کی ٹیم کو بھی شکست سے دوچار کیا۔

ذاکر صاحب ۱۹۴۹ء میں پاکستان گئے تو زادراہ میں تصویر سرسید، فکر سرسید اور روایات علی گڑھ تھیں، وہاں جا کر واٹر بورڈ کے سربراہ منتخب کئے گئے، یا یوں کہئے کہ عروس البلاد کراچی کے ساقی نام زد کئے گئے لیکن ذاکر صاحب جسمانی پیاس بجھانے کے ساتھ ساتھ روحانی پیاس بھی بجھاتے رہے۔ کراچی میں ان کے پاس دولت وثروت اور منصب و منزلت سب کچھ ہونے کے بعد بھی کچھ نہ تھا کیونکہ ایسا کوئی پلیٹ فارم نہ تھا جہاں تصویر سرسید کی نمائش کرتے، کوئی ایسا ادارہ نہ تھا جہاں فکر سرسید کی معنویت بیان کرتے چنانچہ لامتناہی تدبیر و تجویز اور احباب علی گڑھ کی انتھک کوششوں سے اولڈ بوائز کراچی کا قیام عمل میں آیا جہاں بڑے تزک واحتشام سے تصویر سرسید کو آویزاں کیا گیا۔ ایک عرصے کے بعد مل بیٹھ کر ترانۂ علی گڑھ کو سنا گیا، فکر سرسید کی ترویج وتشہیر کے لئے ۱۹۹۳ء میں سرسید انجینیر نگ اینڈ ٹکنالوجی کالج کا قیام عمل میں آیا اور روایات علی گڑھ کی اہمیت وافادیت کو عام کرنے کے لئے ''روایات علی گڑھ'' تحریر کی گئی۔ یہ واحد کتاب ہے جس میں روایات علی گڑھ کو خاص رنگ وآہنگ، لطیف لب ولہجے اور حسین سے حسین تر زبان وبیان میں پیش کیا گیا، اس کی ہر سطر کوثر وتسنیم میں نہائی ہوئی، لفظ لفظ صبح صادق، روایات علی گڑھ جوئے اخلاص کا مکمل نمونہ اور اس کے پڑھنے میں بلا کی حلاوت اور ایسا قرار جاں کہ بیان کرنے سے نہ بیان ہو کیونکہ اس میں دماغ نہیں، دل ہے، سوچ نہیں، عقل ہے اور عقل نہیں، جنون ہے۔ ایسے جنون صفت ذاکر علی گڑھ کو یوں سنئے:

''اب جہاں تک یونیفارم کا تعلق ہے تو یہ حیران کن حقیقت ہے کہ کالا رنگ بالعموم سوگ وغم کی علامت سمجھا جاتا ہے لیکن کالی شیروانی خود پہنو یا پہنے دیکھو تو مسرتوں کے چشمے ابل پڑتے ہیں، پھر یہ رنگ بھی تو کالی کملی والے کا من پسند ہے، اسکو تو سب پر غالب آنا ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں سیاہ شیروانی کے مراتب بلند سے بلند تر ہوتے جارہے ہیں۔ اس کا کمال ملاحظہ ہو کہ اسے اولڈ پہنے تو ینگ نظر آئے اور ینگ پہنے تو ترنگ بھرنے لگے، اس لباس معتبر ومفتخر کی مقبولیت کی معراج دیکھئے کہ آج اس کا شمار ہندوستان اور پاکستان دونوں کے Official Dress (سرکاری لباس) میں ہوتا ہے۔ اس طرح شبہات وسازشوں کا شکار، اکثر برسر پیکار دونوں مملکتوں میں سیاہ شیروانی اتفاق اور یگانگت کی علامت نظر آتی ہے۔ یہ ایسی امتیازی شان ہے کہ جو کسی اور پوشاک کو نصیب نہیں''۔

پاکستان، بالخصوص کراچی کے علیگ بھائیوں کو جوڑ کر ان سے کام لینا کارِ دشوار است لیکن اللہ نے انہیں خوب مردشناسی کی صلاحیت سے نوازا ہے۔ یہ بھی توفیق ایزدی ہے کہ لوگوں میں ان کی زبردست following ہے۔ علیگ برادری اور دیگر حضرات ان سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ اس بار جب ہندوستان اور اہل رام پور، مادر علمی اور شاہ جہاں کی دہلی کی جانب سے ان پر عقیدت ومحبت کی بارشیں ہونے لگیں، ان کی باتیں سننے کے لئے ہر شخص ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا، مادر علمی کے نام ور اساتذہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر مسعود الحسن، پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری اور پروفیسر اشتیاق احمد ظلی جب ان کی خدمات کو سلام کرتے ہوئے سپاس نامے پیش کررہے تھے تو مجھ سے جذبۂ شکر الٰہی سے معمور ہو کر فرمانے لگے اللہ نے لوگوں کے اندر میری محبت سرایت کردی

ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب مادر علمی میں قدم رکھا تو یونیورسٹی میں ایک ہلچل مچ گئی۔ مجھ سے سڑکوں پر، فون پر اور ڈیپارٹمنٹ میں پوچھا جارہا ہے ذاکر صاحب تشریف لائے ہیں؟ اولڈ بوائز کراچی کے سکریٹری آئے ہوئے ہیں؟ کیا یہ وہی ہیں جنہوں نے ''روایت علی گڑھ'' تصنیف کی ہے؟ کیا یہ ''مائی باپ'' کے مصنف ہیں'' کیا یہ وہی ہیں جنہوں نے ''اٹریا تلے'' اور ''مرحبا الحاج'' میں سرور کائنات ﷺ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے؟ یہ وہی ذاکر صاحب ہیں جنہوں نے ''رخت سفر'' میں اپنے عشق رسول کو منظوم شکل میں ترتیب دیا ہے؟ اور کسی کا سوال یوں تھا کہ ۱۹۸۳ء سے ''تہذیب'' یہی نکال رہے ہیں؟ بہر کیف ان کی متنوع خدمات اور شخصیت کی رنگارنگی کے سبب ہر شخص کے یاد کرنے اور اپنے محبوب کو پکارنے کا الگ الگ طرز ہے۔

یہ مقبولیت اور یہ ہر دل عزیزی صرف ان کے اخلاص اور فکر سرسید سے جذباتی لگاؤ کی بناء پر ہے۔ علی گڑھ اولڈ بوائز کے قیام سے آج تک مستقل روزانہ اولڈ بوائز کے دفتر آنا، اسّی سالہ ہونے کے باوجود گیارہ بجے سے شام چار بجے تک بیٹھے رہنا، تحریک علی گڑھ کی توسیع وتعمیر میں لگے رہنا، علیگ بھائیوں کے مسائل کو سننا اور جیب خاص سے ہر روز دو تین سو خرچ کرنا آپ کا معمول ہے۔ چنا آپ کی میز کا جزء لاینفک، رہ رہ کر چنے سے لذت کام ودہن کا شغل۔ ایک تو چنا علی گڑھ کی تہذیب کی علامت اور دوسرے غالباً اورنگ زیب کے ان فرمودات کو ذاکر صاحب نے پڑھ لیا ہے جس میں انہوں نے اپنے مقید والد محترم سے کہا تھا کہ تین چیزیں قید میں آپ کے مرضی پر منحصر ہوں گے (۱) رہائش کا انتخاب خود کریں گے (۲) شغل آپ کی من پسند ہوگا (۳) اور غذا میں صرف ایک اناج کو چننا ہوگا۔ رہائش کے لئے شاہ جہاں نے کہا کہ میرا کمرہ وہاں ہو

جہاں سے میں تاج محل کو دیکھ سکوں، مصروفیت کے لئے بچوں کو پڑھانا پسند کروں گا، اورنگ زیب سمجھ گیا، کہنے لگا ابو جان! اب بھی آپ کا تحکمانہ مزاج برقرار ہے، عوام الناس کے بجائے بچوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ تیسرے اناج کے سلسلے میں باورچی سے مشورہ کرکے بتاؤں گا، جب شاہ جہاں نے اپنے باورچی سے پوچھا تو اس نے کہا کہ چنا مانگ لیں کیونکہ چنا سے دال، روٹی، حلوہ اور چھولے کے علاوہ نہ جانے کیا کیا چیزیں تیار کی جاسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے جس کی بناء پر چنا روایات علی گڑھ کا حصہ اور ذاکر صاحب کی مرغوب غذا بنا ہوا ہے۔

مادر علمی سے آئے ہوئے مہمانوں کے لئے آفس کا چنا، چائے اور بسکٹ وغیرہ ناکافی سمجھتے ہیں، انہیں لے کر ''جیم خانہ'' براجمان جہاں کراچی کے Aristocrats کی گہما گہمی ہوتی ہے۔ مجھے لے کر گئے تو اس کا حسین سماں بالکل جنت نشاں، حسین چہرے جیسے آسمان کی حوریں (حور عین: گوری گوری آہو چشم عورتیں) یا جنت کے موتی کے مانند غلمان (کانھم لؤلؤ مکنون: ایسے خوبصورت جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی)۔ اسکی زیب و آرائش، خوبصورت اور شاداب لان، پھولوں کی خوش بو اور رنگت بے مسحور ہوا کہ اس کا اثر جانے کو رہا۔ ان سب چیزوں پر بھاری ذاکر صاحب کے بول، سفیان اور لو، علی گڑھ والے تکلف نہیں کرتے، ہاتھ صاف کرتے ہیں، کھاتے رہے، بے کانٹوں کی مچھلیوں کا مزہ لیتے رہے لیکن یہاں بھی وہی علی گڑھ، وہی شہر آرزو کا ذکر۔ فرمایا ''کیفے لیلا'' کا مزہ کہاں؟ اس کی تو بات ہی کچھ اور تھی، اس کا تو انداز ہی کچھ نرالا تھا، ایسی مٹری اور اب ایسے نمک پارے تو بس خواب وخیال میں اور برفی میں ایسی غضب کی شیرینی اور طراوت کہ اندر تک اتر جائے۔

کراچی پہنچتے ہی انہیں فون کرتا تو خیریت دریافت کرنے کے بعد

فرماتے کب آرہے ہو؟ اگر کچھ لیٹ ہوجاؤں تو وہی علی گڑھ اولڈ بوائز آفس آنے کا حکم، حکم میں محبت، شفقت اور روایات علی گڑھ کی آمیزش، پہنچتا تو مصافحے کے بعد گلے سے چپکا لیتے، اس میں ناقابل بیان راحت وسکون محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی شفقت کا انجکشن پیوست کررہا ہو۔ کراچی پہنچنے کے بعد ذاکر صاحب کی خواہش ہوتی ہے کہ دن آفس ہی میں گزاروں۔ اگر دو تین دن لیٹ ہوجاؤں تو فون پر طلب کرتے اور آنے کا وعدہ لیتے۔ سوچئے آسمان کی زمین سے کیا نسبت؟ اپنے ملک کے صدر محترم اور مکرم وزیر اعظم سے ملنے والے کے ساتھ میرا کیا جوڑ؟ پروالوں کا بے پروالوں سے کیا رشتہ؟ ''پروالے اڑے جاتے ہیں، بے پر کا خدا حافظ'' والی بات تو بہت قدیم ہے لیکن اس شخص کا تعلق تو اس کتاب سے ہے جس نے اعلان کیا ہے ''لقد کرمنا بنی اٰدم'' (یقیناً ہم نے بنی نوع انسان کو معزز و مکرم بنایا ہے) اور یہ ذات تو اس انسان کامل سے وابستہ ہے جس نے اعلان کیا تھا کہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر اگر کوئی فضیلت ہے تو صرف تقوے کی بنیاد پر۔ یہی معیار و میزان ہے جس نے ذاکر صاحب کو انسانوں سے محبت کرنا سکھایا، جس نے معیار دنیوی کو باطل قرار دینا بتایا اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہم کہتروں سے محبت کی۔

ذاکر صاحب کے متوسلین بخوبی واقف ہیں کہ وہ سنیچر کو اولڈ بوائز آفس میں آنے کی ضرور دعوت دیتے ہیں، اس دن علیگ بھائیوں کی پینٹھ لگتی ہے، جو اپنی رونق میں جاہلی دور کے عربوں کے میلہ سے کم نہیں۔ کھانے پینے کا انتظام، مختلف شعراء کی غزلوں کی سماعت، پرانی غزلوں کے ریکارڈز کا بجنا اور ان پر علیگ برادری کا لہالوٹ ہونا، پوری طرح سے غزل کو اپنے اوپر طاری کرلینا، کچھ خاموشی ہوئی تو گالیوں کا تبادلہ، یہ گالیاں کیا بس وہی غالب کا شعر:

کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

اس مجلس میں ایک شخص سب سے ممتاز، سب کی توجہ کا مرکز، اپنی نورانیت سے سب کو مستفیض کرنے والا، سب سے نکلتا ہوا، اس کی باتوں پر ہر شریک محفل گوش بر آواز، میر محفل، میر محفل کی تمام خصائص وعلائم سے متصف، اپنے ذاکر صاحب کے علاوہ کون ہوسکتا ہے؟ ایک مرتبہ کراچی گیا ہوا تھا، ایک صاحب کو مصحف کی ضرورت تھی، انہوں نے فرمایا کہ اب کی جانا تو میرے لئے تاج کمپنی کا شائع کیا ہوا قرآن کریم لے آنا۔ میں کراچی سے واقف نہیں، ذاکر صاحب سے ذکر ہوا تو انہوں نے کہا تم کہاں جاؤ گے؟ ایک صاحب کو بھیجا اس حکم کے ساتھ کہ سب سے بہتر مطبوعہ مصحف لے کر آؤ، لے آئے۔ دیکھتے ہی طباعت سے آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی۔ ہدیہ جاننے اور پیش کرنے کی ہزار ہا جتن کئے لیکن کسی طرح تیار نہیں، بولے: کیا تم کتاب الٰہی کے تئیں حقیر سی خدمت انجام دینے نہیں دو گے۔ یہ سن کر کیا بولتا؟ ویسے بھی ایک بزرگ علیگ کے حضور یہ جرأت بے جا میں شمار ہوگا۔ یہ تو صرف ایک واقعہ ہے، اس قبیل کے نہ جانے کتنے واقعات اس عظیم شخص سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ حکیم محمد سعید صاحب (شہید) کی لائبریری ''بیت الحکمت'' میں ذاکر صاحب کی شاداب تصویر آویزاں ہے۔ حکیم صاحب سے اس کے لگانے کی وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا کہ ایسے لوگوں کو دیکھ کر Inspiration ملتا ہے، کچھ کر گزرنے اور تاریخ بنانے کا حوصلہ بھی۔ یہ سچ ہے کہ ذاکر صاحب نے شخصیت سازی اور تاریخ سازی میں ناقابل فراموش باب رقم کیا۔

انسانیت کی ایک دوسری مثال یوں سنئے کہ میں نے کراچی ہی میں

انہیں فون پر بتایا کہ میرا بیٹا فرحان سفیان XI کے ٹسٹ میں کامیاب ہو گیا ہے۔ یہ سنتے ہی فون پر اسے دعائیں دیں، مجھے دوسرے دن ہندوستان کے لئے روانہ ہونا تھا، دیکھا فون کے ڈیڑھ گھنٹہ بعد آفس کا ایک آدمی چلا آرہا ہے، ایک پیکٹ تھمایا جس میں نہایت مہنگا پارکر اور کافی گراں چاکلیٹ۔ میں نے کہا کہ آج بھی اچھے لوگوں سے دنیا خالی نہیں، ہم حسادکو اپنے عہد کے حاتم کہاں نظر آتے ہیں؟ بہر کیف شکریئے کے لئے فون کیا کہ یہ سب آپ نے کیوں زحمت کی؟ بولے زحمت! یہ سب تم کیا کہہ رہے ہو؟ سمجھ سے باہر کی بات ہے۔ یہ سب کچھ تم میرے پاس ہونے والے پوتے فرحان کو دے دینا۔ اسے دیتے ہوئے بتایا کہ تمہاری کامیابی پر ذاکر صاحب کی طرف سے تحفہ ہے تو وہ پھولا نہ سمایا کیونکہ اسے کافی کچھ ذاکر صاحب کے بارے میں معلوم تھا۔ اکثر ہمارے گھر میں ذاکر صاحب کا ورد چلتا رہتا ہے اور کیوں نہ چلے، جب ایسے ورد سے بام و در معطر اور دل کے غم کافور ہو جائیں اور اس ذکر جمیل سے گھر میں تابانی و تنویر کے قافلے اتر آئیں۔

ذاکر صاحب کی علی گڑھ اور انسانوں سے محبت کی ایک مثال اور ملاحظہ فرمائیں۔ یہ بات کوئی چھ سال قبل کی ہوگی، ذاکر صاحب کا حکم ہوا دیکھو اس تاریخ کو میری بھانجی کی شادی ہے، تمہیں اس میں ضرور آنا ہے۔ میں نے ہاں کرلی، اگر فرشتوں کی طرف سے بلاوا ہو تو کون ہاں کرنے سے رک سکتا ہے؟ متعینہ تاریخ پر حاضر ہوا تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے شادی کہوں یا علیگ برادری کا اجتماع۔ استقبالیہ پر ذاکر صاحب ایستادہ، مجھے دیکھتے ہی ان کے اندر برقی لہر دوڑ گئی، صرف اس لئے کہ ادارۂ سرسید میں استاد ہوں ورنہ مجھ میں کوئی خاص بات نہیں۔ ادارۂ سرسید کا ذرہ ذرہ انہیں عزیز، اس کی ہر چیز سرمایۂ حیات سے بلند تر، مجھے بغل میں دبائے دبائے مختلف ٹیبل پر جا رہے ہیں، تعارف میں

سب سے یہی جملہ ''آپ کے لئے علی گڑھ سے تحفہ لایا ہوں''۔ ہر شخص علی گڑھ کا نام سن کر جذباتی ہو جاتا، میرے سر پر شفقتوں کے ہاتھ رواں ہو جاتے اور احوال علی گڑھ کی سماعت کے لئے بے قرار۔ تقریباً نصف گھنٹہ مجھے لئے لئے اجتماع میں طواف کرتے رہے۔ طفل مکتب کے ساتھ محبت کا یہ اظہار صرف اس لئے ہے کہ میرا تعلق ذریت سید گھر والا سے ہے۔ اس خاندان کا ہر فرد اپنے فرد کے لئے ہر طوفانِ بلا سے گذر جانے کے لئے تیار رہتا ہے اور اس خاندان کی روایات کا نہ صرف امین بلکہ اس کی ترسیل و تبلیغ کے لئے جان و دل سے کمر بستہ۔

اسی فریضے کے احساس نے نظامی صاحب، ذاکر صاحب اور ان کے رفقاء کرام کی مجبور کیا کہ پاکستان میں ایک ایسے ادارے کی بنیاد ڈالی جائے جس میں جدید تعلیم کا نظم و نسق ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ نظامی و ذاکر کی نا قابل تصور کاوشوں اور علیگ بھائیوں کی اجتماعی جدوجہد سے سرسید یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ بالعموم اس کے متعلق یہ خیال ہے کہ یہاں نری انجینیر نگ اینڈ ٹکنالوجی کی تعلیم دی جاتی ہے جب کہ یہ خیال مناسب نہیں، یہاں اسلامیات، مطالعات پاکستان اور مطالعات سرسید پر بھی اساتذہ خاصی توجہ صرف کرتے ہیں، طلبہ و طالبات کے اندر روایات علی گڑھ سے دلچسپی پیدا کرنے کی ہر سبیل اختیار کی جاتی ہے، سرسید کی اہمیت و معنویت سے انہیں آگاہ کرنے کے لئے اساتذہ بڑے انہاک کا ثبوت دیتے ہیں۔ آج یہ یونیورسٹی دنیا کی معیاری یونیورسیٹیز میں شمار کی جاتی ہے، اسے معروف اساتذہ کی خدمات حاصل ہیں۔ طلبہ اور اساتذہ کو انجینیر نگ کی نت نئی تحقیقات اور جدید اکتشافات سے باخبر کرنے کے لئے ریسرچرز کو لکچرز کے لئے مدعو کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ اسلامیات، ادبیات اور ماہرین سرسید کو بھی خطبات کے لئے زحمت دی جاتی ہے۔ اس

یونیورسٹی کی تعمیر و ترقی میں ذاکر صاحب وغیرہ نے اپنی تمام تر صلاحیتیں جھونک دیں یا یوں کہئے کہ سرسید نے اپنے سپوتوں کو جو ذمہ داریاں سونپی تھیں ان کی تکمیل کے لئے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دیں۔

ذاکر صاحب کی ادبی خدمات اور تصنیفی کارناموں سے دنیائے اردو جگمگا رہی ہے۔ ادارۂ سرسید نے رشید احمد صدیقی، مشتاق یوسفی اور مختار مسعود کو پیدا کر کے محبین اردو پر ناقابل فراموش احسانات کئے، دانش گاہ علی گڑھ نے اردو کو سنوارنے اور اسے علم و تحقیق کی زبان بنانے میں ایسے ایسے سنگ ہائے میل قائم کئے کہ جن کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ مذکورہ شخصیات کی ایک زندہ و جاوید کڑی محمد ذاکر علی خاں ہیں، خاکہ نگاری، انشائیہ، مزاحیہ، اسفار نویسی اور کالم نگاری میں ایسے تابندہ نقوش ثبت کئے اور ثبت کئے جا رہے ہیں جو ہمیشہ ادب دوستوں کے لئے منارۂ نور رہیں گے۔ رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی کے بعد دانشگاہ علی گڑھ میں ذاکر صاحب کا تیسرا نام ہے جنہوں نے فکاہیہ ادب میں ایک نئی راہ نکالی ہے۔ الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات کی صنعت گری پر آپ کی گہری گرفت ہے، لفظوں کے موقع و محل اور ان کے بواطن سے بخوبی واقف، اگر ان خصائص اور انسانی نفسیات سے مزاح نگار ناواقف ہے تو اس کی تحریر تاثیر سے عاری ہوگی۔ ذاکر صاحب کی تحریروں میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ تحریر میں ایسا سبک پن، ایسی شستگی اور شگفتگی اور ایسی رعنائی و دل کشی کہ قاری خود فراموشی کا شکار ہو جائے۔

ذاکر صاحب کی تخلیقات میں کئی چیزیں شامل ہیں۔ ایک تو آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ۱۹۸۳ء سے نہایت پابندی کے ساتھ ماہ نامہ ''تہذیب'' آپ کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے جس کا مقصد سرسید کے افکار

ونظریات کی اشاعت، علی گڑھ سے متعلق بے شمار اہم دستاویز اور قدیم نایاب تصاویر اس میں شائع ہوئیں، ایک خاص چیز یہ ہے کہ قدیم ترین علیگ برادری کے تأثرات اس کے صفحات کی زینت بنتے ہیں، شکاریات سے متعلق دلچسپ تحریریں منظر عام پر آئیں، یہ سب ادبی اور علمی کارنامے صرف ذاکر صاحب کی توجہات کے رہین منت ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بآسانی مادیات کو بٹور سکتے تھے لیکن انہوں نے اثنائے ملازمت اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ سبک دوشی کے بعد صرف تعلیمی مشن ہوگا، سرسید کے خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے کے لئے طوفانِ نوح کو گلے لگانا ہوگا، چونکہ ذاکر صاحب ایمان براہیمی سے سرشار ہیں اس لئے آتش نمرود میں کود جانا ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔

آپ کا دوسرا اہم کارنامہ "روایت علیگڑھ" ہے جس کا ذکر مضمون کے ابتدا میں ہو چکا ہے۔ اس کتاب پر ہند و پاک کے معتبر ناقدین اپنی آراء کا اظہار کر چکے ہیں، اسے بیسویں صدی کے ان چند ادبی کارناموں میں شامل کیا جائے گا جس کی وجہ سے زبان وادب کو استحکام نصیب ہوا، نیز اس طرح کے خوش گوار اور مستند اضافوں سے زبانیں برگ وبار لاتی ہیں اور قارئین کے ذہنوں میں نئی امنگ اور نئی ترنگ پیدا ہوتی ہے۔ روایت علی گڑھ میں ذاکر صاحب کا اندرونی انسان پوری طرح سے ظاہر وباہر ہے۔ سرسید سے اخلاص، مادر علمی سے اٹوٹ رشتہ اور روایات علی گڑھ سے گہرے ارتباط کی ایسی مثالیں مفقود ہیں۔ آپ کی ہر آن اور ہر بان علی گڑھ کے بغیر پوری ہی نہیں ہوتی۔ غیر علیگ اگر اس کتاب کو پڑھے تو علی گڑھ، اس کی روایات اور اس کی سرگرمیاں اس کی نظروں کے سامنے ہوں گی۔

ذاکر صاحب ایک ادیب، انشائیہ نگار اور مزاح نگار کے ساتھ ساتھ

ایک عاشق رسول بھی ہیں جو عشق آپ کے ایمان وایقان پر پوری طرح دال ہے، صوم وصلوٰۃ کے حد درجہ پابند۔ میں نے بچشم خود مشاہدہ کیا ہے کہ جہاں نماز کا وقت ہوا مشیت ایزدی کے حضور دست بستہ ہوئے، اولڈ بوائز کے آفس میں نماز ظہر کی ادائگی کرتے ہوئے بارہا دیکھا، ان کی نمازیں خشوع وخضوع کا آئینہ دار، ہاتھ باندھتے ہی تضرع کا مکمل نمونہ، پروردگار سے محو کلام اور سرگوشیاں، دنیا سے انقطاع اور خداوند قدوس میں جذب ہونے کی پوری کوشش۔ ایسے ہی نیک بندوں کی ترجمانی قرآن کریم میں اس طرح کی گئی ہے۔

ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین

میری نمازیں، میری قربانیاں، میرا جینا اور میرا مرنا سارے جہانوں کے رب کے لئے ہے

بات ذاکر صاحب کے عشق رسول کی ہو رہی تھی، اس موضوع پر آپ کی دو تصانیف ''مرحبا الحاج'' اور ''میاں کے اٹریا تلے'' سنگ میل کے زمرے میں آتی ہیں۔ دونوں کتابوں کو پڑھئے تو ایمان میں پختگی اور راسخ عقیدگی پیدا ہو جائے۔ وہاں کے مناظر کی ایسی پیش کش کہ انسان کے اندر مدینۃ الرسول اور خانہ کعبہ یا کالے کوٹھے کی زیارت وطواف کے لئے تڑپن اٹھنے لگے۔ دونوں کتابوں میں جابجا روح پرور مناظر اور ایمان کی جلوہ سامانیاں بکھری ہوئی ہیں، کچھ مقامات ایسے بھی جو اشک باری کا سبب بن جائیں۔ ''مرحبا الحاج'' میں ایک مضمون ''بستان سلمان فارسیؓ'' سے متعلق ہے جس کا تعارف خاص جذبہ وکیفیت کے ساتھ کرایا گیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اتنی بڑی دنیا میں ہزاروں باغات اور پارک اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ دعوت نظارہ دیتے ہیں، ان کی سیر وتفریح سے یقیناً جسم وجاں میں

تروتازگی پیدا ہوتی ہے لیکن بخدا جو فرحت بستانِ فارسی میں چند منٹ کے قیام میں عطا ہوئی وہ گل لالہ سے پُر آغوش گلستانوں میں کہاں؟ وہاں کھڑے ہی کھڑے سکون کی اس فراوانی چھاؤں کی ایسی ٹھنڈک کی وجوہات بھی سمجھ میں آئیں۔ ظاہر ہے جن اشجار پر تاجدار مدینہ سایہ فگن ہوں وہاں بھی اگر تسکین قلب وجاں کے سامان کی بہتات نہ ہوگی تو پھر اور کہاں ہوسکتی ہے؟ منبع سکون نے بہ نفس نفیس جس باغ کی آب یاری کی ہو وہاں کا پتہ اور بوٹہ کیسے سکون آفریں نہ ہوگا''؟۔

فیضانِ جذبات اور سیلان احساسات کا یہی سماں ''میاں کے اٹریا تلے'' میں بھی ہے۔ لفظ لفظ میں عشق رسول کا منبع و مصدر، سطر سطر میں اطاعت رسول کی شہادت اور ورق ورق میں مکہ و مدینہ کے خوش نما مناظر، زبان و بیان کا ایسا بھلا انداز کہ باتیں دل میں اترتی جائیں اور دل بارش عشق رسول میں نہایا جائے، پڑھیئے تو دل وہاں جانے کے لئے اچھلنے لگتا ہے۔ طمانیت کائنات کا واحد مرکز روضۂ رسول، سکینتِ قلب کا واحد ذریعہ صرف مدینۂ رسول اور تمام امراض واسقام کا علاج محض ارض یثرب ہے۔ یہ سب ناز وآہنگ ذاکر صاحب کے تزکیۂ نفس کی علامتیں ہیں کیونکہ عشق رسول سے دل کی کثافتیں کافور ہوجاتی ہیں۔ ''میاں کے اٹریا تلے'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''میاں'' نے دروازے کے ساتھ والے کونے میں جنت کے پتھر کی کالی پٹی بھی لگادی ہے جس پر مہمان ہیں کہ دیوانہ وار ٹوٹے پڑتے ہیں مگر اس کی وجہ پتھر کا جنتی ہونا نہیں بلکہ یہ تصور ہے کہ اس کو اپنے نجہاں کے لاڈلے کے مبارک ہونٹوں نے چوما ہے مگر دیوانے ہوں بھی تو ایسے جو تیرے ہی دیوانے نہیں، تیرے محبوب کی دیوانے، تیرے محبوب کی ہر ہر ادا کے دیوانے، واقعی جس

عقیدت نے پتھر کا مقدر چمکا دیا وہ انسان کو کیا کچھ بنا سکتی ہے، یہ سوچ کر کس قدر سکون ہوتا ہے کہ جس آقا کے طفیل اللہ نے پتھر کے ایک کالے ٹکڑے کو یہ شرف عطا فرمایا وہ اس کی امت کے حق میں کس قدر مہربان ہوگا لیکن شاید پتھر کو بھی اپنے اعزاز پر ناز ہو لیکن ہمیں اپنی اس برتری کا احساس تک نہیں جو خیر الامم بن کر ملی اور بجائے اس انمول دین کی قدر کرنے کے شب و روز اس کے لٹانے کے ڈھنگوں میں مست ہیں اور اپنے اس قول و فعل سے خیر الامم کا اظہار کرنے سے مطلقاً معذور نظر آتے ہیں''۔

اوپر کے اقتباس کو پڑھئے تو عشق رسول کا بحر بیکراں متلاطم نظر آئے۔ پوری کتاب میں محبتوں اور عقیدتوں کی یہی جذبات نظر آئیں گے۔ نثر کے ساتھ ساتھ منظوم انداز میں بھی تاج دار مدینہ کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے جسے دنیائے ادب ''رخت سفر'' کے نام سے جانتی ہے۔ یہاں بھی جا بجا عظمت رسول اور رفعت حبیب خدا ﷺ کے گن گائے گئے ہیں، خیال میں کیا ہی تنوع اور بوقلمونی لیکن ایک ہی تصور کہ وہی فخر کونین احمد مصطفی ﷺ ہمارا ماویٰ و ملجا ہے، اسی کا اسوۂ حسنہ آج اور کل تمام مسائل و مصائب میں باعثِ رشد و ہدایت ہے۔ کہنے کو تو یہ نعتیہ قصائد ہیں لیکن یہ دکھ درد، اضطرابات اور آلام و شدائد کی داستان ہے جو صاحب رخت سفر اپنے سرور مجتبیٰ ﷺ کے حضور حاضر ہے۔ درج ذیل اشعار سے ان کی وابستگی رسول کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

حضور انور بلا رہے ہیں لو ہم مدینے کو جا رہے ہیں
مبارک اشکوں کی آمد آمد خوشی سے اپنی یہ آ رہے ہیں
کثافتیں دل کی مٹ رہی ہیں قریب اپنے کو پا رہے ہیں
فلک سے نغمہ سرا فرشتے ہمیں یہ مژدہ سنا رہے ہیں

نہ دیکھو اس کے گناہ کوئی   وہ شان رحمت دکھا رہے ہیں

مذکورہ اشعار سے صرف یہ استدلال مقصود ہے کہ ذاکر صاحب کا منتہا وہ ذات گرامی ہے جس کی تعلیمات میں معراج انسانیت ہے، اس ہستئ عظیم کی بغیر انسانی معراج کا تصور ناممکن ہے یہاں ذاکر صاحب کی نعتیہ شاعری کا تجزیہ ہرگز مقصود نہیں اور نہ ہی انہیں عظیم نعت گو شعراء میں شمار کرنے کا عزم وارادہ ہے لیکن یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ سرسید اور علی گڑھ کے حوالے سے چند معروف اساطین میں سے ہیں، اسی طرح یہ بات بھی بڑے اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ اردو ادب کے عظیم مزاح نگاروں اور انشاء پردازوں میں شامل ہیں۔ ذاکر صاحب کی رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے اسلئے یہ کہنا میرے لئے دشوار نہیں کہ وہ عناصر شی لطیف کے مرقع ہیں، حد درجہ حساس و بیدار، مسائل کی تہہ میں اترنے اور اتر کر تجزیہ کرنے اور تجزیے کے ساتھ ساتھ اس کا مناسب سدباب تلاش کرنے کی ان میں بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ تحقیق اور دیگر اصناف ادب میں جوہر دکھانا مزاح نگاری کے بالمقابل آسان ہے۔ مزاحیہ ادب کی تخلیق کے لئے فکر، نبض شناسی، تاریخ سے واقفیت، حالات حاضرہ پر گرفت اور زبان وبیان کے اعلیٰ ذوق کی ضرورت ہوتی ہے، ان صلاحیتوں کے بغیر مزاحیہ ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ مذکورہ تمام خصوصیات کے ساتھ اگر علیگیت بھی شامل ہو تو اعلیٰ مزاحیہ ادب وجود میں آسکتا ہے۔ ہمارے ذاکر صاحب ان تمام صفات سے معمور ہیں اسی لئے اعلیٰ مزاحیہ ادب کے منظر عام پر لانے کے لئے قادر ہیں۔ آیئے دیکھیں ''مچھر کیا کہتے ہیں؟'' کا آغاز کس طرح کرتے ہیں:

''دن کے ہنگامے کبھی کے رات کی آغوش میں پناہ لے چکے تھے اور آج ہم اپنی ہی پلنگ پر مہمان بنے ہوئے تھے، یعنی گھنٹے گذر گئے، مختلف کروٹیں

بدلیں مگر نیند کا سراغ کہیں نہیں ملا۔ ان خواب آور کوششوں کے دوران کسی نے کان کے صدر دروازے پر بڑے تال سر سے دستک دی اور قبل اس کے کہ دریافت کیا جائے، معلوم ہوا کہ مچھروں کا ایک ڈیلیگیشن اپنے بلڈ بینک کے لئے چندہ لینے آیا ہے، ابھی ہم اس مطالبے کے لئے کوئی معقول عذر بھی تلاش نہ کر پائے تھے کہ ان میں سے ایک گراں ڈیل مچھر نے جو وضع قطع کے لحاظ سے مچھرستان کا بی۔ ڈی چیرمین معلوم ہوتا تھا، اپنے انداز خوش گلو سے یقین دلایا ''آپ مطلق نہ گھبرائیں، جناب کو ہلنے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے گی، ہم آج کل کے ڈاکٹروں کی طرح بے ضرورت انجکشن چبھو کر تکلیف دینا تو درکنار، کسی فیس کا مطالبہ تک نہیں کرتے'' اور واقعی ہوا بھی ایسا ہی یعنی تعارفی گفتگو کا سلسلہ ختم بھی نہیں ہو پایا تھا کہ جناب چیرمین نے انکم ٹیکس واجبات کی طرح چندہ بقایا وصول کیا مگر احساس کمی خون اور سوزش کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ خداوندا ہندوستانی حکمرانوں سے زیادہ تو تو نے اس حقیر کیڑے کو دلیر اور متمدن بنایا ہے کیونکہ حملے سے قبل کم از کم اپنے ارادے سے تو آگاہ کر دیتا ہے''۔

''دیوان عام'' اور ''قلمرو'' وغیرہ کے تمام مضامین سے واضح ہے کہ ذاکر صاحب ایک عظیم مزاح نگار اور انشاء پرداز ہیں۔ آپ کی شخصیت کا ایک معروف پہلو یہ بھی ہے کہ خاکہ نگاری میں بھی ایسے نقوش ثبت کئے ہیں جن کی ابدیت کو حوادث روزگار چیلنج نہیں کر سکتے۔ ذاکر صاحب کے خاکوں میں شخصیات کے مجسمے ہوتے ہیں جو قارئین کی نظروں میں رواں دواں بزرگوں۔ اساتذہ، اعزاء، اہل خاندان اور احباب کے خاکے رقم کئے، ان خاکوں کا دوسرا نام حقیقت ہے۔ ذاکر صاحب کے خاکوں میں ''مائی باپ'' کو نہ صرف اولیت حاصل ہے بلکہ وہ اردو کے چند اہم خاکوں میں شامل ہے۔ اپنی والدۂ محترمہ کی عسرت، جرأت

وشجاعت، صبر وشکر، بیٹوں کے خوبصورت مستقبل کی فکر اور سب سے بڑھ کر ان کے مومنانہ کردار کی جس حسین وجمیل لب ولہجے میں تصویر کشی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ ہر مصیبت کے سامنے سینہ سپر اور ہر طوفان بلا سے زور آزمائی کے لئے تیار لیکن یہ گوارہ نہیں کہ ان کے ذاکر کی تعلیم ادھوری رہ جائے۔ ساری زندگی ابتلاء وآزمائش کی نذر اور شب دیجور سے گذرتی رہیں لیکن کیا مجال کہ اپنے بچوں کی تہذیب وتربیت اور شفقت ومحبت سے غافل رہی ہوں۔ بستر مرگ پر بھی اپنے بچوں کی خوشیوں کے لئے مکمل طور سے چاق وچوبند اور ان کے دامن دل کو مہکتے ہوئے خوش رنگ پھولوں سے بھر دینے کے لئے ہمہ آن تیار، ہر وقت دست بدعا، نگاہیں آسمان پر اور زبان پر اوراد وظائف کا لامتناہی سلسلہ۔ ایسی ہی خواتین ''خواتین اول'' کہی جانے کی حق دار ہیں۔ ان خواتین کو کیوں خواتین اول کہا جائے جو اپنے بیٹوں کے بجائے کتوں پر فدا، معصوم انسانوں کی جان لینے والے شوہر کے شانہ بشانہ رواں دواں، عریانیت ان کا شیوہ اور بے حیائی ان کا پیشہ، اپنی بیٹیوں کا اشتہار ان کی اولین ترجیح اور شراب نوشی ان کی فطرت۔ یہاں ایک اقتباس ادب دوستوں کے لئے حاضر ہے:

''گرچہ قیام انتہائی مختصر رہا لیکن ہر ہر لمحے ذہنی آسودگی وطمانیت قلب حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس وجہ سے تقریباً نصف صدی گذرنے کے باوجود پرانی باتیں اور پرانے واقعات من وعن ویڈیو فلم کی طرح نظروں کے سامنے آتے رہتے ہیں اور دل یہی چاہتا ہے کہ یہ فلم کبھی ختم نہ ہو۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ انسانوں کو یہ محسوس ہونے نہیں دیا جاتا کہ کون سی ملاقات ان کی آخری ملاقات ہوتی ہے۔ ورنہ اس ادراک کے بعد جدائی کا ہر مرحلہ ناقابل برداشت بن جائے۔ یا پھر علاحدگی ہونے سے پہلے ہی حرکت قلب بند

ہو جائے، اس لئے رام پور سے واپسی کے وقت بچھڑنے کا بے حد ملال تھا اور روانگی سے چند روز پیشتر ہی اضمحلال طاری تھا لیکن یہ گمان قطعاً نہیں تھا کہ والدہ صاحبہ سے میری یہ ملاقات آخری ثابت ہوگی، دل پر جدائی کا منوں بوجھ لئے لئے جیسے تیسے آبائی مسکن سے رخصت ہوئے تو دوران سفر بچھڑنے کا سماں ہمہ وقت آنکھوں کے سامنے رہا، میں کراچی واپس پہنچ کر دفتری سرگرمیوں میں منہمک ہو گیا کہ جس سے دوریوں کا شدید احساس بتدریج کم ہوتا چلا گیا لیکن محبت سے گذرتے ہوئے لمحات کی یاد سے سکون قلب میسر آتا رہا، گویا فاصلوں کے باوجود قرب حاصل رہا، اس طرح اپنے آپ کو محترمہ کے قدموں میں محسوس کرتا رہا، ان کی دعائیں براہ راست پہنچتی رہیں اور اتنا ہی نہیں، قبولیت کے آثار بھی ظاہر ہوتے رہے، گویا ہم میں سے کوئی انہیں بھلا نہ سکا اور نہ انہوں نے ایک پل کے لئے بھی ہمیں فراموش کیا ہوگا کیونکہ ماں کی شفقتیں اولاد کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتیں جو بلا قید زمان و مکان سایہ فگن رہتی ہیں، وہ دکھ درد کا سہارا ہوتی ہیں، تفکر و آلام میں دست گیری کرتی ہیں۔ عطیات ربانی میں بنی نوع انسان کے لئے ماں سب سے بڑی نعمت ہے وسر چشمۂ محبت ہے، آغوش راحت ہے، گویا سراسر رحمت ہی رحمت ہے۔ میں یہ سب کچھ یونہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ چھہتر سال کی عمر میں ان کی محبت کی فیض رسانی مجھے میسر ہے گویا یہ رشتہ اور ہے جسے موت بھی جدا نہیں کرسکتی"۔

"مائی باپ" کا یہ ایک اقتباس ہے، اس سے اس مضمون کی اہمیت اور ذاکر صاحب کی خاکہ نگاری کی قدر و قیمت کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس میں ایک طرف اگر ان کی والدۂ محترمہ کی عظمت و رفعت کی توضیح ہے تو دوسری طرف ماں کے تئیں ذاکر صاحب کی مثالی اطاعت و فرماں برداری۔ قرآن کریم کے

حکیمانہ حکم ''لا تقل لھما اف'' (والدین کو اف کہنے تک کی جسارت نہ کرو) سے واقف تھے۔ اسی طرح والدۂ محترمہ شرک سے حد درجہ الرجک تھیں اور انہوں نے اپنی اولاد کو شرک سے ہمیشہ دور رکھا، وہ قرآن کریم کے اس فرمان پر پوری دل جمعی سے قائم ودائم رہیں۔ ارشاد ربانی ہے: ''ان الشرک لظلم عظیم'' (یقیناً شرک سب سے بڑا ظلم ہے) ذاکر صاحب والدۂ محترمہ کے ممنون ہیں کہ ''انہوں نے ہم لوگوں کو اس ظلم عظیم سے محفوظ رکھا، ہمیشہ تاکید کی گئی کہ بجز اللہ کے کسی اور کے حضور سوالی نہ بنا جائے لیکن افسوس کہ ہمارے بھائی قبروں پر سجدہ ریز ہوتے ہیں اور اصحاب قبور کو اپنا حاجت روا تصور کرتے ہیں''۔

اردو ادب میں اب تک تین شخصیات نے اپنی اپنی ماؤں کو موضوع بحث بنایا، ایک تو شہاب الدین نے ''شہاب نامہ'' میں، دوسرے ذاکر صاحب نے اپنی کتاب ''مائی باپ'' میں اور تیسرے پرٗوفیسر اطہر صدیقی نے اپنی والدۂ محترمہ پر ماہنامہ ''تہذیب الاخلاق'' میں تحریر کیا۔ یہ تینوں مقالات اردو ادب کی روح ہیں، ان میں مشرقی تہذیب وثقافت کی بھرپور نمائندگی ہے، ماں کے پیروں تلے جنت ہونے کا مکمل طور سے اعتراف واقبال ہے۔ شہاب الدین تا عمر ماں کے عنایت کردہ سکون کو جان ودل سے لگائے لگائے پھرتے رہے، اسی سکون کا تحفظ ان کی زندگی کا سب سے بڑا فریضہ تھا۔ ذاکر صاحب کا کہنا ہے کہ والدۂ محترمہ کے تمام واقعات آج بھی تازہ ہیں اور انہی کی یادوں کے اجالوں میں یہ زندگی کٹ رہی ہے اور آئندہ بھی کٹتی رہے گی۔ ذاکر صاحب زندگی کی ہر شام میں انہی یادوں کی شمع کا سہارا لیتے ہیں۔

پروفیسر اطہر صدیقی کا مضمون پڑھنے کے بعد مجھے ''شہاب نامہ'' کا مضمون ''ماں جی'' یاد آنے لگا۔ صدیقی صاحب نے اپنی والدہ کے کردار کو اتنے

خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، زبان و بیان کے اعتبار سے ''ماں جی'' سے حد درجہ قریب ہے۔ میں جب مبارک باد دینے کے لئے حاضر ہوا تو صدیقی صاحب کسی آپریشن کی وجہ سے ہاسپٹل میں داخل تھے، پروفیسر ذکیہ صدیقی صاحبہ سے متعلقہ مضمون پر گفتگو کرتے ہوئے جب میں نے یہ ذکر کیا کہ اس کو پڑھنے کے بعد شہاب الدین کا مضمون ''ماں جی'' یاد آرہا ہے تو انہوں نے فرمایا: کہ یہی بات قاضی عبد الستار نے بھی کہی ہے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا بھی یہی خیال ہے کہ صدیقی صاحب نے یہ مضمون ''ماں جی'' سے متأثر ہو کر تحریر کیا ہے۔ بہر حال مذکورہ تینوں خاکے ہمیشہ علمی دنیا کی توجہات کا مرکز بنے رہیں گے۔

یہ ذاکر صاحب کا اجمالی تعارف تھا، ویسے وہ ایک درجن کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے چند کے عناوین اس طرح ہیں: (۱) روایات علی گڑھ (۲) مرحبا الحاج (۳) میاں مے اثریا تلے (۴) قلمرو (۵) دیوان عام (۶) مائی باپ (۷) رخت سفر (۸) مدیث حرم۔ ہر کتاب اپنی جگہ قابل ذکر حیثیت کی حامل ہے۔ ذاکر صاحب کا اصل تعارف علیگ ہونا اور علی گڑھ سے محبت کرنا ہے، اپنی تمام کائنات اور شہرت وعزت کا اصل ذریعہ ان کے نزدیک مادر علمی ہے۔ ان کے اخلاص اور سرسید سے جذباتی لگاؤ کی بناء پر دنیا میں جہاں چلے جائیں اہل علی گڑھ بسر وچشم ان کا استقبال کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں علی گڑھ آئے تو پوری یونیورسٹی میں آپ کے آمد کی دھوم مچ گئی، یونیورسٹی کا ہر فرد اور ہر شجر و حجر آداب بجالانے کے لئے تیار، اس خوب رو انسان کے دیدار سے آنکھیں سینکنے کے لئے بے تاب و بے قرار۔ ذاکر صاحب کے پاس بیٹھئے تو محسوس ہوگا کہ محبتوں کے حصار میں ہیں، مشک وعنبر کے جھونکے پر جھونکے چلے آرہے ہیں، فضا

پر کیف ہوتی جا رہی ہے اور دور تک نگاہ میں تھے گل کھلے ہوئے۔ جب بھی ذاکر صاحب کی آفس یا در دولت کلفٹن میں حاضر ہوا تو لگا کہ آفتاب و ماہتاب زمین پر آ گئے ہوں اور ستاروں کی انجمن میں ذاکر صاحب کی سریلی آواز کانوں میں رس گھول رہی ہو اور ان کی مسکراہٹوں سے یہ کواکب اور آفتاب و ماہتاب لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ اس حقیر کی تواضع کے لئے بے چین، کبھی میکڈانل سے ماکولات و مشروبات چلی آ رہی ہیں تو کبھی جیم خانہ لئے چلے جا رہے ہیں۔ خدا کرے یہ بازار رونق یونہی شاد و آباد رہے اور اس میں تا ابد علم سرسید لہلہاتا رہے۔ ہماری یونیورسٹی اور ہم ایسے جاں باز مرد مجاہد کو سلام کرتے ہیں۔ ہم تو غلطی کر گئے بلکہ اس کی اپنی مادر علمی اپنے سپوت کے کارناموں پر ناز کرتی ہے۔ کسی کو کیا معلوم کہ ۱۹۲۶ء میں دارالسرور کے اندر پیدا ہونے والا اور ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انجینیر بن کر نکلنے والا انشاء پرداز، مزاح نگار اور خدمت گارِ فکر سرسید بھی ہوگا۔

فصل گل، بادِ سحر، بادۂ دوشیں، لب جو
تو نہ ہوتا تو کہاں یہ سروساماں ہوتا

(امتیاز علی عرشی)

اداس شہرِ غزل ہے کہ شہریار گیا

ابوسفیان اصلاحی

اردو ادب کی تعمیر و ترقی میں ادارۂ سرسید کی گراں قدر خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ اردو ادب کی تاریخ کے استحکام میں بھی اس ادارے نے وہ کارنامے انجام دئے ہیں جو ہمیشہ مورخین کے ذہنوں میں تازہ تر رہیں گے۔ اسی تاریخ کی تزئین وتہذیب میں ہمارے شہریار کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ ایسے قیمتی اور عظیم شخص کو موت ہمارے درمیان سے اٹھالے گئی۔ 13رفروری 2012 کا دن کتنا سخت ترین اور کتنا تاریک ترین تھا جس نے نہ صرف ادارۂ سرسید بلکہ وابستگان اردو ادب اور مختلف ارباب زبان وادب کو سوگوار کردیا، شاید ہی دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہو جہاں اس شبِ دیجور کے اثرات نے اپنا رنگ نہ دکھایا ہو۔ شہریار شہرت کی ان بلندیوں پر فائز تھے جہاں ان کی ایک شناخت بن چکی تھی۔ اس شناخت کے شیدائیوں کی ایک بڑی تعداد دنیا کے مختلف خطوں میں بس رہی ہے۔ شہریار کی شناخت کو اعتبار بخشنے میں تراجمِ کلامِ شہریار کا بڑا بنیادی رول ہے۔ آپ کے بیشتر کلام کا ترجمہ دیوناگری میں ہو چکا ہے۔ اسی طرح انگریزی میں بھی آپ کی بہت سے نظمیں منتقل ہو چکی ہیں اور چند نظموں کے ترجمے عربی میں بھی ہو چکے ہیں۔ شہریار کی اسی شناخت اور شعری وقار کی وجہ سے جامعات میں انہیں موضوعِ بحث بنایا گیا اور مختلف اہلِ علم نے آپ کے شعری تشخصات کا تحلیل وتجزیہ کیا۔

شہر یار کا شخصی اور شعری حسن نصف النہار پر تھا، شہر یار کے شعری حسن کی بازیافت اور اس کے مقام و مرتبہ کا تعین میرے بس کا نہیں۔ ان کے شخصی حسن کی قافیہ پیمائی کس حد تک ممکن ہے، جرأت اور انکسار میں بڑا گہرا ارتباط ہے، جری ہی کی ایک تعریف منکسر المزاجی ہے، اسی لئے شہر یار جری اور منکسر المزاج دونوں تھے، جری، مخلص اور صداقت پسند اتنے تھے کہ اپنے استاذ اعظمی کی مظلومیت پر چیخ اٹھے۔ انہیں اپنے مستقبل کی پرواہ نہ رہی، رفاقت صداقت کو ہمیشہ اپنا ہم نشیں قرار دیا، مرحوم اعظمی کی اعلانیہ ستائش سے کبھی باز آئے ہوں ایسا ہرگز نہیں۔ احترامِ استاذ کی پاسداری میں تادمِ زیست جٹے رہے، بلندیوں کو چھو لینے کے بعد بھی ''اردو باغ'' کے راستے کو فراموش کر گئے ہوں اس کا امکان نہیں۔ ابنائے خلیل نے بھی انہیں پدریت کے تمام اعزاز سے نوازا کیونکہ وہ ان کے ہر دکھ درد میں شامل رہا کرتے۔ یہ سب اس لئے تھا کہ شہر یار کے اندر کا انسان بہت ہی مضبوط تھا، اسے دنیا کی رنگینیاں رجھائیں، نفاق کے حضور سر بسجود ہوں اور اپنے تشخص کا سودا کریں یہ انہیں ہرگز پسند نہیں۔

شہر یار کو ایک ایسا دل عطا ہوا تھا جس پر مہ و کہہ کا یکساں حق تھا۔ کبیر کالونی میں خاکسار نے آپ کی رہائش کے دوران دیکھا کہ درجہ چہارم کے ملازمین کی بھی وہاں پذیرائی ہے۔ پروفیسرز کا بھی تانتا بندھا رہا اور قابلِ ذکر ارباب انڈسٹریز بھی زیارتِ شہر یار سے لطف اندوز ہوتے رہے نیز شعرا اور ناقدین بھی دہلیز شہر یار کی بوسہ زنی سے خود کو سرفراز کرتے رہے، خاکسار بھی اس دہلیز پر تمکنت سے لطف اندوز ہوتا رہا، لیکن آپ کی طبیعت کبھی طغیانی کا شکار ہوئی ہو اور طاغوت بنے ہوں ایسا کبھی دیکھنے میں نہ آیا۔ وہی خندہ پیشانی اور جبہ سائی آپ کا شیوہ رہی۔ احقر کے غریب خانہ بھی اکثر اپنی بیٹی سے ملنے آئے تو احقر کو آواز دے ڈالی۔ نکلا تو

احوال دریافت کیے، مسکراہٹیں دیں اور شفقتوں سے ایاغِ دل لبریز کر گئے۔ اکثر بیٹھے نہیں لیکن دستک دے کر دعائیں ضرور پھونکتے گئے۔ احقر کئی مرتبہ آپ کے کمرے پر حاضر ہوا، ہر بار وہی پیار و محبت اور ادھر ادھر کے احوال۔ صرف ایک بار خلیل صاحب کے متعلق بات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ سفیان! مجھے جینا اور شاعری کرنا سکھایا، اگر اعظمی صاحب نہ ہوتے تو شاید مجھے یہ اعزاز اور شاعری میں یہ مقام نہ ملتا۔ رشید احمد صدیقی سے لے کر کتنوں کی مدد کیا کرتے تھے، رشید صاحب کو خلیل صاحب کے وسعت مطالعہ اور حفظ پر پکا یقین تھا۔ انجم اعظمی اور مختار الدین وغیرہ نے خلیل صاحب سے بے پناہ استفادہ کیا۔ خلیل صاحب کے یہاں دنیاداری بہت کم تھی۔ پڑھنا لکھنا ردائے زیست، یہی وجہ ہے کہ نیاز فتح پوری جیسا واقف کار بھی خلیل صاحب کی تحریروں کو عزت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ خلیل صاحب کو اللہ تعالیٰ وقت دیتے تو علمی اور ادبی دنیا میں مزید اضافہ کرتے۔ خلیل صاحب کے رفیق انجم اعظمی مرحوم نے بارہا بتایا کہ خلیل صاحب کو خداوند قدوس نے وہ ادبی و تنقیدی صلاحیت عطا کی تھی کہ جس کی مثال مجھے ہندوستان سے پاکستان تک کسی دوسرے میں نظر نہیں آتی۔ بہر کیف شہریار کے یہاں اپنے استاذ سے ایسی انسیت اور ایسا لگاؤ تھا کہ پورا وقت انہیں کے ساتھ گزرا، خلیل صاحب کی بہت سی گھریلو ذمہ داریاں اور مہمانوں کی خاطر داریاں انہیں کے سپرد تھیں، اردو باغ ہر وقت دانشوروں اور ارباب علم وادب سے پر ہجوم رہتا، اس کی وجہ سے شہریار صاحب کے علمی اور شعری کینوس میں خاصہ اضافہ ہوا۔

شہریار صاحب دوسروں کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے تیار، غرباً اور ضرورت مندوں کی حاجت روائی میں بہت آگے نکل جاتے، نہ جانے کتنوں کو لگوایا اور کتنوں کے مستقبل کو سنوارا، اسی طرح ان

سے اگر کوئی فرمائش کی جائے تو اس کی انجام دہی میں انہیں اپنی بڑی سے بڑی چیزوں کو قربان کرنے میں تامل نہیں۔ ایک بار شہر یار صاحب کو لال قلعے کے مشاعرے میں مدعو کیا گیا، یہ سبھی کو معلوم ہے کہ یہ بڑا Prestigious مشاعرہ ہوتا ہے، اس میں ہندوستان کے معروف شعرا میں سے چند خوش نصیب شاعر ہی مدعو کئے جاتے ہیں، یہ فال ایک مرتبہ شہر یار صاحب کے نام بھی نکلی، جانے کے لئے ہمہ تن مستعد، مشاعرہ سے ایک روز قبل محترم قاضی عبدالستار نے فرمایا کہ کل شعبہ میں ایک پاکستانی مہمان آرہے ہیں اگر تم رہتے تو بہتر ہوتا، شہر یار صاحب نے فوراً اثبات میں جواب دیا، قاضی صاحب نے پوچھا کہ اچھا یہ بتاؤ تم کو مشاعرہ میں کب جانا ہے؟ انہوں نے کہا کہ کل ہی تو جانا تھا، قاضی صاحب نے کہا کہ پھر جاؤ کیونکہ ایسی ساعت بار بار نہیں آتی، لیکن قاضی صاحب کی اس فرمائش کو ٹال دیں یہ ان کی فطرت کے منافی، کیونکہ یہ فرمائش ان کے نزدیک ساعت سعید سے کہیں زیادہ محترم و مکرم۔

شہر یار صاحب کے تار ہندوستان سے باہر دنیا بھر سے جڑے ہوئے تھے، امریکہ، یوروپ، عرب اور پاکستان میں آپ کے چاہنے والوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، اس میں ہر قد کے لوگ تھے، نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد آپ کی شیدائی ہے۔ میرے ہم وطن جناب ڈاکٹر حفظ الرحمٰن آپ پر حد درجہ فریفتہ، بارہا انہیں سعودی عرب بلایا، انہوں نے اکثر خاکسار سے آپ کے اخلاقِ کریمانہ کی تعریف کی۔ انہوں نے بتایا کہ عرب ممالک کی ایک کثیر تعداد آپ کی توقیر و تکریم کے لئے پاگل بنی رہتی، اسی طرح امریکہ میں بسنے والے انجینئر جناب افضال احمد عثمانی بھی شہر یار صاحب کے قدردانوں میں سے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ سرزمینِ امریکہ بھی عاشقین شہر یار سے پٹی ہوئی ہے۔ افضال

صاحب اپنے علی گڑھ آنے کے بعد شہر یار صاحب کی خدمت اقدس میں بار ہا حاضر ہوتے۔ اسی طرح ہمارے دوست جناب شہیر صاحب بھی امریکہ سے مستقل شہر یار صاحب کی خیر وخبر لیتے رہے۔ جب شہر یار صاحب کو موذی مرض لاحق ہوا تو خاکسار سے شہیر صاحب نے فرمایا کہ اس بار ہمارے مجلّہ کے لئے شہر یار صاحب پر مضمون لکھتے تو کرم ہوتا، خاکسار نے کہا کہ میں نہ تو ناقد ہوں اور نہ ہی شہر یار صاحب کی شاعری کا تجزیہ کرنے پر قادر، یہ سب تو ناقد کرتے ہیں کیونکہ ناقدین ہی فن وزن سے خوبی واقف ہیں۔ اس میں انہیں اس قدر مہارت ہے کہ ڈنڈی مارنے والے بنیوں کو بھی ماند کردیں، کیونکہ انشاٗ اور تخلیق کی قدر ومنزلت سے کلی طور سے نابلد ہیں لیکن بھائی کی خواہش کو پورا نہ کرنا بھی عذابِ الیم سے کم نہیں۔ قلم اٹھایا، اپنے بس بھر گھسیٹنا شروع کیا، چھپنے کے بعد بہت سے قدردانوں کے فون آئے تو میں نے سکون کا سانس لیا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ بے ہنگم سطور پسند کی گئیں اور یہ احقر بھی خون لگا کر فدایین شہر یار میں شامل ہوگیا۔

یہ بات اب تو روزِ روشن کی مانند عیاں ہے کہ شہر یار عصرِ حاضر کے چوٹی کے شعرأمیں شامل ہیں۔ منیب الرحمٰن، امین اشرف، شہر یار اور اسعد بدایونی نے جدید شاعری کو نئی جہت دینے میں اہم رول ادا کیا ہے، یہ چاروں شعرأ علی گڑھ کے فیض یافتہ ہیں۔ شہر یار کی شاعری میں اپنی ذات، اپنی وحدت اور اپنے اضطراب کی پیش کش ہے، وہ اپنے وجود کی تلاش میں سرگرداں رہے، کبھی اپنے آپ سے اور کبھی کائنات سے اپنے ہونے کا پتہ پوچھتے رہے، تنہائیوں سے ہم کلامی ان کی فطرت تھی لیکن اسے طوفانوں اور ظلمتوں سے کسی طرح کا خوف ہرگز نہ تھا، انہیں منحرف اور باغی فضا میں جینا آتا تھا، جسے جینا آتا ہو صرف وہی موت کو مخاطب کرسکتا ہے، یہ اندازِ تخاطب کس قدر جرأت مندانہ۔ شہر یار کی شاعری کی

عظمت کا اعتراف ہمارے رئیس الناقدین پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اس طرح کیا ہے "میرے حصے کی زمین" شہریار کی غزلوں کی پہلی قسط ہے، وہ عموماً نظم کے شاعر گنے جاتے ہیں اور اپنا ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں، اس لئے پیشِ نظر مجموعہ ایک طرح کے تحیر اور اچانک پن کا احساس پیدا کرتا ہے، غزل کے میدان میں بھی ان کا کارنامہ کچھ کم داد کا مستحق نہیں ہے، اس میں روایت کا حصہ بہت کم اور انفرادی اپچ کو بیش از بیش دخل ہے، چونکہ ان کی نظمیں اور غزلیں ایک ہی تخلیقی ذہن کا اظہار وانعکاس ہیں، اس لئے ان میں کچھ عناصر مشترک نظر آتے ہیں"

شہریار کی شاعری میں خلیل الرحمٰن اعظمی، ناصر کاظمی اور ابنِ انشاؔ کی لہک اور مہک موجود ہے لیکن اپنی شعری فضا کی تشکیل و تکمیل میں ان کی اختراعیت وابداعیت کا دخل ہے جس نے انہیں ایک ممتاز اور انفرادیت کا حامل شاعر بنا دیا، چند اشعار حاضر ہیں:

کشتیٔ جاں سے اترنے کو جی چاہتا ہے
ان دنوں یوں ہے کہ مرجانے کو جی چاہتا ہے

ہوائے کوئے جاناں بس اتنا کام کر جانا
صراحیٔ دل کی خالی ہو تو اس کو خوں سے بھر جانا

دل ہے تو دھڑکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
پتھر کی طرح بے حس و بے جان سا کیوں ہے

کیا کوئی نئی بات نظر آتی ہے ہم میں
آئینہ ہمیں دیکھ کے حیران سا کیوں ہے

شہریار کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی کہ نہ صرف جیتے جی اپنے استاذِ محترم خلیل صاحب کو نفس نفس میں بسائے رہے بلکہ استاذ محترم کے اسی بسانے

سے ان کی سانسیں چلتی رہیں۔ یکم جون 1978 میں استاذ محترم کے انتقال سے انہیں شدید دھچکا لگا اور تاحیات اس دھچکن کو محسوس کرتے رہے۔ اب ان کی یہ آخری خواہش کہ انتقال کے بعد استاذ محترم ہی کے فرحت بخش سایوں میں سوئیں، لیکن جب یونیورسٹی نے یہ قانون پاس کیا کہ اب منٹوئی کا دروازہ سبکدوش اساتذہ کرام کے لئے بند ہو چکا ہے تو مایوسیوں کا شکار ہو گئے کہ اب تو اس ظلِ جانفزا سے محرومی یقینی ہے لیکن دل اس آخری خواہش میں اٹکا رہا، چنانچہ اللہ نے سن لی اور یونیورسٹی نے اعلان کر دیا کہ منٹوئی اپنے سبکدوش مرحومین اساتذہ کرام کے لئے بھی اپنی آغوش وا کئے ہوئے ہے، یہ سن کر انہیں طمانیت قلب نصیب ہوئی کہ مرنے کے بعد بسکون استاذ محترم کے جلو میں سوئیں گے۔ اللہ کو اپنے بندے کی یہ ادا کتنا پسند آئی کہ آج استاد اور شاگرد دونوں شانہ بشانہ آسودۂ خاک ہیں، شاید دنیا کے کم ایسے قبرستان ہوں گے جہاں اتنے عباقر و اکابر صف بصف سو رہے ہوں۔ کاش کوئی بندۂ نیک ان گنجہائے گراں مایہ کی تصاویر اتارتا تو اس تصویر و تحریر کو دنیا قدر کی نظر سے دیکھتی۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ شعبۂ تاریخ یا شعبۂ اردو کسی طالب علم کی تحقیق کا رخ ادھر پھیر دیتے تو ہم اہلِ علی گڑھ پر اس کا احسان ہوتا، ویسے یہ موضوع تو پروفیسر اقتدار عالم خاں کا ہے وہ اسے بڑے سلیقے اور محقق شکل میں انجام دیں گے۔ مجھے منٹوئی دیکھ کر قرآنِ کریم کی یہ آیت یاد آتی ہے: "الم نجعل الارض کفاتاً، احیاء و امواتا" کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی نہیں بنایا، زندوں کے لئے بھی اور مردوں کے لئے بھی۔ (المرسلات: 25/77)

شہریار کی تدفین میں ایک جم غفیر امڈا ہوا تھا، ہمارے بزرگ کرم فرما غازی پوری علیگ جناب شاہد مہدی صاحب بھی تھے، اپنی تمام تر پیروں کی تکلیف کے باوجود دلی سے تدفین میں شرکت کے لئے آئے، کیونکہ شہریار سے

دیرینہ رسم وراہ تھی، ویسے بھی علیگ ہونے کے ناطے اپنے علیگیوں کو کب فراموش کرنے والے؟ شاہد مہدی شہر یار کے عاشقوں میں یوں شامل ہوئے کہ انہیں شہر یار کی شاعری سے عشق ہے۔ محترم شاہد مہدی مطالعہ کے حد درجہ شوقین ہیں، بہت پہلے مشتاق یوسفی پر خاکسار کا مضمون پڑھا تھا لیکن ادھر جب ان سے بات ہوئی اور مضمون کا ذکر چلا تو اسکے بعد تمام ابعاد ایک سانس میں سنا ڈالے۔ چند ماہ بیشتر خاکوں پر مشتمل اپنی کتاب ''نایاب ہیں ہم'' آپ کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے تدفین میں ملاقات ہونے پر بتایا کہ تمہاری کتاب ختم کر چکا ہوں۔ یہی علی گڑھ کی شناخت یہاں کے مولوی، انجینئر، سائنس داں، اطبأ اور ادبأ میں فرق کرنا آسان نہ تھا۔ اسی شناخت پر شناخت شہر یار کا بھی انحصار ہے، اسی شناخت نے ہمارے بڑے بھائی شاہد مہدی کو عاشقِ ادب بنایا، لیکن اب یہ شناخت ادھ مری ہو چکی ہے۔

شہر یار کی ناموری کا اصل سبب ان کی شاعری ہے، اسی شاعری نے انہیں بے شمار امتیازات کا مستحق بنایا، لیکن ایک بڑا کام آپ کا یہ بھی رہا کہ مغنی تبسم کے ساتھ مل کر مجلّہ ''شعر و حکمت'' حیدر آباد سے نکالتے رہے۔ ہندوستان میں اس پایہ کا کوئی دوسرا مجلّہ نہ تھا۔ اس میں ہندوستان کے اہم ادبأ اور شعرأ کی تخلیقات شائع ہوتیں۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری بھی اس مجلّہ کی وقعت کے قائل ہیں، لیکن افسوس کہ 12 رفروری کو شہر یار کے داعی اجل کو لبیک کہتے ہی 13 رفروری کو پروفیسر مغنی تبسم بھی اپنے آخری سفر پر چل پڑے۔ اب ''شعر و حکمت'' کا کیا بنے گا اللہ ہی حافظ ہے۔

شہر یار کی شاعری پر بہت گفتگو ہوگی، لیکن ان کی مذہبی زندگی پر اظہارِ خیال کرنے والے بہت کم ہوں گے۔ شہر یار کے متعلق یہ بتایا ضروری ہے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی ایسا جملہ اپنے منہ سے نہیں نکالا جس سے

احترامِ دین مجروح ہوا ہو، آپ کے بھتیجے جناب پروفیسر یوسف امین صاحب کا خیال ہے کہ وہ اندر سے پختہ مسلمان تھے، کردار مومنانہ تھا، فرمانے لگے کہ ہم لوگوں کے بہت کام آتے تھے، ہمارے بہت سے گھریلو مسائل کے تصفیہ میں انہوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ہماری امی نے بارہا ان کے احسانات اور اعلیٰ کردار کا ذکر کیا۔ پروفیسر یوسف امین صاحب نے یہ بھی بتایا کہ وہ قرآن کریم کی تفاسیر وغیرہ پڑھا کرتے تھے۔ ادھر تین ماہ سے ایک مولوی صاحب سے قرآن کریم پڑھوا کر سننے کا معمول تھا اور اپنے گھر ہی کی ایک صاحبہ کا پھونکا ہوا پانی بھی ادھر پیا کرتے تھے۔ پروفیسر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جب کوئی خاص موقعہ آتا تو اس وقت ہم لوگوں کو سورۃ الفتح پڑھنے کی تلقین کرتے اور فرماتے کہ اس کی تلاوت سے اللہ تعالیٰ سرفرازیوں سے ہم کنار کرتا ہے۔ یہی صورتِ حال آخری دنوں میں آپ کے استاذ گرامی کی بھی ہوگئی تھی۔ فکر انسانی کی اس تبدیلی کے تناظر میں یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہر انسان کے اندر اللہ موجود ہے بس تھوڑا سا کریدنے کی ضرورت ہے۔ بہت سے ایسے موڑ آتے ہیں جہاں بے ساختہ زبان پر اللہ کا نام آجاتا ہے۔ ویسے شہریار صاحب کا اپنے ربِ ذوالجلال پر یہ حتمی توکل ہی تو ہے کہ اتنے موذی اور مہلک مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود جب کسی نے ان سے خیریت دریافت کی تو بڑی طمانیت سے فرمایا ''ٹھیک'' ہے اور جب فون پر کوئی انہیں دیکھنے کے لئے آنے کا ذکر کرتا تو منع کرتے کہ کیوں آئیں گے؟ میں تو ٹھیک ہوں۔ اسی ٹھیک کا سہارا لیتے لیتے آپ نے آخری ٹھکانے جا لگے۔ شاید اسی دن کے لئے یہ شعر موزوں کیا تھا:

آسماں کچھ بھی نہیں اب تیرے کرنے کے لئے
میں نے سب تیاریاں کرلی ہیں مرنے کے لئے

☆☆☆

شہریار

ابوسفیان اصلاحی

صاحب ''اسم اعظم'' پروفیسر شہریار کو شاعر اعظم کہا جائے تو کیا حرج ہے؟ بہر نوع جو بھی ہو لیکن اتنا طے ہے کہ اردو زبان کی سرشت میں مبالغہ آمیزی پوری طرح داخل ہے، علی گڑھ آنے سے قبل ''مکتوبات خلیل'' کے مرتب جناب مولانا عبد الرحمٰن ناصر اصلاحی و جامعی کی مجالس میں خلیل صاحب اور شہریار کا بار بار ذکر آیا، انہوں نے یہ بھی بتایا کہ شہریار کی شاعری کو ایک خاص رنگ آہنگ دینے میں صرف خلیل الرحمٰن اعظمی ہی کا رول ہے، چونکہ خاکسار کو مولانا اصلاحی، جامعی کی نشستوں سے بارہا استفادے کے مواقع ملتے رہے ہیں، اس لئے انہی محافل کی وجہ سے خلیل الرحمٰن اعظمی اور شہریار کو پڑھنے کا اشتیاق ہوا۔ جب پروفیسر اعظمی کے شعری مجموعہ ''زندگی اے زندگی'' کو اردو اکیڈمی لکھنؤ نے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا تو اس کے اولین خریداروں میں خاکسار بھی تھا، جب ۱۹۸۴ء میں پروفیسر انجم اعظمی سے کراچی میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے خلیل الرحمٰن اعظمی اور شہریار کے متعلق بہت کچھ سنایا، ایسی لذت داستان کہ بھلانے سے نہ بھولے، انہی شخصیات نے خلیل صاحب اور شہریار کا شیدائی بنا دیا۔ مدرسۃ الاصلاح ہی پر ''مضامین خلیل'' اور ''اردو میں ترقی پسند تحریک'' وغیرہ پڑھ چکا تھا۔ لیکن افسوس کہ علی گڑھ اس وقت آیا جب خلیل صاحب دنیا کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ مقام شکر یہ ہے

کہ خلیل صاحب کے بھائی مرحوم عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی سے بیشمار ملاقاتیں رہیں جو ایک خوبصورت انسان، معروف محقق اور قابل ذکر تذکرہ نویس تھے اور آپ کے دوسرے بھائی عزیز الرحمٰن کو فارسی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

۱۹۸۵ء میں جب ادارۂ سرسید میں ورود ہوا تو یہاں کے اساتذۂ کرام کی ایک فہرست پہلے سے صفحۂ دل پر مکتوب تھی جس میں ایک نام پروفیسر شہریار کا بھی تھا۔ چنانچہ ایک دن دل ناداں پھڑکنے لگا کہ پروفیسر شہریار کی شاعری تو پڑھ رہے ہو لیکن صاحب شعر سے ملنے میں اس قدر تساہلی اور اس قدر تاخیر، سوچا کہ کچھ دن بعد چلیں گے، نو وارد اور جونیر ہو کر اتنی لمبی چھلانگ، کچھ ہوش تو ہے؟ اوسان خطا تو نہیں ہو گئے ہیں؟ لیکن دل ناداں کو جب غالب قابو میں نہ کر سکے تو ہم کس کھیت کی مولی؟ بہر حال دل ناداں کی اقتداء میں چل پڑے، C-13 میڈیکل کالج میں حاضر ہوا تو پروفیسر شہریار اور نجمہ شہریار نے بڑی شفقتوں سے بٹھایا، تعارف ہوا تو خاکسار نے بتایا کہ اعظم گڑھ کا رہنے والا ہوں، خلیل صاحب کے گاؤں سے میرا گاؤں بہت قریب ہے، ہم لوگوں کے کھیتوں کو ایک ہی نہر سیراب کرتی ہے، خلیل صاحب کے والد محترم مولانا محمد شفیع کے ادارہ مدرسۃ الاصلاح کا فارغ التحصیل ہوں، جب اتنی نسبتیں انہوں نے خلیل صاحب سے دیکھیں تو مجھے خاصا قریب کر لیا اور اب یہیں سے شہریار صاحب کی چاہتوں سے فیضیاب ہوتا گیا اور خلیل صاحب کے تعلق سے قریب ہوتا گیا، ایک انسان کے متعلق مختلف آرا پائی جا سکتی ہیں اور مختلف وجوہ کی بناء پر رائے زنی کی جاتی ہے خالی الذہن خاکسار کا خیال ہے کہ شہریار صاحب ایک دردمند اور بھلے انسان ہیں، آپ کی انسانیت کے قصے آپ کے ماتحتوں میں زیادہ مشہور ہیں۔ ایک بار آپ کے ایک ماتحت صاحب نے بتایا کہ میں عارضی تھا، جلد ہی سلکشن کمیٹی ہونے والی تھی، اسی اثناء میں محترم شہریار صاحب نے باہر

جانے کا پروگرام بنایا، جب چلنے لگے تو عرض کیا کہ سر! سلکشن کمیٹی ہونے والی ہے اور آپ امریکہ جارہے ہیں، بہرکیف انہوں نے جاتے جاتے فرمایا کہ جب تاریخ کا تعین ہوجائے تو مجھے فوراً باخبر کرو، اس یقین دہانی کے باجود میرے ہاتھ پیر بھول رہے تھے، کیونکہ امریکہ کی رنگینیوں کی چھوڑ کر کوئی ایسا ہے جو پریشان زدہ لوگوں کا خیال رکھے اور ان کی دادرسی کرے۔ انتخاب کی تاریخ طے ہوئی تو سوچا چلو یوں ہی سر کو باخبر کردیتے ہیں، ویسے کون ہے جو دکھیاروں کی آواز پر لبیک کہے، جب شہریار صاحب کو اطلاع ملی تو بھاگم بھاگ سلکشن کمیٹی میں آکر بیٹھے، اب بتائیے ایسی دردمندی کیا قابل ذکر نہیں ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ خاکسار کا ہے، میری ریڈر کی سلکشن کمیٹی ہونے والی تھی، ایک دن خدمت اقدس میں حاضر ہوا تا کہ Visitor nominee سے میری سفارش کردیں، ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، اٹھتے اٹھتے اپنا مدعا بیان کیا تو فرمانے لگے یہ کام میں کرچکا ہوں، اب ذرا سوچئے یہ ہے محبت او راپنائیت کا تصور اعلیٰ، ورنہ ایک کام کے لئے انسان کیا کیا مشقتیں اٹھاتا ہے، اگر کسی نے اسے کردیا تو وہ اس کا گلی کوچوں میں ذکر کرتا ہے اور اس کے توسط سے کیا کیا صلے اصول کرنے کا خواہش مند، اس کی یہی کوشش کہ دور غلامی کو ایک بار پھر واپس لایا جائے جسے دین اسلام نے کالعدم قرار دیا ہے اور ساتھ ہی ملازمین کو عزو وقار سے بلانے کا حکم بھی صادر کیا، کیونکہ دنیا کے تمام انسانوں کو یکساں طور پر حق تکریم عطا کیا گیا ہے۔ شہریار صاحب کی ایک تو یہ عظمت ہے جس کا ذکر کیا گیا، دوسرے اپنے محسنین کو فراموش کردیں یہ ممکن ہی نہیں، یہ سبھی کو معلوم ہے کہ آپ کے محسن اعلیٰ خلیل الرحمٰن اعظمی تھے، اپنے اس فکری محسن کو آج بھی لادے لادے پھر رہے ہیں، محترم اعظمی صاحب کے دنیا سے جانے کے بعد بھی ان کی عظمت کی تشہیر سے باز آجائیں یہ ممکن نہیں اکثر مجالس کو ان کی یاد

سے جلا بخشتے ہیں نیز یہ بھی تمنائی کہ خلیل صاحب کے علمی گوشوں کو مجلات او رنذاکروں میں موضوع بحث بنایا جائے، آپ کے انتقال کے بعد ''مضامین خلیل'' (انتخاب! پروفیسر شہریار، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی لمیٹڈ، مارچ ۲۰۰۴ء (پہلی جلد) فروری ۲۰۰۵ء، (دوسری جلد) میں شائع کر کے خلیل صاحب سے اپنی وابستگی کا ثبوت دیا، یہ حقیقت ہے کہ مجموعی اعتبار سے خلیل صاحب کا جو علمی وفکری مقام ومرتبہ تھا ایسا انسان علی گڑھ نے اب تک پیدا نہ کیا۔ خلیل صاحب کے دنیا سے منھ موڑنے کے بعد مستقل ان کے خانوادے سے جڑے ہوئے ہیں اعظمی مرحوم کے بیٹے سلمان خلیل شہریار صاحب کی داستان محبت میں گم ہیں، ان کی انسانیت اور محبت کے قصے سنانا آپ کا شیوہ زیست ہے، اردو باغ کی خوشی اور غم میں پورے طور سے شریک وسہیم، بلکہ اگر یہ کیا جائے کہ خلیل صاحب کے جانے کے بعد سے اس گھر کے لئے پتوار بنے ہوئے ہیں تو شاید نامناسب نہ ہو، سلمان صاحب کا شہریار صاحب پر اتنا حق ہے کہ ان سے دوسروں کی سفارش بھی کرتے ہیں، ایک مرتبہ خاکسار کی بھی آپ سے سفارش کر چکے ہیں۔

شہریار صاحب کو اپنی مجالس میں کسی کی تحقیر اور کسی پر تنقید ناپسند ہے، ایک مرتبہ کسی مسئلے کو لے کر احقر یونیورسٹی کے کچھ اساتذۂ کرام کو اول بھول بکنے لگا وہ چپ چاپ سنتے رہے، جب بکتے بکتے میں تھک کر خاموش ہوا تو فرمایا: سفیان! اپنا کام کرو، کام میں بہت دم ہے، یہ اچھے اچھوں کو خاموش کر دیتا ہے، میں نے ہاں بول کر اتفاق تو کیا لیکن دل میں کہنے لگا کہ کچھ بھی ہو یہ اساتذہ ایسے پینترے باز ہیں کہ اچھے اچھوں کو دھول چٹا دیتے ہیں، بہرکیف شہریار صاحب کا یہ خیال درست ہے کہ انسان کا کام زندگی اور زندگی کے بعد بھی بولتا ہے اور اس کی اہمیت کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے، مادر علمی کے ایسے نمائندوں کے لئے رشید احمد صدیقی نے ''گنجہائے گراں مایہ'' تحریر کیا۔ پروفیسر جائسی نے ''ڈھونڈو گے

انہیں ’’ترتیب دیا اور ذرہ ناچیز نے ’’لالہ وگل‘‘، ’’نایاب ہیں ہم‘‘ اور ’’نیر تاباں
تخلیق کی اور آئندہ خیال ہے کہ اسی سلسلے میں ’’نیر تاباں‘‘ کو جوڑا جائے، یقیناً یہی
کڑیاں اپنے بزرگوں کو زندہ کرنے کا ذریعہ ہیں، یہ مضمون بھی انہی سلاسل کا
ایک سلسلہ ہے، لیکن اگر بھائی شہیر کی محبتیں ساتھ نہ دیتیں اور امریکہ سے آپ کا
حکم صادر نہ ہوتا تو شاید یہ قلم نہ چلتا، بھائی شہیر وہاں بیٹھ کر قلم کو حکم دیتا ہے تو نہ
صرف یہ چلتا ہے بلکہ دوڑنے لگتا ہے، خدا ایسے بھائی کو زندہ رکھے جو ہر ذرے
میں علی گڑھ کا متلاشی ہے، اس کے نزدیک ہر تصویر علی گڑھ ہے، علیگ بھائیوں کی
تصاویر اتارنے میں مشاق ہے، اب کی اس ذرۂ ناخوب کی بھی تصویر اتار کر لے
گیا، نہ جانے کتنی تصویریں اپنے مادری علمی کی لے گیا؟ اب پتہ نہیں البم بناتا ہے،
یا اپنے دل میں سجاتا ہے، خود تو خود بقول ذاکر صاحب کے بیگم شہیر بھی علی گڑھ کی
تصاویر کی شیدائی ہیں۔ بارہا ذاکر صاحب نے شہیر اور بیگم شہیر کے قصے سنائے،
خدا اس جوڑی کو سلامت رکھے اور ان دونوں سے علی گڑھ کا نام روشن رہے۔

معاف کیجئے میں اپنی پٹری سے ہٹ گیا، کیوں معاف کیا جائے پٹری
سے ہٹنا تو تمہارا شعار بن گیا ہے، آیئے پھر اسی شہریار کا ذکر کیا جائے، شہریار
صاحب کی زندگی کا مقصد خوش رہنا اور بندگان خدا میں خوشیاں تقسیم کرنا ہے،
ایک مرتبہ شہریار صاحب سے ملنے گیا تو آپ کے داماد اور میرے دوست جناب
ڈاکٹر معراج صاحب کا فون آیا کہ آج بیٹی اشو کی Birth day ہے، اس پر
انہوں نے اپنی نواسی کو دعائیں دیں اور اس کے خوبصورت مستقبل کے لئے اللہ
کے حضور ہاتھ اٹھائے، اس کے بعد اپنے داماد سے ایک اہم بات یہ بھی کہی کہ یہ
خوشی کا مقام ہے اور اب زندگی میں خوشیاں کم آتی ہیں، یوں جانئے خوشیاں روٹھ
گئی ہیں، اس لئے اس خوشی کو خوب دھوم دھام سے مناؤ، اس کا کوئی لمحہ ضائع نہ
ہونے پائے، میں تم سب لوگوں کو اس ساعت سعید پر مبارک باد دیتا ہوں، اسی

طرح کا ایک واقعہ ہے کہ سرسید اکیڈمی کے Curator جناب ساجد نعیم صاحب اپنے ایک ساتھی کے ساتھ حیدرآباد ریسرچ کے کام سے جا رہے تھے، انہوں نے شہریار صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے مغنی تبسم کے نام ایک رقعہ تھما دیا، اس کی وجہ سے انہیں مغنی تبسم صاحب نے بڑی سہولیات فراہم کیں، شہریار صاحب کے مزاج میں یہ چیز شامل ہے کہ بندگانِ خدا کی مدد سب سے بڑی عبادت ہے اور یہی عبادت ہر دل عزیزی کا سب سے مؤثر ذریعہ بھی۔

شہریار صاحب کا ایک دن فون آیا کہ میری بیٹی صائمہ تمہارے مکان میں رہنا چاہتی ہے، میں نے کہا کہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے، مجھے اس رہائش کا ذکر اس لئے کرنا ہے کہ میرے یہاں اب تک بیشمار حضرات آچکے ہیں، لیکن ان لوگوں میں اولیت شہریار صاحب کی بیٹی ڈاکٹر صائمہ کو حاصل ہے، ایسی مہذب، ایسی منظّم اور محبتی مہمان نہ دیکھا کہ ایک سال سے اوپر رہے اور اس پورے عرصے میں صرف اظہار محبت کرتے رہے، اس تربیت اور تہذیب کو فروغ دینے والے والدین ہیں، داماد اور بیٹی کے یہاں چھوٹا پن نظر آیا ہی نہیں، ایسی خوبصورت اور دلکش دنیا بسانے والے دو راستوں پر چل پڑے ہیں، لیکن ان کے تربیت یافتہ بچے اپنے مؤسسین کو اسی طرح چاہتے اور اسی طرح ان سے لپٹتے ہیں، ایسی اولاد کی سمجھداری پر رشک آتا ہے، کاش کہ یہ دونوں راستے آگے چل کر مل جاتے، ہمارے مرحوم ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے بھی اپنا ایک الگ راستہ اختیار کر لیا تھا، لیکن بچوں نے کافی جدوجہد کے بعد دونوں راستوں کو ملانے میں کامیاب ہو گئے، مجھے امید ہے کہ ''اسم اعظم'' اور ''گم ہے اس میں آفاق'' ایک نہ ایک دن ضرور ملیں گے اور یہ دن میری زندگی کا سب سے حسین دن ہوگا۔ ''ہجر کے موسم'' پر نجمہ شہریار کے نام کو دیکھ کر دل مسوس کر رہ جاتا ہے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں، خدا کرے یہ خوبصورت جنت اور

بہشت بریں ایک بار پھر ہمیں ہمیشہ کے لئے مل جائے۔

آیئے اب کچھ شہریار صاحب کی شاعری سے دل بہلالیا جائے، اس میں کلام نہیں کہ اردو کے جدید شعراء میں دو نام خاکسار کے نزدیک بڑے معتبر ہیں ایک عرفان صدیقی اور دوسرے شہریار، یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ ہم شکرگزار ہیں کہ انہوں نے نثر میں اپنی فیاضی سے ہمیں باز رکھا، بعض نثری چیزوں کو دیکھ کر خاکسار بدحظ ہوا، اسی طرح شہریار صاحب اپنا کلام خود نہ سنائیں تو بڑا کرم ہوتا، آپ کا انداز بڑا ہی غیر مؤثر ہے، آپ کی اچھی خاصی شاعری کو آپ کی پیشکش چوپٹ کردیتی ہے، بہرکیف یہ تو ایک معمولی سی بات ہے، آپ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف زمانے کو ہے، نظم اور غزل دونوں میں یکتائیت اور انفرادیت حاصل ہے، پڑھیئے تو شاعری گرفت میں لینے لگتی ہے، اپنی آواز اور اپنا درد لگنے لگتی ہے، شمس الرحمٰن فاروقی اور وحید اختر نے شہریار کی شاعری کا اچھا جائزہ لیا ہے، خلیق انجم نے آپ کے امتیازات اور علامتوں کو ڈھونڈنے کی کامیاب کوشش کی ہے، یہ طفل مکتب شہریار کی شاعری کو کیا جانے؟ ویسے انہوں نے خود کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ میں جو کچھ ہوں یہ سب کرشمہ سازی خلیل الرحمٰن اعظمی کی ہے، مجھے بتانے اور کھڑا کرنے میں صرف اعظمی صاحب کا رول ہے، انسان بڑا ہونے کے بعد اور شہرت کی بلندیوں کو چھونے کے بعد اپنے محسنین کو فراموش کردیتا ہے، لیکن شہریار صاحب نے ایسا نہ کرکے عظمت کا ثبوت دیا ہے خلیل صاحب کے لئے انہوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ۔

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں؟

خلیل صاحب سے محبت اور تعلق کا حال یہ تھا کہ اپنے پہلے مجموعے ''اسم اعظم'' کا انتساب انہی کے نام کیا، مختلف مواقع اور آپ کی مختلف تحریروں میں خلیل الرحمٰن اعظمی سے آپ کا اظہار عقیدت موجود ہے۔ آیئے شہریار صاحب کی ایک

خوبصورت نظم ''عرفان کی آخری منزل'' نقل کی جائے، تا کہ نظم گوئی میں ان کی شعری گرفت کا اندازہ ہو سکے۔

کوئی رنگ اور زاویوں کی زبان جانتا ہے
کوئی تال سم کی فغاں جانتا ہے
کوئی لفظ و معنی کے جادو کو پہچانتا ہے
کوئی پتھروں میں چھپی داستانوں کے اسرار سے آشنا ہے
کوئی جس کے مدھ بھری وحشتوں، دکھ بھری کروٹوں کی ادا جانتا ہے
مگر کوئی اس سے سوا جانتا ہے
مگر کوئی خود کو خدا جانتا ہے

خاکسار ناقد نہیں ہے، نہ ہی اسے آکۂ پیمائش نصیب ہے کہ نظموں کے طول و عرض کو منظر عام پر لا سکے، نہ ہی ناقدین کی طرح پارٹی باز ہے کہ اپنوں کو اٹھائے اور دوسروں کو گرائے، آج کے ناقدین برساتی میڈک سے کم نہیں، بہر کیف اسے چھوڑیئے، خاکسار کو قدرے سخن فہمی رب ذو الجلال کی طرف عطا ہوئی، اسی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ انہیں بڑے شاعروں میں شامل کیا جا سکتا ہے جب ہمارے خلیق انجم صاحب نے انہیں ایک اچھا شاعر تسلیم کیا ہے تو ہمیں اس میں ٹانگ لڑانے کی کیا ضرورت؟ کوئی ہم کلیم الدین احمد تو ہیں نہیں کہ ہم فریضہ خرہمہ آن ادا کرتے رہیں، بہر کیف ان ناقدین سے اللہ کی پناہ، اب آیئے شہر یار صاحب کے کچھ غزلیہ اشعار سے محظوظ ہوا جائے۔

ایک وفا پیشہ نے کر لی ہے وفا سے توبہ — تذکرہ آج یہی کوچہ و بازار میں ہے
عمر بھر دیکھا کیے اس کی طرف یوں جیسے — سارے عالم کی حقیقت نگۂ یار میں ہے
زندگی میں ابھی خوشیاں بھی ہیں رعنائی بھی — زندگی سے ابھی دامن نہ چھڑا، مان بھی جا
پھر نہ کچھ ہوگا اگر بعد میں پچھتانا تو — وقت ہے اب بھی ذرا ہوش میں آ، مان بھی جا

جب بھی ملتی ہے، مجھے اجنبی لگتی کیوں ہے
زندگی روز نئے رنگ بدلتی کیوں ہے

مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو، مری وحشت کا سبب
بوئے آوارہ سے پوچھو کہ بھٹکتی کیوں ہے

عہد گل کا کوئی قصہ سنائیں گے تمہیں
تم بہت جاگ چکے اب نہ جگائیں گے تمہیں

یہ جگہ اہل جنوں! اب نہیں رہنے والی
فرصت عشق میسر کہاں پہلے والی

کوئی صورت ہو کہ آگ پھر رگ و پے میں بہے
راکھ کو بننے کو بکھرنے کو جی چاہتا ہے

شہر یار کے ان اشعار سے کسی حد تک ان کی فکری حیات اور فکری سوتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، شہر یار کی شاعری میں تین مضامین واضح طور سے موجود ہیں، ایک تو محبوب کی بڑی سچی تصویر کشی کی گئی ہے، لیکن اس تصویر کو حالات حاضرہ سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا، تصویر یار دراصل تصویر عہد سے الگ کی ہی نہیں جاسکتی، دوسرے اپنی کیفیات اور باطنیات کو خوبصورت آہنگ دیا ہے، اپنے دکھ درد کے ساتھ اپنے خرابے میں اپنی تنہائیوں سے ہم کلام ہیں، لیکن ''خود کلامی'' کی طرح نہیں، تنہائیوں سے باتیں کرنے والا سب سے بڑا شاعر صرف ناصر کاظمی تھا۔ ماضی کی رعنائیوں پر کف افسوس کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں ہے، ان کی شاعری میں انہی رعنائیوں کی جھنکار ہے انہیں ان کی بے وفائیوں سے غرض نہیں وہ تو صرف دنیائے محبت کے پجاری ہیں، وہ پھول سے ہاتھ کو فراموش کر دیں یہ ممکن نہیں، شہر یار کی شاعری کی ایک تیسری جہت عہد جدید کی ترجمانی ہے، اس میں عصری حسیات، زمانے کے انقلابات اور نت نئی تصاویر کی ترجمانی ہے، یہ ایک چھوٹا سا غیر عالمانہ نیز غیر ناقدانہ تجزیہ ہے، اس کا لب لباب یہ ہے کہ شہر یار عہد حاضر کے اچھے شعراء کی صف اول میں شامل ہیں، بڑے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ علی گڑھ کی شاعری کی ایک بڑی آواز اسعد بدایونی خاموش ہوگئی، شہر یار ایک اچھے انسان اور ایک اچھے شاعر دونوں ہیں، پتہ نہیں رشید احمد صدیقی کا یہ خیال کہاں تک درست ہے کہ ایک اچھا انسان ہی اچھا

شاعر بن سکتا ہے، شہریار کی شاعری کی عظمت اور شہرت کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ اس کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

شہریار کا رنگ گورا لیکن شاعری میں مزید گوراپن، قد لانبا پر زمین پر رہنے کی خواہش اور زمین پر بسنے والوں سے رشتہ استوار کرنے کی آرزو، اخلاص اور غم گساری سے پیشہ قدیم، سادگی اور یار باشی سے عشق ومحبت، اپنے چھوٹوں سے شفقت اور ان کی عزت افزائی، ایک بار اس ناچیز سے فرمانے لگے، دیکھو ''فکرونظر'' کا شبلی نمبر نکلنے جا رہا ہے، تمہیں اس کے لئے مضمون بھی لکھنا ہے اور میری مدد بھی کرنی ہے، شہریار سب کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی ایک عجوبہ موپٹ سے چلتے رہے جس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی، چلتی تو کیا جھنکار ہوتی، ایک شاعر کی وجہ سے خود بھی شاعر بن گئی تھی۔ اپنے عزیز پرویز کی دم بدم خبر گیری آپ کے فرائض میں شامل ہے، یہی وجہ ہے کہ سورج نکلتے ہی پرویز اپنے چچا کی ضروریات کی تکمیل کے لئے چل پڑتے ہیں، جب کبھی سوال کیا کہ کہاں؟ بس یہی جواب کہ چچا کی خدمت میں، آپ کے عزیز پروفیسر یوسف امین صاحب نے بھی آپ کو انسان دوستی پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر شہر اور ہر ملک آپ کے چاہنے والوں سے بھرا پڑا ہے، یہ مقالہ بھی آپ کے ایک چاہنے والے علیگ محترم شہیر صاحب کی فرمائش پر رقم کیا جا رہا ہے، شہریار صاحب کو اپنے شہر یار علی گڑھ سے غیر معمولی لگاؤ ہے، ابھی حالیہ بیماری میں جب ان کی طبیعت کچھ سنبھلی تو ان کے بچوں نے انہیں لاکھ روکنا چاہا لیکن ان کا ایک ہی اصرار کہ مجھے علی گڑھ جانے دو، اسی شہر نے انہیں ان بلندیوں تک پہنچایا، انہیں شاعری کرنا سکھایا اور اپنی آبائی ڈگر سے ایک الگ راہ نکالی، ہم سب لوگوں کی دعا ہے کہ انہیں صحت نصیب ہو اور ان کی بسائی ہوئی دنیا انہیں ایک بار پھر مل جائے۔

حضرت علیؓ کی نعت گوئی

ابوسفیان اصلاحی

حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب سے کتابیں مملوٴ ہیں، مختلف خصوصیات کے ساتھ آپ زبان وبیان اور فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے نمایاں حیثیت کے حامل تھے، جس کی پرورش سایۂ نبوت میں ہوئی ہو اس کے انداز تکلم اور قرینۂ بیان کا کیا پوچھنا؟ ''نہج البلاغہ'' کا حرف حرف، لفظ لفظ آپؓ کے علمی علوءِ مرتبت اور شگفتیٔ تحریر پر دال ہے، امتیاز علی عرشی نے نہج البلاغہ کے استناد پر مدلل گفتگو کی ہے لیکن اس کے باوجود الحاق سے کلی انکار ممکن نہیں، کچھ محققین اسے حضرت علیؓ کی تحریر مانتے ہی نہیں جو دیانت کے منافی ہے، یہ کتاب خزینۂ حکمت ہے، اس کا سب سے امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس میں قرآنیات کا ایک قابلِ قدر حصہ ہے اور بہت سی آیات کریمہ کی تفسیر بیان کی گئی ہے، اگر اسے علاحدہ شائع کردیا جائے تو ایک بڑا علمی کام ہوگا، حضرت علیؓ کی ذات گرامی کا ایک دوسرا بین پہلو ''دیوان علیؓ'' ہے، یہی دونوں چیزیں دیگر صحابہ کرام سے وجہ اِمتیاز بنی ہوئی ہیں، یہاں صرف اشارہ کرنا کافی ہوگا کہ اس کا بہت سا حصہ الحاقی ہے، بعض صحابۂ کرام کے متعلق جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ حضرت علیؓ سے ہرگز ممکن نہ تھی، آپ جس وقار اور سکینت وزینت کے حامل تھے اس سے اس کا صدور مستبعد تھا، ویسے دیوانِ علی کی متعدد محاسن ہیں، ایک تو مختلف مراثی اور مدائح سے آنحضور ﷺ کی اعلیٰ شخصیت کی تصویرکشی کی گئی ہے، آپ نے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار کیا ہے،

مقام نبوت کی تشریح کی گئی ہے، دشمنانِ نبوت کے اخروی نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے، حضرت ابوطالب، حضرت خدیجہ، حضرت فاطمہ، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی خوبیاں بھی بیان کی گئی ہیں، اہل بیت کے اعزاز و اکرام کو منظرِ عام پر لانے کی سعی کی گئی ہے، کئی قصائد میں حضرت حسن اور حسین کو تلقین بھی کی گئی ہے، متعدد قصائد میں اللہ سے دادرسی بھی کی گئی ہے، تقویٰ اور للّٰہیت پر زور دیا گیا ہے، علم و فن کی برتری بیان کی گئی ہے، حضرت علیؓ نے متعدد مقامات پر اپنی اعلیٰ نسبی پر افتخار جتایا ہے، آپ کی اعلیٰ حسبی پر کسے کلام ہوسکتا ہے؟ لیکن انداز سے مترشح ہے کہ افتخار و اظہار کا یہ طرز حضرت علیؓ کا نہیں ہوسکتا، بہت سی جنگوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے، دیوانِ حضرت علیؓ کے اور بھی بہت سے نکات بیان کئے جاسکتے ہیں، لیکن اس مضمون میں صرف آپؓ کی نعت گوئی موضوع بحث ہے۔

بے شمار ایسی احادیث ہیں جن سے ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ کو آپ ﷺ سے حد درجہ عقیدت تھی اس والہانہ عقیدت میں نسبی اور دینی دونوں جذبات کارفرما تھے، اسی طرح آپ ﷺ بھی آپؓ کو بے پناہ چاہتے تھے، دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی، انہیں پورا یقین تھا کہ دین مصطفیٰ ﷺ کے بغیر تہذیب وتمدن کا تصور نہیں۔

من لم یؤدبہ دین المصطفیٰ أدباً
محضاً تحیّر فی الأحوال واضطربا

(اگر دین مصطفیٰ کسی کو مؤدب نہ بنا سکے تو وہ (پریشان کن) احوال میں سرگرداں اور مضطرب رہے گا)

حضرت علیؓ کی محبت وعقیدت کا مظہر اس مرثیہ میں دیکھا جاسکتا ہے جو آپؓ نے روضہ انور کی زیارت کے بعد کہا ہے، اس میں کمالِ محبت کا دریا موج

زن ہے۔

ماغاض دمعی عند نائبة

الاجعلتک للبکاء سبباً

(مصیبت کے وقت میرے آنسو رکنے کو نہ تھے، کیونکہ میں نے آپؐ (کی وفات) کو وجہِ گریہ بنالیا تھا)

وإذا ذکرتُک سامحتک به

منی الجفونُ ففاضا وانسکبا

(اور جب بھی میں نے تم کو یاد کیا تو میری پلکوں نے تجھ پر آنسو نچھاور کیئے، حتی کہ آنسو کے پرنالے بہہ پڑے)

إنی أجلّ ثریً حللت به

عن أن أریٰ لسواه مکتئبا

(آپؐ جس مٹی میں قیام پذیر ہیں وہ میرے نزدیک جلیل القدر ہے، آج میں خلقِ خدا میں افسردہ ہوں)

مذکورہ اشعار سے حضرت علیؓ کے اندرونی جذبات اور آپؐ سے قلبی تعلق کو سمجھا جاسکتا ہے، بالکل ابتداء میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ دینِ مصطفیٰ کی اتباع واقتداء کے بغیر تہذیب کا تصور ممکن نہیں اور اب یہ بتایا جارہا ہے کہ آپ کی تکذیب کرنے والوں کی جھولی میں ناکامی ونامرادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

خسرتم بتکذیبکم للرسول

تعیبون ما لیس بالعائب

(اللہ کے رسول ﷺ کی تکذیب کی وجہ سے تم خسارہ میں رہے، تم لوگ اس ذات (اقدس) کو عیب لگاتے ہو جو بے عیب ہے)

وكذبتموه بوحي السماء

الا لعنة الله على الكاذب

(وحی آسمانی کے تعلق سے تم لوگوں نے اس کی تکذیب کی، ایسے کاذبین پر اللہ کی لعنت ہو)

اسی استہزاء اور تکذیب کی ایک تصویر سورہ ''تبت'' میں اتاری گئی ہے، جس میں ابولہب اور اس کی بیوی کی ذہنیت اور ان کے اخروی نتائج بیان کئے گئے ہیں، مولانا حمید الدین فراہی نے اپنی تفسیر ''نظام القرآن'' میں اس کی بہترین تفسیر بیان کی ہے، دیگر مفسرین سے الگ راہ نکالی ہے، اسی سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے ایک مقالہ میں مولانا عبدالسلام ندوی نے مولانا فراہیؒ کے اسی نقطۂ نظر کو بیان کیا ہے، یہاں ''تبّ ید'' سے ہاتھ ٹوٹنا نہیں بلکہ بے دست و پا ہونا مراد ہے، یہی مفہوم حضرت علیؓ کے اس احساس میں موجود ہے۔

أبا لهب تبت يداك ابا لهب

وصخرة بنت الحرب حمالة الحطب

(اے ابولہب! تمہارے دونوں ہاتھ ناکارہ ہو گئے اور حرب کی بیٹی صخرہ لکڑیاں اٹھانے والی ہوگی)

خذلت نبي الله قاطعة رحمه

فكنت كمن باع السلامة بالعطب

(تو نے نبی خدا کے رشتہ سے خود کو منقطع کر کے رسوائی مول لی، تمہاری مثال اس خریدار کی سی ہے جس نے سلامتی کے عوض ہلاکت مول لی ہے)

قرآن کریم نے ان لوگوں کو نادان اور ناسمجھ قرار دیا ہے جنہوں نے دعوتِ رسول پر لبیک نہیں کہا، اسی حضرت علیؓ نے آپؐ کے ان اعزاء کو بھی ناکام و نامراد قرار دیا ہے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقدری کی، حضرت علیؓ نے ہمیشہ

آپؐ کے وقار اور آپؐ سے اپنے رشتے کو ملحوظ رکھا، اسی تعلق کا اظہار آپؓ نے اس انداز میں کیا ہے۔

نفسی علی زفراتها محبوسة

یالیتها خرجت مع الزفرات

(میری جان اپنی ہچکیوں میں مقید ہے، اے کاش! یہ انہی ہچکیوں کے ساتھ دم توڑ دیتی)

لاخیر بعدک فی الحیاة وإنما

أبکی مخافة أن یطول حیاتی

(آپ ﷺ کے بعد زندگی بے کیف ہے اور مجھے محض اندیشہ اس بات کا ہے کہ کہیں یہ زندگی طول نہ پکڑ جائے)

اس مرثیہ سے واضح ہے کہ آپؐ کے انتقال کے بعد آپؓ کس قدر غموں سے چور تھے، زندگی اتنی گراں بار اور اس قدر پھیکی تھی کہ اس سے عاجز آچکے تھے اور زندگی کا ہر لمحہ گلے کی پھانس بنا ہوا تھا، زندگی ایسی تاریک ہوئی کہ طول حیات کا اندیشہ ساتھ ساتھ رواں رہا، ایک دوسرے مرثیہ میں اپنے درد و کرب کے اظہار کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ سے اپنے اخلاص اور غیر معمولی عقیدت کو پیش کیا ہے۔

ألا طرق الناعی بلیل فراعنی

وأرقنی لما استهل منادیاً

(کیا منظر تھا جب (آپؐ کی موت) کی خبر دینے والے نے خبر دی تو مجھ پر خوف طاری ہو گیا اور منادی کی پہلی آواز نے میری نیند اڑا دی)

فقلت له لما رأیتُ الذی أتی

أغیر رسول الله أصبحت ناعیا

(میں نے خبر دینے والے کو دیکھتے ہی کہا کہ کیا تم رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کی موت کی خبر دینے والے ہو)

فحقق ما أشفقتُ منه ولم يبل

وكان خليلي عدتي وجماليا

(جس بات کا مجھے اندیشہ تھا وہ سچ ثابت ہوئی اور اس خبر نے میری پرواہ نہ کی، یقیناً وہ میرے گاڑھے دنوں کا مونس اور آرائش (حیات) تھا)

فوالله ما أنساک احمد ما مشت

بی العیسُ یوماً وجاوزتُ وادیا

(واللہ اے احمد! جب تک اونٹ مجھے لئے لئے پھرتے رہیں گے اور میں وادیوں کو طے کرتا رہوں گا تب تک یہ تمام چیزیں مجھے تم سے دور نہیں کرسکتیں)

لبيک رسول الله خيل مغيرة

تثير غباراً كالضبابة كابيا

(تیز گام گھوڑوں پر سواری کرنے والوں کو اللہ کے رسول ﷺ (کے جانے) پر اشکبار ہونا چاہیے، یہ وہ گھوڑے ہیں جو ابر ہائے تیرہ کی مانند غبار اڑاتے ہیں)

لبيک رسول الله صف مقدم

إذا كان ضربُ الهام نفقاً تفاليا

(صف مقدم کو چاہیئے کہ اللہ کے رسول پر گریہ وزاری کریں، جس وقت کھوپڑیوں کے توڑنے اور توڑنے کا مسئلہ درپیش ہو)

مذکورہ مرثیہ میں کئی اشعار ہیں جس میں اس بات کی عکاسی کی گئی ہے کہ رحلت رسول ایک سنگین مسئلہ ہے جس نے حضرت علیؑ کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے،

آپؓ کا کہنا ہے کہ میدانِ کارزار کے سپاہیوں کو بھی اپنے فرائض سے قطعِ نظر کرتے ہوئے اس حادثہ عظیم پر رونے کی ضرورت ہے، یہ بھی صراحت کی گئی کہ یہ ذاتِ انور تا حیات ہمارے تصوّرات سے اوجھل نہیں ہو سکتی۔

اس دیوان میں ایک مرثیہ حضرت ابو طالب کی شان میں کہا گیا ہے، آخری اشعار میں آپؐ کی عظمت و رفعت پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان اشعار میں آپ ﷺ کی منزلت اور قدرے حلیۂ مبارک کی ثنا خوانی کی گئی ہے اور تصدیق نبوت کا اعلان کیا گیا ہے۔

وإلا فإن الحی دون محمد

بنوها شم خیر البریة محتدا

(اور یہ حقیقت ہے کہ قبیلۂ بنو ہاشم اللہ کے رسول ﷺ کے نزدیک تمام مخلوق سے بہتر اور اصیل النسب ہے)

وإن له فیکم من الله ناصرا

ولستُ بلاق صاحب الله أوحدا

(اور بیشک تمہارے اندر اللہ کی جانب سے اس کے مددگار ہیں اور میں حبیب خدا کو زمانے میں تنہا دیکھنے والا نہیں ہوں)

نبی أتی من کل وحی بخطة

فسماهُ ربی فی الکتاب محمدا

(یہ وہ نبی ہے جو ہر وحی کے ذریعہ ایک واضح پیغام لے کر آیا، پس رب ذوالجلال نے قرآن کریم میں اسے محمد سے یاد کیا)

أغرّ کضوء البدر صورةُ وجهه

جلی الغیم عنه ضوئه فتوقد

(آپ ﷺ کا چہرۂ انور بدرِ کامل کی طرح روشن ہوا، اور بدر کامل کی ضیاء پاشیوں نے اسی چہرۂ تاباں کی وجہ سے بادلوں کو روشن کیا تو وہ روشن ہو گئے)

ایک قصیدہ میں ایک طرف حضرت علیؓ اپنی اعلی نسبی پر فرحاں وشاداں ہیں تو دوسری طرف یہ وضاحت کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ ہمارے تمام عز ووقار کا دارو مدار ذاتِ رسول ﷺ پر ہے، ہمارے گھروں کی عظمت کا یہ حال ہے کہ آپؐ کی وجہ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام ہمارے گھروں کا چکر کاٹتے ہیں، آپ ﷺ کی ذات گرامی نے ہمیں تمام اقوام وملل سے اعلیٰ وافضل بنا دیا۔

الله اكر منا بنصر نبيه

وبنا أقام دعائم الإسلام

(اللہ نے ہمیں اپنے نبی کے معین ومددگار ہونے کی وجہ سے اکرام واعزاز دیا اور ہمارے تعلق سے اللہ نے ارا کین اسلام کو بلند کیا)

وبنا أعزّ نبيه وكتابه

وأعزّنا بالنصر والإقدام

(اور ہمارے ہی تعلق سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ اور کتاب حکیم کو استحکام بخشا اور دین اسلام کی مدد اور اس کے لئے برسرپیکار ہونے کی وجہ سے اللہ نے ہمیں تقویت عطا کی)

ويزورنا جبريل وفي أبياتنا

بفرائض الإسلام والأحكام

(اور حضرت جبرئیل علیہ السلام فرائض اسلام اور (دینی) احکام کے ساتھ ہمارے گھروں کی زیارت کرتے رہتے ہیں)

نحن الخيار من البرية كلها

ونظامها وزمام كل زمام

(ہم لوگ تمام مخلوق سے برتر ہیں اور ہم خلق خدا کے لئے رشتۂ پیوند ہیں اور ہر مہار کے لئے مہار ہیں)

دیوانِ علیؓ میں بیشمار ایسے اشعار ہیں جن کے تعلق سے اپنے حسب ونسب پر فخر کیا گیا ہے اور مختلف انداز میں اپنی خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے، اس طرح کے اشعار سے یہی پہلو سامنے آتا ہے کہ اظہار ومباہات کا یہ طریقۂ کار حضرت علیؓ کا نہیں ہوسکتا، آپؓ کے اتقاء، زہد وورع، منکسر المزاجی اور وسیع القلبی سے یہ چیزیں میل نہیں کھاتیں، اسی طرح کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

أناعلی المرتجی دون العلم

مرتهن للحين موفٍ بالذمم

(میں علی ہوں جو بلندئ علم کے وقت مرکزِ امید ہوتا ہے، یہی علی موت کے لئے سینہ سپر اور عہد و پیمان کو وفا کرنے والا ہے)

انصر خير الناس مجداً كرماً

نبی صدق راحماً وقدعلم

(میں اس شخص کا مساعد ہوں جو تمام لوگوں میں مجد وشرافت کے اعتبار سے برتر ہے، نبی صادق اور کرم فرما ہے اور خوب جاننے والا ہے)

إنی سأ شفی صدره وأنتقم

فهو بدين الله والحق معتصم

(یقیناً میں عنقریب اس کے سینہ کے لئے باعث شفا ہوں گا اور (دشمنان رسولِ) سے انتقام لینے والا ہوں اور آپ ﷺ دینِ خدا اور حق کی پناہ لینے والے ہیں)

جنگِ خندق کے حوالہ سے بھی آنحضور ﷺ کی ستائش کی گئی ہے اور

رسولِ خدا کے توسط سے اپنی افضلیت ثابت کی گئی ہے۔

ومحمد فینا کأن جبینه

شمس تجلت من خلال غمام

(اور محمد ﷺ ہم میں قیام فرما ہیں، آپؐ کی پیشانی اس سورج کی مانند ہے جو بادلوں کے درمیاں شعاع ریز ہے)

والله ناصرُ دینه ونبیه

ومعین کل مؤحد مقدام

(اور اللہ تعالیٰ اپنے دین اور اپنے حبیب ﷺ کا حامی وناصر ہے اور ہر علم بردارِ توحید کا معاون ہے)

شهدتُ قریش والقبائل کلّها

أن لیس فیها من یقوم مقام

(قریش اور تمام قبائل کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ان میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اس کا قائم مقام بن سکے)

امتِ مسلمہ نے اللہ کے رسول ﷺ کے تعلق سے چند ایسے خیالات وضع کئے ہیں جن کا دینِ اسلام اور شخصیتِ رسول ﷺ سے کوئی یارا نہیں ہے، اسی میں سے ایک آپؐ کی موت بھی ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپؐ صرف پردہ فرما گئے ہیں، قبر میں زندہ ہیں، بعض حضرات نے تو قبر سے ہاتھ نکالنے تک کا ذکر کیا ہے، آپؐ کے انتقال کے وقت حضرت عمرؓ نے اپنے اضطراب کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس کسی نے یہ کہا کہ آپ ﷺ کا انتقال ہو گیا ہے اس کی گردن اڑا دوں گا، آپؓ کے اس انتہائی رنج وقلق کا علاج حضرت ابو بکرؓ کی دانشمندی ثابت ہوئی، حضرت عمرؓ کے جذبات کو قابو کرنے کے لئے اللہ کے رسول ﷺ اور

خلیفۂ اول نہایت مؤثر ثابت ہوئے، بہر کیف اللہ کے رسول ﷺ کی موت کے تعلق سے قرآن کریم نے واضح طور سے اعلان کر دیا

”وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل أفإن مات أو قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئا وسیجزی اللہ الشاکرین“. (آل عمران: ۳/۱۴۴)

حضرت محمد ﷺ صرف رسول ہی ہیں، ان سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے ہیں، کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید ہو جائیں تو تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے، اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو ہرگز اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا، عنقریب اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو نیک بدلہ دے گا۔

مذکورہ آیت کریمہ کی تفسیر میں مندرجہ اقتباس مناسب ہوگا۔

”محمد ﷺ صرف رسول ہی ہیں یعنی ان کا امتیاز صرف وصف رسالت ہی ہے، یہ نہیں کہ وہ بشری خصائص سے بالاتر اور خدائی صفات سے متصف ہوں کہ انہیں موت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

جنگِ احد میں شکست کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کافروں نے یہ افواہ اڑادی کہ محمد ﷺ قتل کر دیئے گئے، مسلمانوں میں جب یہ خبر پھیلی تو اس سے بعض مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے اور لڑائی سے پیچھے ہٹ گئے، جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ نبی کا کافروں کے ہاتھوں قتل ہو جانا یا اس پر موت کا وارد ہونا کوئی نئی بات تو نہیں ہے، پچھلے انبیاء بھی قتل اور موت سے ہم کنار ہو چکے ہیں، اگر آپ بھی (بالفرض) اس سے دوچار ہو

جائیں، تو کیا تم اس دین ہی سے پھر جاؤ گے، یاد رکھو جو پھر جائے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا، نبی کریم ﷺ کے سانحۂ وفات کے وقت جب حضرت عمرؓ شدتِ جذبات میں وفاتِ نبوی کا انکار کر رہے تھے تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے نہایت حکمت سے کام لیتے ہوئے قبرِ رسول کے پہلو میں کھڑے ہو کر انہی آیات کی تلاوت کی جس سے حضرت عمرؓ بھی متأثر ہوئے اور انہیں محسوس ہوا کہ یہ آیات ابھی ابھی اتری ہیں'' (تفسیر احسن البیان: دارالسلام، ریاض، ص:۲۰۲)۔

حضرت علیؓ نے اسی مفہوم کی ترجمانی اپنے دیوان میں کی ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو دائمی زندگی نہیں عطا کی ہے بلکہ عام انسانوں کی طرح آپ ﷺ بھی اس دنیا سے تشریف لے گئے، آیت کریمہ ''کل نفس ذائقة الموت'' کی ترجمانی آپ نے اس اسلوب میں کی ہے۔

کان النبی ولم یخلد لأمته

لو خلّد الله خلقاً قبله خلدا

(نبی ﷺ (پچھلے دنوں ہمارے درمیان) تھے، وہ اپنی امت کے درمیان ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں آئے تھے، اگر آپ ﷺ سے قبل کسی خلق کو دوام عطا کیا گیا ہوتا تو آپ کو ضرور دائمی زندگی عنایت کی جاتی)

للموت فینا سهام غیر خاطئة

من فاته الیوم سهم لم یفته غداً

(ہمارے لئے موت نے خطا نہ کرنے والے تیر رکھ چھوڑے ہیں، اگر آج کوئی اس تیر سے بچ گیا تو کل وہ اس سے نہ بچ سکے گا)

حضرت علیؓ کے مذکورہ بالا دونوں شعر کی روشنی میں یہ بات یقینی طور پر کہی

جا سکتی ہے کہ وہ اس خیال کے قائل تھے کہ عام انسانوں کی طرح اللہ کے رسول ﷺ کی موت واقع ہوئی ہے، یہی نقطۂ نظر قرآن کریم اور اسلام کا بھی ہے۔

آگے دو شعر پر مشتمل ایک مرثیہ ہے جس کا پہلا شعر نہایت اہم ہے، اس میں حضرت علیؓ نے آپ ﷺ کو اپنی آنکھ کی ''سیاہ پتلی'' (السواد لناظری) قرار دیا ہے، اس سے عشقِ رسول ﷺ کی انتہا اور عقیدت کی حد درجہ غایت کو سمجھا جا سکتا ہے، دونوں شعر میں عشق رسول متلاطم ہے۔

کنت السوادَ لناظری

فبکی علیک الناظر

(آپ ﷺ میری آنکھ کی سیاہ پتلی تھے پس یہ آنکھیں آپ ﷺ پر جوئے بار ہیں)

من شاء بعدک فلیمت

فعلیک کنت اُحاذر

(اگر کوئی شخص آپ ﷺ کے بعد زندگی کا طالب ہے تو اس پر تف ہے، پس میں تو اسی چیز (موت) کا آپؐ کے باب میں خوف کھاتا تھا)

دیوانِ حضرت علیؓ میں ہجرتِ مدینہ کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ جلی حروف سے لکھا گیا ہے، یہ بات بھی معروف ہے کہ جب ہر طریقے سے نعوذ باللہ آپ ﷺ کے سر کو قلم کرنے کی تدبیر کی گئی تو اس رات اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو سلا کر آپ ﷺ غار حراء میں چلے گئے، یہ حضرت علیؓ کی اتنی بڑی قربانی ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اسی قربانی کا ذکر اس قصیدے میں موجود ہے۔

وقیت بنفسی خیر من وطئ الحصیٰ

ومن طاف بالبیت العتیق وبالحجر

(میں نے اپنی جان کو (جوکھم میں) ڈال کر اس شخص کو بچایا جو سنگریزوں کو روندنے والوں، خانہ کعبہ کا طواف کرنے والوں اور حجراسود (کا بوسہ دینے والوں سے) بہتر رہے)۔

رسول الٰہ الخلق إذامکروابہ

فنجاہ ذوالطول الکریم من المکر

(رسول ﷺ کو جب اللہ کی مخلوق نے گھیر لیا تو اس گھراؤ سے اسے رب قدیر وکریم نے بچایا)

وبتّ أراعیھم متیٰ یشروننی

وقد وطّنت نفسی علی القتل والأسر

(اور میں پوری رات انہیں کی طرف دھیان لگائے ہوئے تھا، جب کہ انہوں نے میرے ہوش اڑارکھے تھے اور میرے نفس کو (اپنے) قتل یا قید کا یقین ہو چلا تھا)

وبات رسول اللہ فی الغار آمنا

مؤقّیً وفی فظ الإ الٰہ وفی ستر

(اور اللہ کے رسول ﷺ نے غار میں پرسکون شب باشی کی، محفوظ رہے اور اللہ کی امان اور پردہ میں رہے)

اقام ثلاثاً زمت قلائص

قلائص یفرین الحصیٰ أینما یفری

(تین دن آپ ﷺ کا قیام رہا، اس کے بعد اونٹ سواری کے لئے تیار کئے گئے، سواریوں نے آنے والے ریگستانوں کو طے کیا)

اردتُ بہ نصر الالٰہ تبتلا

واضمرتُہ حتی أُوسّدُ فی قبری

(دنیا کو تج کر آپؐ سے نصرت خداوندی کا میں خواستگار ہوا، اور میں نے اسے دلنشیں کیا، یہاں تک کہ اس سے لیٹ کر اپنی قبر میں سو گیا)

دیوان علیؓ میں ایسے بیشمار اشعار ہیں جن میں حضرت علیؓ نے اپنے حسب ونسب کی افضلیت کا ذکر کیا ہے، حضرت ابوبکرؓ اور دیگر صحابہؓ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی اعلیٰ نسبی کی طرف اشارہ کیا ہے، اہل بیت کی بلندیوں کا بھی بار بار تذکرہ ہے اپنی دینی خدمات پر اظہار خیال کیا ہے، تمام قبائل اور دنیا کے دیگر لوگوں سے خود کو اعلیٰ وارفع قرار دیا ہے، اس خیال اور اندازِ بیان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اس ادعاء، تعلی اور افتخار کی توقع حضرت علیؓ سے نہیں کی جا سکتی، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی قربت اور رشتے کو کون نہیں جانتا؟ لیکن کیا حضرت علیؓ جیسے حلیم، بردبار، متقی اور متدین صحابی سے اس امتیاز کا گردانا ممکن ہے؟ اس طرح کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

قد علمت خيبر أنى مرحب

شاكى السلاح، بطلٌ، مجرب

(خیبر کو بخوبی معلوم ہے کہ میں مرحب ہوں، ہتھیار بند، بہادر اور تجربہ کار ہوں)

أنا على وابن عبد المطلب

مهذب، ذو سطوة و ذو غضب

(میں علی ہوں اور عبدالمطلب کا بیٹا ہوں، تہذیب یافتہ، صاحبِ قدرت اور حاملِ غیظ وغضب ہوں)

أناعلى وابن عبد النسب

اخو النبى المصطفى المنتخب

(میں علی ہوں اور عبدالمطلب کا بیٹا ہوں، نبی مصطفیٰ اور مرتضیٰ ﷺ کا بھائی ہوں)

أنا علی واعلی الناس فی النسب
بعد النبی الھاشمی المصطفی العرب

(میں علی ہوں اور بنی ہاشمی عربی مصطفیٰ ﷺ کے بعد حسب ونسب کے اعتبار سے تمام لوگوں سے برتر ہوں)

لقد علم الأناس بأن سھمی
من الإسلام یفضل کل سھم

(تمام لوگوں کو بخوبی معلوم ہے کہ اسلامی رو سے میرا حصہ ہر حصہ سے اعلیٰ وافضل ہے)

واحمد النبی أخی وصھری
علیہ اللہ صلی وابن عمی

(اور نبی احمد میرے بھائی اور میری زوجہ کے والد محترم ہیں، اس پر اللہ کی جانب سے درود وسلام ہو، وہ میرے پسرِ عم بھی ہیں)

حضرت امیر معاویہؓ کو ایک قصیدہ میں حضرت علیؓ نے نہایت عتاب انداز میں خطاب کیا ہے یہاں قبولِ اسلام میں اپنی اولیت اور انتساب وانتماء میں اپنی اعلیٰ منزلیت کا بھی اظہار کیا ہے، مختلف حوالوں سے آپؓ نے اپنی رفعت نسب پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔

محمد النبی اخی وصھری
وحمزۃ سید الشھداء عمی

(محمد نبی ﷺ میرے بھائی اور میری زوجہ کے پدر ہیں اور سید الشہداء

حضرت حمزہؓ میرے چچا ہیں)

وجعفر الذی یضحی ویمسی

یطیر مع الملائکۃ ابن عمی

اور جعفر کی ذات ایسی ہے جو ملائکہ کے ساتھ صبح وشام پرواز کرتی ہے، یہ میرا حقیقی بھائی ہے)

وبنتُ محمد سکنی وعرسی

مسوب لحمها بدمی والحمی

(اور دخترِ نبی میری تسکینِ خاطر ہے میری زوجہ ہے اور اس کا گوشت میرے خون اور میرے گوشت سے پیوست ہے)

وسبطا احمد ولدای منها

فمن منکم له سهم کسهمی

(اور احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں نواسے اسی سے ہیں جو میرے بیٹے ہیں، پس تم میں کوئی ہے جس کا نصیبہ میرے نصیبہ جیسے ہو)

اس طرح کے ڈھیروں اشعار دیوانِ حضرت علیؓ میں موجود ہیں جو زبان دبیان اور فکری اعتبار سے حضرت علیؓ کے ہونے کی شہادت نہیں پیش کرتے، جس حضرت علیؓ نے ''نہج البلاغہ'' میں یہ کہا ہو کہ لوگوں میں اس طرح رہو کہ لوگ تم سے ملنے کی خواہش کریں اور مرو تو تمہارے جانے پر اظہار افسوس کریں، کیا وہ اس طرح اپنے حسب ونسب کو لے کر خلقِ خدا سے خود کو اعلیٰ وافضل قرار دے سکتے ہیں، اس میں بہت سے ایسے اشعار ہیں جن کا مزاج حضرت علیؓ کے مزاج سے میل نہیں کھاتا، معنوی نقطۂ نظر سے دیوانِ علی اور نہج البلاغہ میں اکثر مقامات پر تعارض وتضاد ہے۔

دیوانِ حضرت علیؓ کے ایک طویل قصیدہ میں آپ ﷺ کے حلیۂ مبارک کی تصویر کشی کی گئی ہے، اس میں محبت، صداقت، دیانت اور رصانت تیرتی ہوئی نظر آرہی ہے، زبان و بیان کا ایسا رچاؤ اور انداز واظہار میں ایسا بہاؤ ہے کہ نہ پوچھیے، پڑھتے ہوئے عجیب لذت وفرحت، حلیۂ مبارک سے انبساط وانشراح ایسا کہ دل میں صرف حلیۂ مبارک سے شیفتگی، بار بار اسے پڑھنے اور اس کے آب شار میں نہانے کو جی چاہے، بات بھی سچ ہے کہ حضرت علیؓ سے بہتر کون ہے جو حلیۂ مقدس کی تصویر اُتارے:

قرن الملاحۃُ طینہ

والحسن صار قرینہ

(ملاحت آپ کی سرشت میں سمائی ہوئی ہے اور حسن آپ ﷺ کا ساتھی ہے)

صلی علیہ الٰھنا

(ہمارے رب کی آپ ﷺ پر رحمت نازل ہو)

صار القلوبُ جمالہ

نتاع الأ فاق جلالہ

(تمام قلوب آپ ﷺ کے حسن کے شکار ہوئے، چار دانگ عالم میں آپ ﷺ کا جلال نمایاں ہے)

صلی علیہ الٰھنا

(ہمارے رب کی آپ ﷺ پر عنایت ہو)

والبدرُ یقصر نورہ

إذا ما استبان ظھورہ

(جس وقت آپ ﷺ کا ظہور نمایاں ہوا تو بدر کامل کا نور آپؐ کے

سامنے پھیکا پڑ گیا)

صلی علیہ الٰھنا

(آپ ﷺ پر اللہ کا درود وسلام ہو)

مربوعُ قد کأنہ

واللہ أعظم شانہ

(آپ ﷺ کا قد درمیانہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے مرتبہ کو بلند کردیا)

صلی علیہ الٰھنا

(ہمارے رب کی آپ ﷺ پر کرم ہو)

کا اللیل سود شعرہ

فاض العجائب بحرہ

(آپؐ کے بالوں کی سیاہی شب دیجور جیسی، آپؐ کے دریا میں فیضان عجائب ہے)

صلی علیہ الٰھنا

(آپؐ پر ہمارے پروردگار کی برکتیں ہوں)

قد کان أزھر لونہ

وھر المبارک کونہ

(آپؐ کا رنگ، رنگ چمن اور آپؐ کا وجود باعث برکت تھا)

صلی علیہ الٰھنا

(آپؐ پر ہمارے رب کی مہربانیاں ہوں)

عظمت رؤوس عظامہ

کبرت وجوہ مرامہ

(آپؐ کے سر کی ہڈیاں عظیم تھیں، آپ ﷺ کے مقاصد کی جہتیں بلند تھیں)

صلی علیه الٰهنا

(آپؐ پر ہمارے رب کی دعائیں ہوں)

بالشعر زين صدره

لا كله بل صدره

(آپ ﷺ کا سینہ بالوں سے مزین تھا، پورا نہیں بلکہ درمیانی حصہ)

صلی علیه الٰهنا

(ہمارے رب کی آپ ﷺ پر نوازشیں ہوں)

عيناه صار قلوبنا

اللحظ صار طلوبنا

(آپؐ کی دونوں آنکھوں نے ہمارے دلوں کا شکار کیا، (آپؐ پر ٹکٹکی باندھنا ہماری خواہش ہے)

صلی علیه الٰهنا

(آپؐ پر ہمارے رب کی عقیدتوں کی برسات ہو)

ایضاً بیاضه قد کمل

والحسن فيه مشتمل

(آپؐ کی آنکھوں کی سپیدی درجۂ کمال پر تھی، اور اس میں حسن کی آرائش تھی)

صلی علیه الٰهنا

(آپؐ پر ہمارے رب کی بہاروں کی آمد ہو)

قدماه ایضاً وسعاً

فی العرش لیلاً رفعاً

(آپؐ کے دونوں قدموں کو فراخی عطا کی گئی، حتیٰ کہ شبِ معراج میں عرش تک بلند کئے گئے)

صلی علیه الٰهنا

(آپ ﷺ پر ہمارے رب کی بارانِ رحمت ہو)

کالقوس کان حواجبه

قدکان یفرح خاطبه

(آپ ﷺ کے ابروہائے مبارک کمان کی مانند تھے، آپ ﷺ کا مخاطب آپؐ سے خوش ہو جاتا تھا)

والا نفُ حسنت ذاقها

اقنیٰ أشم صفاتها

(اور آپؐ کی ناک کس قدر پرکشش تھی، بلند و باریک اور دراز اس کی صفات تھیں)

صلی علیه الٰهنا

(آپؐ پر ہمارے رب کی شفقتیں ہوں)

کمل المحاسنُ فی فمه

ملأ الوریٰ بمکارمه

(آپ ﷺ کا دہانِ مبارک محاسن کے درجۂ عروج پر فائز تھا، خلق خدا آپؐ کے اخلاق حسنہ سے فرحاں ہے)

صلی علیه الٰهنا

(آپؐ پر ہمارے رب کی کرپا ہو)

أسنانه قد انفرج

والنور فيها إمتزج

(آپؐ کے دندانہائے مبارک کشادہ تھے، اوران میں نور کا آمیزہ تھا)

صلی علیہ الٰھنا

(آپؐ پر ہمارے رب کی محبتوں کا نزول ہو)

فاق الخلائق جیدُہ

فی الحسن کان مزیدہ

(آپ ﷺ کی خوبصورت صراحی جیسی گردن تمام خلائق (کی گردنوں) پر فائق تھی، حسن و آرائش میں یہ بڑھی ہوئی تھی)

صلی علیہ الٰھنا

(آپؐ پر ہمارے رب کی رأفت و رحمت ہو)

کانت صفاء کفضۃ

فیھا قلائد عزۃ

(یہ حسین گردن جلائیت میں چاندی کی طرح تھی، اس میں، ناموس وعزت کے قلادہ پڑے ہوئے تھے)

صلی علیہ الٰھنا

(آپؐ پر ہمارے اللہ کا فضل ہو)

قد کان خلقہ یعتدل

والحسن فیہ مشتمل

(آپ کی جسامت میں اعتدال اور حسن کا اشتراک تھا)

لیس الھزالُ بو ضعہ

لا شحم فیہ بوصفہ

(اپنی وضع وخلقت میں نہ ہی لاغر اور اپنی صفت میں نہ ہی بھونڈے)

صلی علیه الٰهنا

(آپؐ پر ہمارے رب کی دعائیں ہوں)

عن درک وصفه جاهل

ویقصر فهمه قائل

(جاہل آپ ﷺ کے اوصاف سے نابلد اور اپنی قصور فہم کا قائل ہے)

صلی علیه الٰهنا

(ہمارے رب کی جانب سے آپ ﷺ پر پھول برسیں)

الله یعلم شانه

وهو العلیم بیانه

(اللہ آپؐ کے رتبے سے باخبر ہے اور وہی اس کے ذکر وفکر کو جانتا ہے)

صلی علیه الٰهنا

(آپؐ پر ہمارے رب کی نظر کرم ہو)

یاربِّ صحّح سقمه

بالفضل دمّر جرمه

(بارالٰہا! اس (جاہل یعنی شاعر) کی خطاؤں کو معاف فرمادے اور اس کے جرم کو اپنے فضل وکرم سے بے نام ونشاں کردے)

صلی علیه الٰهنا

(آپؐ پر ہمارے رب کی جانب سے ابر کرم نازل ہو)

حلیۂ مبارک سے متعلق یہ قصیدہ ستاون اشعار پر مشتمل ہے، جس میں آپؐ کے جسمِ اطہر کے مختلف اعضاء مقدسہ کی تصویر کشی کی گئی ہے، یہ تصاویر اتنی سچی اس

قدر صادق اور منہ بولتی ہیں کہ نہ پوچھئے نعتیہ لٹریچر میں حلیہ مبارک کے تعلق سے تین تصاویر ہیں ایک تو احادیث کے تراجم پر مبنی دوسری تصویر متقدمین شعراء کرام کی نقالی پر مشتمل اور تیسری تصویر وہ ہے جو براہ راست پینٹ کی گئی ہے، اسی پینٹنگ کے زمرے میں یہ قصیدہ یعنی یہ پینٹنگ بھی شامل ہے، حضرت علیؓ سے بہتر کس کی پینٹنگ ہوسکتی ہے؟ آپ ﷺ کے شب و روز، صبح و شام، حرکات وسکنات، نشست و برخاست، تدین دتقویٰ اور جلوت وخلوت کو آپؓ تا حیات دیکھتے رہے، یہی وجہ ہے کہ اس تصویر کشی میں صداقت و دیانت کی بن کاری ہے، اس کی لفظیات میں بڑی معنیٰ خیزی ہے، تشبیہات وتعبیرات میں سلیقہ مندی ہے، آپ ﷺ کے تناسب اعضاء کے بیان میں حد درجہ رعایت کی گئی ہے، فصاحت وبلاغت کی نزاکتوں کو برتنے کی قابل ستائش کوشش ہے اور اس میں سلاست تو ایسی ہے کہ بہنے کو جی چاہے اور اس میں غوطہ زنی سے حیاتِ تازہ کی دولت ہاتھ آئے، بہر کیف اس نعت کو عربی کی اہم ترین نعتوں میں شامل کیا جاسکتا ہے، اس منظوم حلیہ مبارک کو پڑھ کر ام معبد کا منثور حلیہ مبارک یاد آئے یہ بھی براہ راست پینٹنگ کی ایک عمدہ مثال ہے:

''میں نے ایک انسان دیکھا، پاکیزہ رو، کشادہ چہرہ، پسندیدہ خو، ہموار شکم، سر میں بھرے ہوئے بال، زیبا، صاحبِ جمال، آنکھیں سیاہ، اور فراخ، بال لمبے اور گھنے، آواز میں مردانگی وشیرینی، گردن موزوں، روشن اور چمکتے ہوئے دیدہ، سرگیں آنکھ، باریک اور پیوستہ ابرو، سیاہ گھونگریالے گیسو، جب خاموش رہتے تو چہرہ پر وقار معلوم ہوتا، جب گفتگو فرماتے تو دل ان کی طرف کھنچتا، دور سے دیکھو تو نور کا ٹکڑا، قریب سے دیکھو تو حسن و جمال کا آئینہ، بات میٹھی جیسے موتیوں کی لڑی، قد نہ ایسا پست کہ کمتر نظر آئے، نہ اتنا دراز کہ معیوب معلوم ہو،

بلکہ ایک شاخِ گل سے جو شاخوں کے درمیان ہو، زیبندہ نظو، والا قدر، ان کے ساتھی ایسے جو ہمہ وقت ان کے گرد وپیش رہتے ہیں، جب وہ کچھ کہتے ہیں تو یہ خاموش سنتے ہیں، جب حکم دیتے ہیں تو تعمیل کے لئے جھپٹتے ہیں، مخدوم ومطاع، نہ کوتاہ سخن اور نہ فضول گو''۔

مذکورہ سطور میں دیوانِ حضرت علیؓ سے مختلف اشعار نقل کرتے ہوئے یہ بتانے کی ایک حقیر سعی کی گئی ہے کہ اس میں اللہ کے رسول ﷺ کی کس طرز پر تقدیس وتطہیر کی گئی ہے، اس دیوان میں بہت سے الحاقات کے باوجود حضرت علیؓ کی آپؐ سے کیا عقیدت تھی اس کی ایک دستاویز ضرور فراہم ہوتی ہے، اس کی دو چیزیں ایسی ہیں جس کو ذہن ودل کسی طرح قبول کرنے پر آمادہ نہیں، ایک تو تشیع کی آمیزش جس کی وجہ سے صحابۂ کرام پر طنز وتعریض کیا گیا ہے، دوسرے بار بار ''أنا علی'' کہہ کر حضرت علیؓ نے اپنے حسب ونسب، اہل بیت کی عظمت اور اپنی دینی خدمات کا ذکر کیا ہے، یہ دونوں چیزیں حضرت علیؓ کے مزاج اور سوچ سے میل نہیں کھاتیں، اس دیوان کی الحاقی اشعار حضرت علیؓ کی خوبصورت تصویر کو بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے، مناسب ہوتا کہ محققین اس کی چھان پھٹک کرتے اور حضرت علیؓ سے منسوب اشعار کی نشان دہی کرتے، اس دیوان میں مختلف جنگوں کا ذکر کرتے ہوئے بھی صحیح نقطۂ نظر نہیں اختیار کیا گیا ہے، اس میں ایک جگہ یہ بتایا گیا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے میرے سر پر عمامہ رکھتے ہوئے فرمایا کہ میرے بعد تم امامت کے حق دار ہو:۔

أخو نبی الله ذی العلامه

قد قال إذ عمّمنی العمامه

(میرے بھائی اللہ کے نبی اور صاحب علامتِ نبوت نے میرے سر پر

عمامہ رکھتے ہوئے فرمایا)

أنت أخی ومعدن الکرامة

ومن له من بعدی الإمامة

(تم میرے بھائی اور خزینۂ کرامت ہو، اور تم وہی شخص ہو جو میرے بعد امامت کا مستحق ہوگا)

اسی طرح یہ بات بھی ناقابل یقین ہے کہ حضرت علیؓ نے ان الفاظ میں حضرت ابوبکرؓ کو مخاطب کیا ہوگا۔

تعلم أبابکرؓ ولا تک جاهلاً

بأن علیاً خیر حاف وناعل

(اے ابوبکرؓ تم جان لو اور جاہل نہ رہو کہ علی ہر برہنہ پا اور پاپوش شخص سے افضل ہے)

اس طرح کے بیشمار اشعار کی وجہ سے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دیوانِ علیؓ کا ایک بڑا حصّہ خود ساختہ ہے، بہر کیف اس دیوان میں بیشمار نعتیہ اشعار سے حبّ رسول فروزاں ہے، مندرجہ دونوں شعر وہی کہہ سکتا ہے جس نے ذات اقدس واکمل کو مشعلِ حیات بنا رکھا ہو:

وهذا رسول الله کالبدر بیننا

به کشف الله العدیٰ بالتناکس

(اور یہ اللہ کے رسول ﷺ ہمارے مابین بدرِ کامل کے مثل ہیں، اور انہی کی بدولت اللہ نے (ہمارے) دشمنوں کو رسوا کر کے دور کیا)

حسبی الله عصمة لأموری

وحبیبی محمداً لی خلیلا

(میرے معاملات کی نگہداشت کے لئے اللہ کافی ہے اور میرے محبوب محمد ﷺ ہی مرے مخلص راز داں ہیں)

ان اشعار سے حضرت علیؓ کے دریائے نعت کی سچائیاں اور گہرائیاں ہویدا ہیں، اسی طرح حلیہ مبارک پر مشتمل قصیدہ سے حضرت علیؓ کے آبدار نعتیہ اسلوب کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے، اگر دیوانِ علیؓ آمیزشوں سے پاک ہوتا تو زیادہ بہتر طریقے سے آپؓ کے نعتیہ مقام کا تعین ہوتا، بہر نوع اس میں کلام نہیں کہ حضرت علیؓ ایک مستند ادیب تھے جس کی شہادت شریف رضی نے "نہج البلاغہ" کو ترتیب دے کر اور شیخ محمد عبدہ نے اس کی تحقیق و توضیح کر کے پیش کر دی، اور امتیاز علی عرشی نے "استناد نہج البلاغہ" وقیع مقالہ لکھ کر ثابت کر دیا کہ "نہج البلاغہ" Fabricated نہیں ہے، لیکن خاکسار کو یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ محترم امتیاز علی عرشی نے یہ گراں قدر مقالہ غالباً نواب رام پور کو خوش کرنے کے لئے تحریر کیا تھا، اس لئے خاکسار کے نزدیک "نہج البلاغہ" میں بہت سی تحریریں ایسی ہیں جن کا حضرت علیؓ سے کوئی تعلق نہیں ہے، "استناد نہج البلاغہ" اتنا موٴقر اور علمی مقالہ ہے کہ جسے مرحوم پروفیسر عبدالحلیم نے عربی میں منتقل کر کے معروف عربی مجلّہ "ثقافة الهند" دہلی میں شائع کرایا، جس طرح حضرت علی ایک عظیم نثر نگار تھے اسی طرح ایک خوبصورت قادر الکلام شاعر اور نعت گو بھی تھے، انہیں عربی کے اولین نعت گو شعراء میں بلند مقام و مرتبہ حاصل ہے، لیکن افسوس کہ مشہور عربی ادیب اور محقق زکی مبارک نے اپنی کتاب "المدائح النبوية في الادب العربي" میں حضرت علیؓ کی نعت گوئی کو وہ اہمیت نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے، آپؓ کے نام نامی کا ذکر تو ہے لیکن کوئی شعر نقل نہیں کیا گیا۔

☆☆☆

مکاتیب عبدالوہاب بنام سید جمیل احمد رضوی

عبدالوہاب خاں سلیم کی زندگی کا ایک حسین رخ مکتوب نویسی ہے، مکاتیب الیہم کی فہرست سازی کی جائے تو مشاہیر علم وادب اور اساطین تحقیق وتنقید کی قطار اندر قطار، خطوط میں ان کی دل جوئی کرنا، غموں میں شریک ہونا، خوشیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینا، تصانیف کی ترسیل کے درخواست، طباعتِ تصانیف کے لئے اپنے دستِ سخاوت کو وا کردینے کی داستانیں، علمی کاموں کی معاونت، متعلقین ومحبین کے اہل وعیال کے لئے تحائف روانہ کرنے کا ذکر نیز ان کے بچوں کے عقد مسنون کے وقت فرشتۂ رحمت بن جانا، کتابیں خرید کر اصحاب ذوق اور کتب خانوں کو ہدیہ کرنا، لوگوں کے امراض میں مضطرب و متفکر اور انتقال کے وقت ورثاء سے تعزیت اور اہل علم وادب کی اموات سے ادباء، شعراء اور علماء کو باخبر کرنا، مخصوص خبروں کے تراشوں کو مکاتیب کے ساتھ منسلک کرنا اور حج بیت اللہ اور عمروں سے متعلقہ واقعات کا ذکر کثیر جیسے موضوعات پر آپ کے خطوط مشتمل ہوتے ہیں، عبدالوہاب خاں کے خطوط جمع کیئے جائیں تو علمی دنیا کی بہت سی تصاویر اور جہتوں کے ادراک میں سہولت ہوگی، جامعات کے بے شمار اساتذۂ کرام کے رجحان سے واقفیت ہوگی، پروفیسر اسلم، مشفق خواجہ، نظیر احمد صدیقی، نگار سجاد ظہیر، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مختار الدین احمد، کبیر احمد جائسی، رفیع الدین ہاشمی، افتخار عالم، مہر الٰہی ندیم اور اصغر عباس کے تذکروں سے آپ کے خطوط مملوء ہیں، خاکسار کا خیال ہے کہ آپ کے مکاتیب

ہزاروں سے اوپر ہوں گے، ادبی نقطۂ نظر سے انہیں ضرور جمع کیا جائے، کیونکہ اس توسط سے بہت سی ادبی و علمی شخصیات کے ذاتی احوال کے درواہوں گے، اور بہت سے سوالات کے جوابات موصول ہوں گے۔

ان خطوط کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ خاں صاحب کی ترجیحات اور ترغیبات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، آپ کی ترجیح اولین یہ ہے کہ لوگوں کے مسائل ومصائب میں کام آنا، اشک شوئی کے لئے کود پڑنا اور ان کی پریشانیوں کے سدِ باب کے لئے ڈھال بن جانا آپ کا شیوۂ حیات تھا، اسی شیوۂ حیات کی تکمیل کے لئے ہر وقت فکر مند، دامے، درمے، سخنے تسلی و تشفی کے لئے سرگرم عمل، انسانیت، غم خواری، مساعدت ومعاونت، دست گیری اور انفاق فی سبیل اللہ کی پیش بندی جیسے عوامل سے وابستگی ہی آپ کا ڈھرّا، اسی ڈھرے اور ڈگر پر آپ کی زندگی رواں دواں ہے، اس میں آپ کی بیماریاں حائل ہوجائیں اور آپ کی نقاہتیں روڑہ بن جائیں اس کا بالکل امکان نہیں، جسے اسوۂ رسول کا سبق یاد ہو اسے بادوباراں روک دیں یہ تصوّر ہی نہیں، اسی درس اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تجدید کے لئے اکثر حج بیت اللہ کے لئے جاتے رہتے ہیں، اسی حب خداوندی اور حب رسول نے انھیں عزم بالجزم عطا کیا ہے، جس کی خوشبو آپ کی مکاتیب سے پیہم چلی آرہی ہے، کاش کہ کوئی بندۂ خدا تدوین خوشبو کے لئے پہل کرتا، ایسے بھلے شخص کے لئے ہم ہمیشہ دست بدعا رہیں گے، ان مکاتیب میں ایک نرالا پن ہے، اسی انوکھے پن اور نرالے پن سے ہم عاشقین ادب مشام جان کو معطر کرنے کے تمنائی ہیں، انہی لطیف اور عطر بیز جھونکوں میں سے ایک جھونکا اپنے قارئین کرام کے لئے حاضر ہے، جسے ہمیں لاہور سے محترم سید جمیل احمد رضوی نے عنایت کیا ہے، جو خاں صاحب کے رفیق کار رہ چکے ہیں، اسی رفاقت نے انہیں

خاں صاحب کا ہم عناں اور ہم نفس بنا دیا، اس مثالی رفاقت کو ملاحظہ فرمائیں۔

ابوسفیان اصلاحی

نیو پارک

۲۵۔ اگست ۱۹۹۳ء

جناب بھائی سید جمیل احمد رضوی صاحب!

السلام علیکم

مزاج گرامی!

پرسوں آپ کا مکتوب عزیز وصول ہوا، آپ کے خط سے یہ خبر وحشت اثر ملی کہ عزیزہ راشدہ کا انتقال ہوگیا، اللہ اکبر، جوان بچی کا انتقال ہوگیا، ہم دونوں کو اس قدر رنج وغم ہوا کہ بیان سے باہر ہے، ہم دونوں دل گرفتہ ہیں، حق تعالیٰ راشدہ مرحومہ کو جنت میں اعلیٰ مقامات عطا فرمائے، آمین۔

والد صاحب کے انتقال کا بھی افسوس ہوا، بزرگوں کا سایہ نعمت خداوندی ہوتا ہے، لیکن برادرم! ہم سب مجبور محض ہیں، یہ کام اللہ تعالیٰ کے ہیں، اس کی اپنی مصلحت آپ کے والد مرحوم سے میری لائبریری میں کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ راشدہ مرحومہ کئی مرتبہ ڈاکٹر شمسی کے زیر علاج رہیں جب کہ وہ شیر خوار تھیں، یہ بچی جب پیدا ہوئی، میں آپ کا رفیق کار تھا، بھائی! اب ہماری شام زندگی ہے ہمارے جانے کا وقت تھا، نہ کہ راشدہ کا تھا، حق تعالیٰ کی مصلحتیں، بچی کا انتقال کیسے ہوا، کیا مرحومہ نے کوئی اولاد چھوڑی، ضرور تحریر

کیجیے گا، اور اس خط کا فوراً جواب دیجیے گا۔

ہم دونوں میاں بیوی، تیسرا حج ادا کرنے کے بعد، حق تعالیٰ کی مہربانی سے ۸/ جون کر نیو یارک واپس آ گئے تھے۔

الحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ، میں، میری بیوی، رفعت اور نزہت (یہ ہماری جڑواں بیٹیاں ہیں) ۳۰ نومبر کو عمرہ کی ادائیگی کے لئے، سعودی عرب جا رہے ہیں، انشاء اللہ میں ایک طواف راشدہ مرحومہ کے نام کا کروں گا اور ایک طواف آپ کے والد مرحوم کے نام کا، حق تعالیٰ ان دونوں کے جنت میں مقامات بلند فرمائے، آمین، یہ دونوں سعید روحیں تھیں، ان کو حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہے، حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہے۔

ہم تقریباً ۲ (دو) ہفتہ سعودی عرب (جدہ مکہ شریف مدینہ شریف) رہ کر ۱۵/ دسمبر ۹۳ء (۱۹۹۳ء) تک نیو یارک آ جائیں گے، انشاء اللہ۔

بھابھی طیبہ (بیگم صاحبہ کا نام طیبہ ہے، اگر میں غلطی پر نہ ہوں) کو ہماری طرف سے سلام و دعا اور ہمارے جذبات قلبی ان تک پہنچا دیجیے گا، راشدہ کے انتقال نے ہم دونوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے، ہم بھی بچیوں والے ہیں۔

فقط

عبدالوہاب،
خورشید سلیم

وہاب صاحب نے ۱۴ مارچ ۱۹۹۵ء کو رضوی صاحب کو ایک خط ارسال کیا، جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہیں:۔

”حق تعالیٰ کی عنایت سے ہم دونوں میاں بیوی ۳۰/ اپریل کو حج بیت

اللہ کے لیے جا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہماری یہ چھٹی حاضری ہوگی، رب کعبہ ہماری تمام حاضریوں کو قبول فرمائے، آمین، اور یہ حج، حج مبرور ہو، آمین۔

آپ کی مرحومہ صاحبزادی کے بلند درجات کے لیے ربِ کعبہ کے حضور، حرم شریف میں دعا کریں گے۔

اللہ تعالیٰ مرحومہ کے جنت میں درجات بلند کرے، آمین"۔

نیو پارک

۱۲/ مئی ۱۹۹۳ء

جناب برادرم سید جمیل احمد رضوی صاحب!

السلام علیکم

مزاج گرامی!

ایک طویل عرصہ سے آپ کی طرف سے خط نہیں آیا جس کی وجہ سے تشویش ہے، براہ کرم چند سطور تحریر کر کے خیریت کی اطلاع دیجیے گا، الحمدللہ ہم دونوں میاں بیوی ۱۸/ مئی کو حج کے لیے روانہ ہو رہے ہیں اور انشاء اللہ ۸/ جون کو واپسی ہوگی۔

حق تعالیٰ کی مہربانی سے ہمارا یہ تیسرا حج ہے۔

۱۹۹۱ء میں ہم دونوں نے حج کر کے اپنا حج کا فرض ادا کیا تھا۔

۱۹۹۲ء میں، میں نے اپنے والد مرحوم کا حج بدل کیا تھا اور خورشید نے

اپنی والدہ مرحومہ کا حج بدل کیا تھا۔

اس سال، الحمدللہ میں اپنی والدہ کا حج بدل کروں گا اور خورشید اپنے والد مرحوم کا حج بدل کریں گی، میری والدہ بہت ضعیف ہیں اور لاہور میں رہتی ہیں، ان کے لیے خود حج پر جانا مشکل تھا۔

دعا فرمایئے کہ حق تعالیٰ حج قبول فرمائے۔ آمین، حج مبرور ہو، ہم سب آپ کے لیے بیت اللہ شریف میں دعا کریں گے۔

کیا یہ خبر صحیح ہے، ایک صاحب بتلا رہے تھے کہ ہمارے لائبریرین عبدالرحیم خاں کا انتقال ہوگیا (جس زمانہ میں، میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں تھا، رحیم صاحب لائبریرین (موجودہ عہدہ چیف لائبریرین) تھے، براہ کرم مجھے ایک خط لکھ کر انتقال پر ملال کی صحیح اطلاع دیجیے گا۔

پرانے لوگوں میں اور کون کون، لائبریری میں ہیں، محمودہ سلطانہ ہیں یا ریٹائر ہوگئی ہیں، انوار صاحب اور نصیر صاحب ہیں؟ آپ سے گزارش ہے کہ اطمینان سے، تفصیل سے مجھے خط تحریر فرمایئے گا۔

الحمدللہ میرے بچے سب خیریت سے ہیں، آپ کو سلام کہتے ہیں، آپ کے بچے اب کن کن کلاسوں میں ہیں؟

بھابھی صاحبہ کو میرا اور خورشید کا سلام کہیے گا، بچوں کو پیار۔ فقط

آپ کا عبدالوہاب خاں سلیم،
خورشید سلیم

عزیز از جان بھائی سید جمیل احمد رضوی صاحب!

السلام علیکم

مزاج گرامی!

اس لمحہ آپ کو خصوصی طور پر یاد کر رہا ہوں، حسب معمول آپ کی تحریر سے محروم ہوں، ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب آج کل یہاں امریکہ آئے ہوئے ہیں، ان سے فون پر بات ہوتی رہتی ہے، آپ کا بھی ذکر خیر ہوتا ہے، ہم دونوں آپ کا نام محبت سے لیتے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ آمین۔

ماہ دسمبر میں ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب پاکستان آئیں گے، صاحب موصوف اپنے بھائیوں کے پاس ریاست اوہائیوں OHIO آئے ہوئے ہیں۔

آپ مجھے خط تحریر نہ کر کے ظلم فرما رہے ہیں، براہ کرم خط تحریر کیجیے گا۔

الحمدللہ، یکم دسمبر کو یہ خاکسار، اہلیہ خورشید سلیم، بیٹی نزہت سلیم عمرہ کی ادیئگی کے لیے مکہ شریف جا رہے ہیں، انشاء اللہ آپ سب کے لیے حرم شریف میں دعا کریں گے۔ عزیز دوست مرحوم اسلم صاحب کے لیے بھی دعا کروں گا۔ اور ان کے نام کا ایک طواف بیت اللہ شریف بھی کروں گا، انشاء اللہ۔

شاہ جی! خدا شاہد ہے کہ آپ کو بہت یاد کرتا ہوں، خط تحریر کر کے شاد کام فرمایئے گا، براہ کرم فون پر ڈاکٹر محمود الحسن عارف صاحب کو میرا اسلام کہہ دیجیے گا، آپ کی طرح وہ بھی میرے مہربان دوست ہیں۔

دعاؤں کا طالب

عبدالوہاب خاں سلیم

یہ فقیر خاکسار آپ کو اکثر یاد کرتا ہے، اس لمحہ خصوصی طور پر یاد کر رہا ہے، بے شک آپ میرا کام نہ کریں، خط تو تحریر فرمایئے۔

ہر روز آپ کے خط کا انتظار کرتا ہوں مجھے آپ سے عقیدت ہے۔

کل ڈاکٹر منیر الدین چغتائی صاحب سے فون پر گفتگو ہوئی، ہفتہ میں دو مرتبہ ان سے بات ہو جاتی ہے۔

عزیز دوست پروفیسر اسلم مرحوم کی بیوہ محترمہ ریحانہ اسلم صاحبہ سے فون پر بات ہو جاتی ہے، یہ بھی امریکہ آئی ہوئی ہیں۔

بملاحظہ جناب سید جمیل احمد رضوی صاحب، لاہور

آپ کا اپنا

عبدالوہاب خاں سلیم

جناب سید جمیل احمد رضوی صاحب!

سلام شوق۔

یہ خاکسار حرم شریف میں آپ سب کے لیے دعائے خیر کرتا ہے۔

ہم تینوں عمرہ کی ادائیگی کے لیے آئے ہوئے ہیں، حق تعالیٰ عمرہ قبول فرمائے، آمین۔

فقط

طالبِ دعا

عبدالوہاب خاں سلیم

تحقیق، خطہ اور تحقیقی مقالہ: ترتیب وتجویز

ابوسفیان اصلاحی

عصر حاضر کی جامعات میں ریسرچ اور تحقیق ایک ضرورت بن گئی ہے، اس کے بغیر تقرر اور مناصب کے زینوں کو طے کرنا ممکن نہیں، جب صورتحال یہ ہو تو فرائض کی ادائیگی میں اخلاص اور جستجو کہاں باقی رہتی ہے؟ حق اور باطل کی تمیز ہی مٹ جاتی ہے، آج جامعات میں تحقیق کے نام پر کیا کیا جرائم اور کیا کیا علمی بددیانتیاں ہورہی ہیں اسے قلم بند کرتے ہوئے قلم مرتعش ہوجائے، مادیت ذہنوں پر اس طرح مستولی ہے کہ تحقیق کے تمام اصول اور تنقید کے تمام مطالبات بے معنی اور بے سود ہیں۔

طلبہ ریسرچ اسکالرز کم خدام مشرفین زیادہ، اگر اس نے اپنے نگراں اور ان کے اہل خانہ کی ناز برداریوں سے غفلت برتی تو اس کی قسمت میں "یطوفون بینھا وبین حمیم آن" (وہ جہنم اور گرم پانی کے درمیان چکر کاٹتے تھے) اپنے نگراں اعلی کا وفادار رہا تو افتاں وخیزاں اسے سند تحقیق مل ہی جائے گی، کبھی کبھی تو ایسا ہوا کہ مشرفین نے ریسرچ اسکالرز کی زندگی کو جہنم بنا ڈالا، یا انھیں طاق نسیاں کے سپرد کردیا، یہ کاروبار بھی تحقیق کے نام پر عروج پر ہے کہ بہت سے فرماں بردار طلبہ نے اپنے اساتذۂ کرام کو معروف محقق اور ڈاکٹر بنا ڈالا، بہر کیف یہ روح فرسا اور جگر خراش داستان ہے، اس سے قطع نظر یہ بتانے

کی کوشش کی جائے گی کہ تحقیق کیا ہے؟ اور ایک محقق کس طرح اپنے موضوع کا انتخاب کرے اور کس طرح اپنے مقالہ کا خطہ (Synopsis) تیار کرے۔

سب سے پہلے لفظ ''تحقیق'' کا مفہوم بیان کیا جائے، یہ ''حق'' سے نکلا ہوا ہے، کسی بات کی اصل حقیقت اور اس کی حقیقی صورت کو منظر عام پر لانے کا نام تحقیق ہے، ایک محقق اپنی سعی وکوشش کے وقت ہر طرح کے تأثر، تعصب، تحزب اور عقیدت سے بلند تر ہو، اگر یہ تمام جھمیلے اور فتنے ساتھ ساتھ رہے تو تحقیق کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے، تحقیق ضد باطل اور نقیض حقیقت کا نام ہے، قرآن کریم ایک کتاب حق ہے اسی لیے اسے ''فرقان حمید'' کہا گیا ہے اور ابتداء ہی میں اسے شکوک وشبہات سے بالاتر کتاب بتایا گیا ہے، ایک محقق اگر حق وباطل میں تفریق نہ کر سکے تو اسے محقق ہرگز نہیں کہا جاسکتا، وہ نفس امارہ کے برعکس نفس مطمئنہ کا تابع ہو، نفس لوامہ کی رفاقت ہوتا کہ اس کی بے اعتدالیوں پر اس کی خبر لیتی رہے۔

لاتلبسوا بالحق بالباطل	حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو
وتکتموا الحق وأنتم تعلمون	اور نہ حق کو چھپاؤ اور تمہیں تو خود اس
(البقرة: ۲/۴۲)	کا علم ہے۔
بل نقذف بالحق علی الباطل	بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر پھینک مارتے
فیدمغه فإذا هو زاهق ولکم	ہیں بس سچ جھوٹ کا سر توڑ دیتا ہے اور
الویل مما تصفون	وہ اسی وقت نابود ہو جاتا ہے، تم جو
(الأنبياء: ۲۱/۱۷)	باتیں بناتے ہو وہ تمہارے لیے
	باعث خرابی ہیں۔

دونوں آیات سے واضح ہے کہ کتمان حق اور محقق میں بعد مشرقین ہے، اگر محقق نے جانتے ہوئے اس قبیح عمل کو انجام دیا تو وہ محقق نہیں بلکہ مفسد ہے،

ایک محقق کی ہمہ آن کوشش ہو کہ وہ صداقت و دیانت کا علم بردار اور باطل کو جہنم رسید کرنے کے لیے اپنی تمام تر ذہنی و فکری صلاحیتوں کو صرف کرے گا، تحقیقی فرائض کے انجام دینے والوں کے لیے قرآن کریم کا یہی پیغام ہے۔ فتح مکہ کے بعد جب اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو تمام بتوں کو اپنے عصا سے گراتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، گویا آپ ﷺ تمام علامات باطلہ کو کھرچ دینا چاہتے تھے۔ توحید و تکبیر کے سامنے ہر شئی کو سرنگوں دیکھنے کے خواستگار تھے، ایک محقق کی ذمہ داری ہے کہ وہ خطوط باطل پر خط تنسیخ کھینچ دے، فتح مکہ کے بعد یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

قل جاء الحق و زهق الباطل، إن الباطل كان زهوقا (الإسراء: ۱۷/ ۸۱)	آپ ﷺ اعلان کردیں کہ حق آچکا اور باطل نابود ہوگیا، یقیناً باطل نابود ہونے ہی کے لیے ہے۔

محقق کا اساسی فریضہ یہ ہے کہ وہ کوئی بات تحقیق و تفتیش کے بغیر نہ کہے، وہ صداقت کی تلاش میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتا رہے، ہر پتھر کو پلٹتا رہے اور ہر سمندر میں غوطہ زنی کرتا رہے، تحقیق کے بغیر کسی بات کو پیش کر دینا ظلم و عناد کی مانند ہے، اس کے نتائج نہایت خطرناک اور مضر ہیں، قومیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں اور ترقی کی راہیں مسدود، اسی لیے قرآن کریم نے تحقیق کے بغیر کسی عمل کو انجام دینے سے یا کسی خبر کو افشاء کرنے سے منع کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"يأيها الذين آمنوا إن جاء كم فاسق بنبأ فتبيّنوا أن تصيبوا قوماً بجهالة فتصبحوا على ما فعلتم نادمين" (الحجرات: ۴۹/ ۶)	اے مسلمانو! اگر تمہیں کوئی فاسق خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو، ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذاء پہنچادو، پھر اپنے کیے پر پشیمانی اٹھاؤ۔

دوسرا فریضہ محقق کا یہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں ''قسطاس مستقیم'' ہو اور اس کا قلم زیور عدل سے آراستہ ہو، اس کی تحقیق وتنقید پر قرابت اور عداوت اثر انداز نہ ہو، ورنہ تحقیق بے وزن اور بے روح ہو جائے گی، وہ تحقیق وتسوید قابل احترام ہے جو عدل وانصاف سے عبارت ہو۔ ارشاد خداوندی ہے:

يأيها الذين آمنوا كونوا قوامين لله شهداء بالقسط ولا يجرمنكم شنآن قوم على ألا تعدلوا، اعدلوا هو أقرب للتقوى واتقوا الله إن الله خبير بما تعملون (المائدة: ۸/۵)

اے مسلمانو! تم اللہ کی خاطر حق پر قائم ہو جاؤ، راستی اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ، کسی قوم کی عداوت تمہیں خلاف عدل پر آمادہ نہ کرے، عدل کیا کرو جو پرہیز گاری کے زیادہ قریب ہے اور اللہ تعالی سے ڈرتے رہو، یقیناً اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

مذکورہ بالا آیت کریمہ میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ محقق کے سامنے سخت ترین مراحل آتے ہیں، اگر اس وقت وہ قائم ودائم نہ رہا تو تحقیق زمیں بوس ہو جائے گی، عدل کے بغیر تصور تحقیق مستبعد ہے۔ وہ تمام تعصّبات سے کنارہ کش ہو، محقق کا اگر کسی ازم اور کسی مذہب سے تعلق ہو تو وہ بوقت تحقیق اس کا حاشیہ بردار نہ ہو، لیکن آج کی تحقیق یہ ہے کہ کمیونسٹ کے نزدیک ایک کمیونسٹ کی ہمنوائی اس کا فریضہ ہے، اسے جائز وناجائز سے کوئی علاقہ نہیں، محقق کی آنکھیں مسلکی عینک سے آزاد ہوں، وہ ہر مسلک کو دلائل وبراہین کی بنیاد پر پرکھے، محقق بریلوی ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ بند آنکھوں کے ساتھ بریلویت کی ستائش کرے، اگر تحقیق آج اپنے اصل لباس میں ہوتی تو یہ مسالک فروغ نہ پاتے، صرف اسلام کا بول بالا ہوتا اور قوم لٹریچر کے بوجھ تلے نہ دبتی۔ اخوت اور

رفاقت کو اپنا ہم سفر بناتی، مسلکی علماء کرام کو تحقیق سے کوئی سروکار نہیں اس لیے ملی تشخص برباد ہو رہا ہے، ایک محقق کا یہ بھی بنیادی فریضہ ہے کہ وہ اپنی تحقیق کو اقرباء نوازی، تحزب پرستی سے دور رکھے، لیکن افسوس کہ دور جدید کا محقق انساب پرست اور نے نواز ہے، اس کا قبیلہ ہی اس کے نزدیک وجہ افتخار ہے، اس کی خوبیوں کی توصیف وتوضیح اس کا فریضہ ہے، آج کا محقق دور جاہلی کے شاعر سے کم نہیں، قبیلے کی ترجمانی ہی اس کی زندگی کا ماحصل ہے، مذکورہ تمام معائب کی طرف قرآن کریم نے یوں اشارہ کیا ہے:

"کل حزب بما لدیه فرحون" ہر گروہ اپنی چیزوں پر نازاں ہے۔

(الروم ۳۰/۳۲)

محقق جب اپنے تحقیقی سلاسل کو آگے بڑھاتا ہے تو اس کے خیالات بہت سی قابل قدر شخصیات سے ٹکراتے ہیں وہاں اس پر کچھ ایسا لرزہ طاری کہ کچھ کہتے ہوئے ڈرے، ان کی عظمت کے سامنے اس کی زبان گنگ اور قلم خشک لیکن اگر وہ صحیح معنوں میں محقق ۔ہے تو وہ رجز کرتا ہوا'' چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے'' گزر جاتا ہے، شخصیات کے کمند حصار سے بالاتر، بلکہ ان سے عقیدت کے علی الرغم ان کے قعر افکار میں اتر کر تحلیل وتجزیہ کا خوگر۔ وہ شخصیات کے فکر کو تولتا ہے، ان کے قد سے قطع نظر فکری عظمت کو دیکھتا ہے اور تفکر وتدبر سے دنیائے تحقیق بساتا ہے۔ جس طرح ایک محقق کا فریضہ ہے کہ وہ حق کو منظر عام پر لائے، اسی طرح اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ معاشرے میں وہ حق کی دعوت کو عام کرے جیسا کہ ''وتواصوا بالحق'' (اور انھوں نے آپس میں حق کی وصیت کی) میں یہی بات کہی گئی ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی نے اس کی تفسیر یوں بیان کی ہے:

''جس شخص کی نگاہوں میں حق محبوب ہو جائے گا اور اس کی خاطر صبر و استقامت کی کڑیاں بھی جھیلنے پر آمادہ ہوگا۔ اس کے بارے میں لازماً اس کا علم اس کی محبت اور اس کی غیرت بڑھ جائے گی، وہ صرف یہی نہیں چاہے گا کہ خود ہی اس سے محبت کرے بلکہ یہ بھی چاہے گا کہ ساری دنیا اس سے محبت کرے اور جہاں کہیں بھی حق کو مظلوم و مقہور اور باطل کو غالب و فتحمند دیکھے گا تو تڑپ اٹھے گا اور ایک غیور و اولوالعزم انسان کی طرح دوسروں کو بھی ابھارے گا کہ وہ حق کی حمایت کے لیے کمر بستہ ہوں، اس کا دوسروں کو یہ ابھارنا بھی خود اس کے اپنے ہی جذبۂ حمیت حق کا ایک قدرتی نتیجہ اور اسی کا ایک حصہ ہے۔''

مذکورہ بالا سطور میں دو پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ایک تو تحقیق کا مفہوم واضح کیا گیا اور دوسرے محقق کے فرائض کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ وضاحت کی جائے گی کہ تحقیق کے لیے موضوع کا انتخاب کس طرح ہو؟ بحث و تحقیق کے موضوع کی تلاش میں کم از کم ایک سال لگایا جائے، اس پہلو پر ایم اے کے سال اخیر میں غور و خوض شروع کر دیا جائے، اپنے تحقیقی رجحان اور تنقیدی میلان کو دیکھتے ہوئے ایسے نگراں کو متعین کیا جائے جس کا تحقیقی میدان اس کی سوچ سے عبارت ہو، دونوں میں فکری ارتباط اور ذہنی اتصال ہو، طالب علم اگر جاہلی شاعری کے کسی گوشے کو موضوع بحث بنانا چاہے تو مناسب ہے کہ وہ ایسے استاد کا انتخاب کرے جس کی جولان گاہ جاہلی شاعری رہی ہو تاکہ وہ طالب علم کی تائید و توثیق کر سکے۔ مطالعہ کے ساتھ ساتھ مختلف محققین اور جید علماء کرام سے مباحثہ و مذاکرہ کرے تاکہ انتخاب موضوع میں سہولیات ہوں، اپنے مضمون کے علاوہ دیگر ماہرین زبان سے رابطہ استوار کیا جائے تاکہ خوب سے خوب تر موضوع کا انتخاب ہو سکے۔ ریسرچ اسکالر کے پیش نظر یہ ضرور ہو کہ

یم اے میں انھی پہلوؤں کو اپنے مقالہ کا موضوع بنائے جو آگے چل کر اس کے تحقیقی مقالہ کے لیے مؤید و مساعد بن سکیں۔

انتخاب موضوع کے بعد سب سے اہم مسئلہ خطہ (Synopsis) کی تیاری ہے، یہ عمل متانت و سنجیدگی کا متقاضی ہے، کیوں کہ ریسرچ کی سہولیات اسی پر منحصر ہیں، سب سے پہلے عنوان مقالہ، اس کے بعد ابواب اور ابواب کی ذیلی تقسیم، اس کی اس طرح تقسیم وتبویب کی جائے کہ کہیں سے بد نظمی اور بے ربطی نظر نہ آئے، ایسی ترتیب و تنسیق ہو کہ کہیں سے بکھراؤ کا گمان نہ ہو، خطہ کی تیاری کے لیے عرق ریزی اور جاں فشانی کی جائے، ایسے چند خطوط کی نشان دہی مندرجہ سطور میں کی جائے گی تا کہ خطہ کی بہتر ترین صورت پیش کی جا سکے، سب سے پہلے ہندوستان کے معروف کتب خانوں کا ذکر کیا جائے گا تا کہ استفادہ کی راہیں ہموار ہو سکیں۔ ملاحظہ ہوں:

ا۔علی گڑھ کے کتب خانے:

(ا) کتب خانہ مولانا آزاد (۲) کتب خانہ شعبۂ عربی اور شعبۂ اسلامیات (۳) کتب خانہ کتب خانہ شعبۂ عربی (۴) کتب خانہ ویسٹ ایشین اسٹڈیز (۵) کتب خانہ شعبۂ دینیات (۶) کتب خانہ نواب رحمت اللہ خان شروانی (۷) کتب خانہ ادارہ تحقیقات اسلامی (۸) ابن سینا اکیڈمی (۹) کتب خانہ ادارہ علوم القرآن (۱۰) کتب خانہ پروفیسر خلیق احمد نظامی (۱۱) کتب خانہ پروفیسر اصغر عباس۔

۲۔لکھنؤ کے کتب خانے:

(ا) مکتبہ ناصریہ (۲) کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی (ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

(۳) آصف الدولہ لائبریری (۴) برٹش لائبریری (۵) ٹیگور لائبریری (۶) کتب خانہ جنت مآب (۷) کتب خانہ فرنگی محل۔

۳- کلکتہ کے کتب خانے:

(۱) نیشنل لائبریری (۲) وکٹوریہ محل لائبریری (۳) ایشیاٹک سوسائٹی کتب خانہ (۴) کلکتہ یونیورسٹی لائبریری (۵) مدرسہ عالیہ کتب خانہ

۴- ممبئی کے کتب خانے:

(۱) بمبئی یونیورسٹی لائبریری (۲) ایشیاٹک سوسائٹی (۳) کتب خانہ انجمن اسلام۔

۵- حیدرآباد کے کتب خانے:

(۱) سالار میوزیم (۲) دائرۃ المعارف (۳) عثمانیہ یونیورسٹی کتب خانہ (۴) سینٹر فار فارن لینگویجز لائبریری (۵) نظامیہ کتب خانہ (۶) آصفیہ لائبریری (۷) مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی

۶- پٹنہ کے کتب خانے:

(۱) خدابخش لائبریری (۲) پٹنہ یونیورسٹی کتب خانہ

۷- اعظم گڑھ کے کتب خانے:

(۱) دار المصنفین (۲) شبلی کالج لائبریری (۳) دار المعلومات، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ (۴) کتب خانہ محمد اجمل اصلاحی، اعظم گڑھ (۵) عربی کتب خانہ مدرسۃ الاصلاح سرائے، میر اعظم گڑھ (۶) کتب

خانہ جامعہ اسلامیہ قلندر پور، اعظم گڑھ

۸- کتب خانہ مولانا ابوالکلام آزاد، عربی اور فارسی ریسرچ انسٹیٹوٹ، ٹونک

۹- کتب خانہ دارالعلوم تاج المساجد، بھوپال، ایم پی

۱۰- نیشنل آرکائیوز، دہلی

۱۱- گورنمنٹ ریکارڈ آفس ممبئی

۱۲- کتب خانہ جامعہ اسلامیہ، بھٹکل

یہ ہندوستان کے چند ایسے معروف کتب خانے ہیں جو آرٹس اور سوشل سائنسز کے طلبہ کے لیے حد درجہ مفید ہیں، یہ خطہ اور تحقیقی مقالہ کی تکمیل کے باب میں نمایاں رول ادا کریں گے، عربی زبان کے طلبہ عرب سفارت خانوں سے بھی مدد حاصل کرسکتے ہیں۔ مذکورہ کتب خانوں کے علاوہ خطہ کی تیاری اور مقالہ کی ترتیب میں ان شخصیات سے رابطہ بھی یقیناً نفع بخش ہوگا جنھیں عربی زبان وادب میں اساطین کا درجہ حاصل ہے، یہاں ہندوستان کی صرف چند شخصیات پیش نظر ہیں، درج ذیل شخصیات اس نقطۂ نظر سے معاون ہوں گی۔

(۱) پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی (۲) مولانا محمد واضح رشید ندوی (۳) مولانا سعید الرحمٰن اعظمی (۴) پروفیسر محمد راشد ندوی (۵) پروفیسر عبد الباری (۶) پروفیسر محسن عثمانی ندوی (۷) پروفیسر زبیر احمد فاروقی (۸) پرورفیسر شفیق احمد ندوی (۹) پروفیسر محمد نعمان خان (۱۰) پروفیسر محمد اسلم اصلاحی (۱۱) پروفیسر سید کفیل احمد قاسمی (۱۲) پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی (۱۳) پروفیسر محمد صلاح الدین عمری (۱۴) پروفیسر مسعود انور علوی (۱۵) ڈاکٹر ف. عبدالرحیم (۱۶) ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی (۱۷) پروفیسر اشفاق احمد ندوی (۱۸) پروفیسر شبیر احمد ندوی (۱۹) پروفیسر بدر الدین الحافظ (۲۰) ڈاکٹر عنایت اللہ سبحانی (۲۱) ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

مندرجہ سطور میں چند ایسے عالمی محققین کے اسماء گرامی تصانیف کے ساتھ نقل کئے جارہے ہیں جن کی تحقیقات سے خطہ کی تیاری میں مدد لی جاسکتی ہے نیز تحقیق کسے کہتے ہیں اسے بھی سمجھا جاسکتا ہے:

(۱) سرسید احمد خان (خطبات احمدیہ اور تبیین الکلام)

(۲) علامہ شبلی نعمانی (الفاروق)

(۳) عبدالحمید الفراہی (تفسیر نظام القرآن اور جمہرۃ البلاغہ)

(۴) عبدالحئ الحسنی (نزہتہ الخواطر (الإعلام بمن فی تاریخ الھند من الأعلام)

(۵) عبدالعزیز میمنی (ابوالعلاء المعری وما إلیہ وسمط اللآلی)

(۶) سید سلیمان ندوی (عربوں کی جہاز رانی وعرب وہند کے تعلقات)

(۷) عبدالسلام ندوی (اقبال کامل اور شعرالہند)

(۸) امتیاز علی عرشی (دیوان شعر الحادرۃ وتفسیر سفیان الثوری)

(۹) ابوکریم محفوظ المعصومی (بحوث وتنبیہات)

(۱۰) ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی (مفردات القرآن)

مندرجہ سطور میں چند عرب محققین اور مصنفین کے اسماء گرامی رقم کئے جارہے ہیں تاکہ ان کے علمی اکتسابات تحقیقی ذہن بنانے میں معاون ہوسکیں:

(۱) صلاح الدین المنجد (الصعالیک والعیارون)

(۲) جرجی زیدان (تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ وتاریخ التمدن الإسلامی)

(۳) ابن خلدون (کتاب العبر ودیوان المبتداء والخبر)

(۴) طہٰ حسین (فلسفۃ ابن خلدون والإجتماعیۃ)

(۵) انور الجندی (المعارک الأدبیۃ)

(۶) عباس محمود العقاد (ابن الرومی: حیاتہ من شعرہ)

(۷) ابوزہراء (تاریخ المناصب الإسلامیۃ)

(۸) مصطفیٰ زرقاء (محاضرات فی القانون المدنی السوری)

(۹) احمد امین (العقد الفرید: المحقق)

(۱۰) بنت الشاطی (التفسیر البیانی للقرآن الکریم)

(۱۱) محمود محمد شاکر واحمد شاکر (تفسیر الطبری وجامع البیان عن تاویل آی القرآن)

(۱۲) عبد السلام ہارون (تہذیب سیرۃ ابن ہشام ومعجم مقاییس اللغۃ لابن فارس)

(۱۳) ڈاکٹر حسین مونس (اطلس التاریخ الاسلامی)

مناسب ہے کہ چنداں ہندوستانی محققین وناقدین کے اسماء گرامی قلم بند کردیئے جائیں جواردو اور فارسی زبان وادب میں نمایاں مقام کے حامل ہیں، مثلا:

۱۔ علامہ شبلی نعمانی (شعر العجم)

۲۔ عبد السلام ندوی (شعر الہند)

۳۔ قاضی عبد الودود (نقد غالب اور محمد حسین آزاد بحیثیت محقق)

۴۔ پروفیسر نذیر احمد (نقد قاطع برہان وکتاب نورس)

۵۔ مولانا سعید اکبر آبادی (الرق فی الاسلام یعنی اسلام میں غلامی کی اہمیت)

۶۔ مولانا محمد تقی امینی (اسلام کا زرعی نظام)

۷۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی (ایضاح القرآن)

۶۔ رشید حسن خان (اردو املا و زبان اور قواعد)

۷۔ مالک رام (غبار خاطر اور تلامذۂ غالب)

۸۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی (تلاش غالب اور دراسات)

۹۔ شمس الرحمٰن فاروقی (لفظ و معنی اور اثبات و نفی)

۱۰۔ پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی (اردو میں ترقی پسند تحریک)

۱۱۔ پروفیسر انصار اللہ (شعرائے اردو کے اولین تذکرے)

۱۲۔ پروفیسر حنیف نقوی (غالب: احوال و آثار)

ریسرچ اسکالرز کے پیش نظر یہ پہلو بھی ہو کہ جامعات کے کتب خانوں میں تحقیقی مقالات محفوظ کیے جاتے ہیں، ان مقالات کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو بہت سی تھیسس ایسی مل سکتی ہیں جو اس کی تحقیق میں مددگار ثابت ہوں گی، شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی کی جانب سے ترتیب کردہ ایم فلز اور پی ایچ. ڈیز کا ایک اشاریہ پروفیسر عبد الباری نے "Descriptive Catalogue: Research Work of the Department of Arabic, A.M.U., Aligarh" کے عنوان سے ترتیب دیا ہے، اس وقت مختلف جامعات میں موجودہ تحقیقی مقالات کا ایک توضیحی اشاریہ (بھی ڈاکٹر جمشید احمد ندوی ترتیب دیا ہے، یقیناً، آپ کی عرق ریزی قابل ستائش ہیں۔

خطہ کی تیاری اور تحقیقی مقالات کی ترتیب میں مختلف مجلّات کی جلدوں کی ورق گردانی بھی کافی حد تک نفع بخش ہے۔ متعدد عربی رسائل کی فائلوں کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ اسلامیہ بھٹکل، ندوۃ العلماء لکھنؤ، اور مدرسۃ الاِصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کے کتب خانے گراں قدر اہمیت کے حامل ہیں، بیروت اور عرب ممالک کے مختلف مطابع مجلّات کی جلدیں شائع کر رہے ہیں،

اس کا ایک بڑا ذخیرہ جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں موجود ہے، دور جدید میں مجلّات کے اشاریئے بن رہے ہیں، ریسرچ کے سلسلے میں یہ بہت مفید ہیں، تھوڑی سی محنت میں بہت سے ذخائر ونوادر تک رسائی ممکن ہے مثلاً معارف (عارف سہیل کراچی)، الاصلاح (ابوسفیان اصلاحی)، برہان (عابد رضا بیدار، ابوسفیان اصلاحی، حمیرہ ناز) ترجمان القرآن (حکیم نعیم الدین زبیری، کراچی)، علوم القرآن علی گڑھ (پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی)، الرشاد اعظم گڑھ (محمد الیاس اعظمی)، فکر ونظر علی گڑھ (کبیر احمد خان)، تہذیب الاخلاق (ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری)، آج کل (جمیل اختر) اور قرآنی مضامین کا اشاریہ (ابوسفیان اصلاحی) اس وقت مختلف علمی مراکز اور کتب خانوں نے اپنے مخطوطات کی فہرست شائع کردی ہیں جو تحقیقی عمل کے فروغ میں اساسی کردار کی حامل ہیں، مناسب ہے کہ ریسرچ اسکالرز اس کا جائزہ لیں، چند فہارس مخطوطات اس طرح ہیں:

جائزہ مخطوطات اردو (مشفق خواجہ)، دائرۃ المعارف عربی مخطوطات (رضا لائبریری رامپور، یہ چھ جلدوں میں ترتیب دیئے گئے ہیں، مرحوم امتیاز علی عرشی نے نہایت عرق ریزی سے اسے ترتیب دیا ہے)، مفتاح الکنوز الخفیۃ (خدا بخش لائبریری، پٹنہ)، مرآۃ العلوم (فارسی مخطوطات، خدا بخش لائبریری، پٹنہ)، مخطوطات مکتبہ آصفیہ، Catalogue of the Manuscripts, Oriental ....Books and Manuscripts (London)۔

مختلف زبانوں میں بے شمار انسائیکلو پیڈیاز آچکی ہیں، ان کی طرف رجوع کرنا بھی ایک محقق کا فریضہ ہے اس کا احاطہ یہاں ممکن نہیں صرف چند موسوعات کے عناوین تحریر کئے جائیں گے، مثلاً نزهة الخواطر (مولانا عبد

الحئ حسنی)، الکتاب المعاصرون (انور الجندی)، الاعلام (الزرکلی)، معجم الشعراء (المرزبانی)، العقد الفرید (ابن عبد ربہ)، المعارف (فؤاد افرام البستانی)، الفکر الإسلامی (انور الجندی)، معجم البلدان (یاقوت الحموی)، الفہرست (ابن ندیم)، معجم النساء الشاعرات فی الجاھلیۃ والإسلام(عبدمھناّ)، معجم المؤلفین(عمر رضاالکحالہ)، اعلام الشعر العربی (تمیم محمود فاخوری ومریم شبلی)، المسالک الممالک(ابن خرد اذیۃ)،اے M.J. De- Gopje کتاب البلدان(الیعقوبی)، الأزمنۃ والأمکنۃ (المرزوقی)، نزھۃ المشتاق فی اختراق الآفاق (الادریسی)، جمھرۃ الأنساب (ابن الکلبی)، دائرۃ معارف اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) Encyclopaedia of Islam, Islam Ansiklopedisi, Encyclopaedia of Iranica, The Great Islamic Encyclopaedia

ریسرچ اسکالرز کے لیے مختلف دستاویزات، خطوط، یادداشتیں، روزنامچے اور کتبات وغیرہ بھی اہمیت کے حامل ہیں، تحقیق کا تعلق کسی خاص علاقے سے ہو تو محقق ان علاقوں کا ضرور دورہ کرے، اسی طرح تحقیق کسی شخصیت سے متعلق ہو تو وہ اس کے ارباب خانوادے سے لازماً رابطہ قائم کرے تاکہ سوانحی خاکہ میں ان کے تأثرات وبیانات سے رنگ بھرا جاسکے۔ ریسرچ کے تئیں مناسب ہوگا کہ مختلف امبیسڈرز، صدور شعبہ جات، اور سربراہان تحقیقی مراکز اور کتب خانوں سے خط وکتابت کی جائے، کیوں کہ یہ تمام چیزیں تحقیقی سرگرمیوں میں اہم رول ادا کرسکتی ہیں، اس طرح سے بھی تحقیق کو مدلل ومستند بنایا

جاسکتا ہے، موضوع سے متعلقہ کتب کی فہارس مصادر و مراجع کا ضرور جائزہ لیا جائے، اس کی وجہ سے مواد تک رسائی میں آسانی ہوگی۔

مذکورہ مباحث کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ خطہ وتبویب اور تحقیقی مقالہ کی ترتیب و تکمیل (Synopsis and Chapterisation) کے لیے مذکورہ بالا نکات پر توجہ دینی ضروری ہے، یہی وہ بنیادی پہلو ہیں جن سے تحقیق کو گراں قدر اور قابل قدر بنایا جاسکتا ہے، مناسب ہوگا کہ چند ایسی تصانیف کا ذکر کردیا جائے جن کا قواعد تحقیق (Research Methadology) سے تعلق ہے۔ اگر یہ تصانیف ریسرچ اسکالرز کی پیش نظر ہوں تو ان کی بہت سی الجھنیں مفقود ہوسکتی ہیں، اس طرح کی تصانیف درج ذیل ہیں:

(۱) كيف تكتب بحثا ورسالة (احمد شلبى) (۲) المرشد فى كتابة الأبحاث (حلمى محمد فودة) (۳) كيف تكتب بحثا (إميل يعقوب) (۴) مصطلح البحث (ثريا ملمس) (۵) منهج البحث الأدبى (على جواد الطاهر) (۶) العلوم السلوكية- مدخل إلى البحث (صالح ابراهيم العسال) (۷) إستخدام المصادر وطرق البحث فى التاريخ المصرى (على إبراهيم حسن) (۸) تحقيق النصوص ونشرها (هارون عبد السلام) (۹) نصوص التعريف فى الأدب العربى (۱۰) كيف تكتب بحثا جامعيا (عبد المنعم الخفاجى وعبد العزيز شرف) (۱۱) اصول البحث العلمى (احمد بدر) (۱۲) اصول البحث (شوقى ضيف).

اصول تحقیق اردو مصنفین کے یہاں بھی موضوع بحث رہا، ایک بڑا ذخیرہ اردو زبان میں بھی دستیاب ہے، مثلاً:

(۱) تحقیق کے طریقہ کار (ش. اختر) (۲) اصول تحقیق (ظفر الاسلام

خان) یہ کتاب قسط وار ''البعث الاسلامی'' میں بھی شائع ہو چکی ہے اور ۱۹۹۶ء میں بیروت سے کتابی صورت میں منظر عام پر آ چکی ہے) (۳) ادبی ولسانی تحقیق (عبد الستار دلوی) (۴) تعلیمی تحقیق (احسان اللہ خان) (۵) ادبی تحقیق (رشید حسن خان) (۶) لائبریری سائنس اور اصول تحقیق (جمیل احمد رضوی) (۷) تصحیح اور تحقیق متن (پروفیسر نذیر احمد) (۸) عماد التحقیق (پروفیسر کلب عابد) (۹) مقدمہ سیرت النبی (علامہ شبلی نعمانی) (۱۰) مقدمہ تفسیر نظام القرآن (مولانا عبد الحمید فراہی) (۱۱) تحریر فی اصول التفسیر (سر سید احمد خان) (۱۲) مقدمہ تفسیر تدبر قرآن (مولانا امین احسن اصلاحی) (۱۳) رہبر تحقیق (روداد کانفرنس ۱۹۷۲ء) (۱۴) اصول تحقیق وترتیب متن (ڈاکٹر تنویر علوی) (۱۵) فن تحقیق (پروفیسر غلام مصطفیٰ خان، نقوش، لاہور جنوری ۱۹۳۶ء) (۱۶) مبادیات تحقیق (عبد الرزاق قریشی) (۱۷) اردو تحقیق نمبر (آج کل، اگست ۱۹۶۷ء) (۱۸) اردو میں اصول تحقیق (سلطانہ بخش) (۱۸) ریسرچ کیسے کریں؟ (نور الاسلام صدیقی)۔

عربی اور اردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی اصول تحقیق پر نہایت وافر ذخیرہ موجود ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ دونوں زبانوں کے محققین نے انگریزی محققین واصولیین کے قواعد وضوابط پر ہی اپنی غور وفکر کی بنیاد رکھی ہے، اس پہلو سے جو مباحث انگریزی میں ہیں اس کی مثال دیگر زبانوں میں ملنی دشوار ہے، اس موضوع سے متعلق چند تصانیف زیر تحریر ہیں، مثلاً:

(1) Research Methodology- C. M. Chaudhary
(2) Writing a Thesis- Hasting Eills
(3) A Manuscript for Thesis Writing- Arther Cale and Kari Bigelow
(4) How to Write a Thesis- Ward Reader

(5) Research and Thesis Writing- Almac B.J.C.
(6) The Art of Thinking- Dimnet E.
(7) How to Research in Education- Good C.V.
(8) Literary Thesis- George Weston Borzun
(9) The Modern Research- Jacques

مذکورہ بالا تصانیف ان طلبہ کے لیے غیر معمولی حد تک مفید ہیں جن کا تعلق آرٹس اور سوشل سائنس سے ہے، ان کی روشنی میں تبویب و تحقیق کو بہتر سے بہتر بنایا جاسکتا ہے، ایک محقق کے مسائل و مطالبات کیا ہیں؟ تحقیق کے تقاضے کیا ہیں اور ایک معیاری تحقیق کے واجبات کیا ہیں؟ ان تمام پہلوؤں کو بخوبی مذکورہ مصادر و مآخذ سے سمجھا جاسکتا ہے، آج کی تحقیق ایک دھوکہ کے سوا کچھ اور نہیں، خدا کرے یہ مقالہ تحقیق کو ایک حقیقی رخ دینے میں کامیاب ہو سکے۔

مکاتیب مشاہیر دار المصنفین - تجزیاتی مطالعہ

ابوسفیان اصلاحی

مولانا محمد عمران خاں ندوی (۱۹۸۶-۱۹۱۱ء) کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، ادارالعلوم ندوۃ العلماء کے انتظام وانصرام میں آپ کی خدمات ہمیشہ یاد کی جاتی رہیں گی، دارالمصنفین اور علامہ شبلی نعمانی سے آپ کی عقیدت تاریخ کا حصہ بن گئی ہے۔ تاج المساجد کی تکمیل وتزئین میں آپ کی مساعی جمیلہ ناقابل فراموش ہیں، اسی طرح تبلیغی جماعت کا عالمی اجتماع، سید سلیمان ندوی سمینار (۴-۶ ستمبر ۱۹۸۶ء) اوراس کے مقالات کی اشاعت بھی ایسے کارنامے ہیں جن کی وجہ سے انھیں رہتی دنیا تک یاد کیا جاتا رہے گا۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ ''مطالعہ سلیمانی'' ایک ایسا علمی ارمغان ہے جس کی وجہ سے علمی دنیا مولانا محمد عمران خاں ندوی کی شکرگزار رہے گی۔ مولانا نے اپنے استاذ گرامی سید صاحب کو درج الفاظ میں ہدیۂ عقیدت یوں پیش کیا ہے:

> ''راقم الحروف پر حضرت الاستاذ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی محبت، شفقت، رہنمائی اور سایۂ عاطفت کی طویل داستان ہے اور زمانۂ طالب علمی سے لے کر سفر مصر، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مہتممی اور بھوپال کے قیام تک محیط ہے، لیکن ان تعلقات کی تفصیل بیان کر کے میں آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کروں گا، کیوں کہ آپ کے سامنے ہندوستان کی مختلف

علمی شخصیتیں موجود ہیں جو سید صاحب کے مختلف علمی و تحقیقی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کریں گی''۔[۲]

مذکورہ کلمات سے اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ مولانا محمد عمران خاں ندوی کا سید صاحب سے گہرا تعلق تھا، اس تعلق کی مختلف شہادتیں ہیں، ان میں سے ایک نمایاں شہادت سید صاحب کے وہ ایک سو ایک خطوط ہیں جن سے دوطرفہ مراسم کا اندازہ ہوتا ہے کہ استاذ اور شاگرد کے باہمی سلاسل کس قدر مضبوط تھے، جب تک سید صاحب زندہ رہے مہر و فا کا دریا یوں ہی موج زن رہا اور تاحیات دارالمصنفین سے رشتہ استوار رہا، اسی رشتے کی شہادت مولانا مسعود علی ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور مولانا عبدالسلام قدوائی کے مکاتیب دے رہے ہیں۔ مولانا پروفیسر محمد حسان خاں اور مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی لائق مبارک باد ہیں کہ انھوں نے مذکورہ بالا شخصیات کے ان خطوط کو جو مولانا محمد عمران خاں ندوی کے نام تحریر کیے گئے تھے ترتیب دے کر شائع کر دیے۔ اسی طرح ہم شکر گزار ہیں مولانا عمران خاں کے کہ انھوں نے ان خطوط کو سنبھالے رکھا اور دست برد زمانہ سے محفوظ رکھا۔ یہ ''مکاتیب مشاہیر دارالمصنفین بنام حضرت مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری'' ۳۴۲ خطوط پر مشتمل ہیں، ان کے علاوہ بیس خطوط اس مجموعہ میں مزید شامل کیے گئے ہیں جو مولانا ندوی ازہری کی تفسیر و توضیح میں حد درجہ معاون ہیں۔

مکاتیب مشاہیر دارالمصنفین کے دو پہلو نمایاں ہیں، ایک تو یہ کہ اس سے ندوہ کے بہت سے تاریخی مسائل مبرہن ہیں، اس کے ارتقائی مراحل بھی مترشح ہیں، مولانا عمران خاں اور سید صاحب نے اس کی کس کس انداز سے چمن بندی کی ہے اسے بھی ایک حد تک سمجھا جا سکتا ہے، ان مکاتیب سے مخالفین شبلی کا

آوازہ بھی سنائی دیتا ہے، ان میں بزم شبلی کی آرائش وزیبائش بھی ہے، دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ان مکاتیب سے دارالمصنفین کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے، اس کے اغراض ومقاصد پر روشنی پڑتی ہے، علامہ شبلی نے کن مقاصد کے پیش نظر اس کی خاکہ گری کی تھی اس تک بھی پہنچا جا سکتا ہے، دارالمصنفین کی مختلف سرگرمیاں ان میں مذکور ہیں۔ تیسرا ایک پہلو یہ ہے کہ شبلی کالج کا بھی اس میں جابجا ذکر ہے، ذمہ داران دارالمصنفین خصوصاً مولانا مسعود علی ندوی نے اس کی تعمیر وترقی میں قابل ذکر رول ادا کیا ہے اور اس کی آرائش کے لیے جا بجا کشکول گدائی بھی کی ہے۔ ندوۃ العلماء، دارالمصنفین اور شبلی کالج کے ساتھ دو تین مقامات پر مدرسۃ الاصلاح کا بھی ذکر ہے، یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ دارالمصنفین اور مدرسۃ الاصلاح کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں فارغین ندوہ کی غیر معمولی خدمات ہیں اور ان دونوں اداروں کی تشہیر وتوقیر میں ان کی قابل ذکر مساعی ہیں، مذکورہ تمام اداروں کی فکری تاسیس وتعمیر میں شبلی کی کارگزاریاں شامل رہی ہیں۔ مکاتیب مشاہیر دارالمصنفین سے شبلی کے یہ تاریخی کارنامے ظاہر وباہر ہیں، اس حیثیت سے ان خطوط کی گراں قدر اہمیت ہے۔

ان مکاتیب سے یہ بھی ہویدا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سید صاحب اپنے ہی باغ سے محرومیوں کا شکار ہوئے، یہاں سے پاکستان جانے کے بعد آپ کے ساتھ کچھ بہتر سلوک نہیں کیا گیا، جس پر سید صاحب نے اظہار تأسف کیا ہے اور ذمہ داران دارالمصنفین کی بے اعتنائیوں پر شاکی ہوئے، ان مکاتیب میں تاج المساجد کی تکمیل وترتیب کا مسئلہ بھی موضوع بحث ہے، یہ بات روز روشن کی مانند عیاں ہے کہ ایک غیر مکمل نوابی سلسلے کی تکمیل کا قصد کرنا بڑی ہمت کی بات تھی کہ ایک عام انسان جو نہ تو نواب ہے، نہ ہی مملکت وریاست کا

مالک ہے اور نہ ہی اس کی دست رس میں کوئی قابل ذکر آمدنی کا ذریعہ ہے اس کے باوجود اتنے بڑے پروجکٹ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اللہ کی مدد سے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا، آپ کے نظم ونسق اور حسن انتظام کو مشاہیر علم وفن نے سراہا ہے۔ ندوۃ العلماء اور تاج المساجد آپ کے حسن انتظام کا شاہ کار ہیں۔

مذکورہ سطور کے بعد یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ پیش گفتار میں دارالمصنفین کی ابتدائی تاریخ کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اس میں کہیں مولانا حمید الدین فراہی کا ذکر نہیں ہے جب کہ مولانا ہی ''اخوان الصفا'' کے صدر تھے، انتظامی امور کے ساتھ ساتھ مولانا ہی دارالمصنفین کے روح رواں تھے، علمی مسائل میں سید صاحب وغیرہ آپ ہی سے رجوع کرتے، سیرۃ النبی اور دیگر مسائل میں علامہ شبلی اور اراکین دارالمصنفین نے آپ سے جابجا استفادہ کیا، اس لیے مناسب تھا کہ مولانا فراہی پر قدرے روشنی ڈالی جاتی، ایک وضاحت مزید ضروری ہے کہ مولانا محمد عمران خاں ندوی کو ''مولانا بھوپالی'' سے نہ یاد کیا جائے کیوں کہ اس لفظ میں عجیب بھوڈاپن ہے، ویسے بھی اہل علم کے مابین یہ بھوپالی نہیں بلکہ ندوی، ازہری کے نام سے معروف ہیں۔ مناسب ہوگا کہ چند چیزیں سید صاحب کے خطوط سے نقل کی جائیں، ایک خط میں کانگریس اور مسلم لیگ کی اچھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''یہاں کے سیاسی حالات مسلم لیگ وکانگریس کے جھگڑوں نے بہت حد تک خراب کردیے اور کانگریسیوں نے بھی اپنی حکومت سے وہ ثابت نہیں کیا جس کا دعویٰ وہ کرتے تھے مگر مسلم لیگ بھی شور وغل سے زیادہ نہیں'' ۔[۳]

مولانا نے دونوں سیاسی جماعتوں کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی کی ہے،

لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مولانا نے اپنے استاذ کی علمی جاگیر کو خیر باد کہہ کر مملکت خداداد کی راہ لی، اہل علم نے اس کا اپنے اپنے انداز سے تجزیہ کیا ہے، لیکن اتنا کہنا شاید نامناسب نہ ہو کہ استاذ محترم کی علمی وراثت کو چھوڑ کر پاکستان جانا کچھ بہتر نہ تھا، کیوں کہ سید صاحب نے استاذ محترم کے لگائے ہوئے پودے کو تناور درخت بنانے میں اپنے جسم کے ایک ایک قطرے کو نچوڑ دیا۔

مکاتیب سید میں ایک خاص بات یہ ہے کہ آپ کے تین خطوط میں مولوی سعید صاحب کا ذکر ہے، آپ کا اعظم گڑھ کے مشہور گاؤں ''بندی گھاٹ'' سے تعلق تھا، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے اساتذۂ کرام میں آپ سرخیل کی مانند تھے۔ قرآنیات، احادیث اور اصول فقہ پر آپ کی گہری نظر تھی، آپ کے اسی علمی تعمق اور وسعت نظر کا ذکر سید صاحب نے کیا ہے۔ مولوی سعید صاحب مولانا فراہی کے تلامذہ میں سے تھے، مولانا فراہی کی تدریس اور محاضرات قرآنیہ نے آپ کو صاحب بصیرت بنادیا۔[۴] ایک جگہ سید صاحب رقم طراز ہیں:

> ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو مولوی اویس صاحب نے جو پہلے استعفا کا ایک رقعہ دیا تھا، میں نے انھیں اس وقت تو روک دیا تھا، اب اس کو منظور کرتا ہوں، مجھے خیال تعلیم قرآنی کا تھا، اب مولوی سعید (احمد) صاحب آگئے ہیں انھوں نے قرآن پاک مولانا حمید الدین صاحب سے پڑھا ہے اور دس پندرہ برس پڑھایا ہے وہ پڑھا سکتے ہیں''۔[۵]

مذکورہ بالا خط میں مولوی سعید احمد کی قرآنیات کے متعلق بتایا گیا اور درج ذیل خط میں آپ کی حدیث سے متعلقہ معلومات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ رقم طراز ہیں:

''استاذ حدیث کی کمی کے سلسلے میں جناب ڈاکٹر صاحب سے شب میں گفتگو ہوئی تھی، انھوں نے فرمایا کہ اگر سید صاحب مولوی سعید صاحب استاد سرائے میر کے صلاح و تقویٰ کے علاوہ ان کے علم و مطالعہ حدیث سے مطمئن ہوں تو تجربہ کے لیے سر دست چھ ماہ کے لیے بلالیں تو مناسب ہے کہ حدیث کے سلسلہ میں ضرورت ہے، سر دست چالیس روپے ماہانہ ان کو دیا جائے، بعد میں مستقل پچاس روپے ماہانہ روپے، دینے کی صراحت ان سے کردی جائے اس لیے حضرت والا اگر ان کو پسند فرمائیں تو تحریر فرمادیں۔ خبر یہ سنی ہے کہ وہ دربھنگہ وغیرہ سے بات چیت کررہے ہیں''۔[۶]

سید صاحب نے جس طرح مولوی سعید احمد کی دو علمی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا، اسی طرح ایک تیسرے خط میں آپ کے تقویٰ و تدین اور اصول فقہ پر دسترس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سید صاحب نے فرمایا:

'مولوی سعید صاحب تقویٰ کے ساتھ حدیث اور اصول فقہ میں معرفت اور دستگاہ رکھتے ہیں، آپ کے شرائط پر وہ آئیں تو بلوالیجیے، ان کو خط لکھیے، پتہ مفتی مولوی محمد سعید صاحب سے معلوم ہوگا''۔[۷]

انھی چند نکات پر اکتفاء کرتے ہوئے اب کچھ نکات مولانا مسعود علی ندوی کے خطوط سے پیش کیے جائیں گے، مولانا ایک مخلص، منظم اور شاہ جہانی انجینئر تھے، آپ کی انجینئرنگ کے تابناک نقوش شبلی کالج، دارالمصنفین، ندوۃ العلماء اور مدرسۃ الاصلاح میں موجود ہیں، آپ کی محنت شاقہ پر تاریخ ہمیشہ ناز

کرے گی۔ ایک جگہ اپنے ایک خط میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے باب میں نہایت حقیقت پر مبنی بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں ''ہاں! آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ مدرسہ سرائے میر بھی ندوہ کا ایک دوسرا محلّہ ہورہا ہے، مجھے تو دیکھ کر حیرت ہوگئی''۔[8]

یہ تبصرہ بالکل حرف بہ حرف صحیح ہے کہ مدرسۃ الاصلاح کی ابتدائی تاریخ کی نوک پلک درست کرنے میں فضلائے ندوہ کی سعی مشکور ناقابل فراموش ہیں، اسے ایک عظیم قرآنی درس گاہ بنانے میں، ندوی اساتذۂ کرام کا اہم کردار رہا ہے، ان اساتذۂ کرام کو اس مدرسہ سے عشق اس لیے تھا کہ یہ علامہ شبلی کے خوابوں کی سچی تصویر تھے، جیسا کہ خطوط شبلی میں مذکور ہے کہ شبلی کالج، دارالمصنفین اور مدرسۃ الاصلاح کو ملا کر علامہ ایک جامعہ کی شکل دینا چاہتے تھے۔[9]

مولانا مسعود علی ندوی صاحب نے شبلی کالج سے اپنے تعلق خاطر کا اظہار درج ذیل الفاظ میں کیا ہے، انداز بیان سے آپ کے اخلاص اور جذباتی تعلق کو سمجھا جاسکتا ہے، اس میں سیل محبت رواں ہے۔ انداز تو دیکھیے:

> ''شبلی اسکول خلاف توقع وامید کالج ہوگیا، دو برس سے ہیڈ ماسٹر وغیرہ کی کوششیں جاری تھیں لیکن کوئی امید نہیں تھی، اس خبر سے تمام ضلع میں غیر معمولی مسرت پیدا ہوگئی ہے، بڑا کام ہوا، یہ سمجھو کہ علی گڑھ کالج سے مسلم یونیورسٹی ہوگئی، ہر شخص مسرور ہے، ہیڈ ماسٹر صاحب کی بھی بڑی آؤ بھگت ہورہی ہے، کل میں نے بھی ان کی چائے کی دعوت کی ہے، پیمانہ بڑا ہوگا، تمام اکابر کو بلایا ہے''۔[10]

مولانا مسعود علی صاحب نے شبلی کالج کی تعمیر وترقی کے لیے جو کچھ کیا وہ

روز روشن کی مانند عیاں ہے، آپ کی اس خدماتِ عالیہ کے باوجود پرنسپل کالج نے آپ کے ساتھ ایسا سلوک کیا جس پر آپ کو شدید رنج اور دکھ ہے، اپنی اسی تکلیف کا ذکر بڑے دکھ بھرے انداز میں یوں پیش کیا ہے:

''اس مہینہ میں مجھ کو ایک واقعہ پیش آیا، ایک صاحب جن کو میں نے ہیڈ ماسٹری دلائی، بلکہ دی، دس برس گزر گئے، مختلف اوقات میں ان کی مدد کی لیکن اس وقت جب کہ وہ ہیڈ ماسٹر سے پرنسپل ہوئے کس کالج کے، شبلی انٹر کالج کے، جس کی تعمیر و فراہمی سرمایہ میں ۱۱ر فروری سے لے کر ۳ر ستمبر تک میرا پورا وقت ۴ بجے صبح سے ۹ بجے رات تک صرف ہوا، ۳۰ر ہزار روپیہ جمع کیا، ۵ مہینہ اس طرح اس کی تعمیر میں منہمک رہا جس طرح کہ ندوہ کی مسجد میں، ۳ر ستمبر کو خدا کے فضل سے وہ عمارت مکمل ہوئی اور اس وقت اس میں تعلیم ہو رہی ہے، میں اور میرے ساتھی سیکڑوں آدمی اب تک محو حیرت ہیں کہ اتنا بڑا کام اللہ تعالیٰ نے اس آسانی سے کیوں کر انجام دلا دیا، ان کی پرنسپلی کے تمام مدارج طے کرائے لیکن محض ایک معمولی واقعہ پر یہ شکل انھوں نے اختیار کی کہ اب صرف دور کی صاحب سلامت باقی ہے، اس لیے اس زمانے میں سب سے اہم کام یہ ہے کہ تعلقات کو آخر تک نباہ لے جائیں''۔[۱۱]

مذکورہ دونوں خطوط میں یہ شہادت موجود ہے کہ انھیں علامہ شبلی کے برپا کردہ کاموں اور مناہج سے کس قدر گہرا تعلق تھا، شبلی کالج، ندوہ اور دارالمصنفین

کو وہ علامہ کی فکری جولان گاہ تصور کرتے تھے، ایک طرح سے ''اخوان الصفا'' کو ہر طرح سے مستحکم کرنے کے لیے تاحیات فکرمند رہے، یہ طے ہے کہ علامہ شبلی مصنف گر اور افراد ساز دونوں تھے اور یہ سب گر انھوں نے اپنے سیدی سر سید احمد خان سے سیکھے تھے۔ مولانا مسعود علی کی خدمات پر جتنا کچھ لکھا جائے کم ہے، دارالمصنفین کی آبیاری میں اپنی عمر کے چالیس سال صرف کیے، اس کے بعد بھی دارالمصنفین سے سبکدوش ہوجائیں یہ انھیں ہرگز گوارہ نہ تھا۔ فرماتے ہیں:

''چنانچہ اٹھارہ نومبر ۱۹۵۴ء کو بحمد اللہ چالیس برس پورے ہوگئے، اس کے بعد آخر دسمبر تک میں زندگی کی اس تبدیلی پر بہت عمیق غور کر کے اس نتیجہ پر پہنچا کہ رٹائرڈ ہونا تو ٹھیک ہے لیکن دارالمصنفین اعظم گڑھ چھوڑ کر بھیارہ میں زندگی بسر کرنا ذاتی و دارالمصنفین کے مصالح کو پیش نظر رکھ کر کسی طرح مناسب نہیں ہے''۔[۱۲]

مولانا مسعود علی ندوی کو یہ قطعاً ناپسند تھا کہ ذاتی اختلافات کی بنیاد پر دارالمصنفین کی ترقی کی راہ کا روڑہ بنا جائے، جب انھوں نے طغیانی اختلاف کو سر اٹھاتے ہوئے دیکھا تو نظامت کی تمام ذمہ داریاں شاہ معین الدین احمد ندوی کے سپرد کر دیں، جس کی وجہ سے ایک بار پھر دارالمصنفین میں فصل گل عود کر آئی اور ''بحمد اللہ دارالمصنفین کا پورا حلقہ حقیقی بھائیوں اور عزیزوں سے بھرا ہوا نظر آرہا ہے''۔[۱۳]

مولانا مسعود علی ندوی کے جذبۂ اخلاص کا مشاہدہ اس طرح کیا جاسکتا ہے:

''مجھ کو اتنے دن کے مسلسل غور میں یہ بات نظر آئی کہ دارالمصنفین جس پر میری زندگی کے چالیس سال یعنی پوری عمر صرف ہوئی، اس کو میں اپنے ذاتی اقتدار و جاہ کی بھینٹ

پر چڑھا کر رخصت ہو جاؤں، اس لیے اس میں بڑی آسانی
پیدا ہوگی ہے کہ اپنے گزشتہ گناہوں اور بداعمالیوں کا کفارہ
اس طرح ادا کروں کہ اپنے کو بالکل نیس و نابود سمجھ کر ان
حضرات کی اقتداء و اثر کو بڑھا کر دارالمصنفین کی آخری
خدمت سے سبکدوش ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوں''۔[۱۴]

مذکورہ سطور سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ مولانا نے اپنی زندگی کے قیمتی ترین ایام دارالمصنفین کے ارتقا و ارتفاع میں لگا دیے اور لگا کر خوش رہے، اسی سلسلے کی ایک زریں کڑی سید صباح الدین عبدالرحمٰن تھے جن کی ناگہانی موت نے علمی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا، انھوں نے بھی شبلی منزل کو سدابہار بنانے میں نمایاں رول ادا کیا، مکاتیب مشاہیر میں آپ کے موجودہ خطوط سے مترشح ہے کہ شبلی اکیڈمی کی آرائش میں اپنی متاع حیات کو لگا دیا وہ علامہ شبلی اور سید صاحب کے حقیقی عاشق تھے، ان کے ذکر و فکر سے انھیں راحت جاں ملتی۔ بہرکیف تاحیات کاروبار شبلی میں مستغرق رہے اور آستانہ شبلی سے وابستہ رہتے ہوئے آخری سانس لی۔ تصوف اور دیگر موضوعات سے متعلقہ آپ کی تحریریں شبلی منزل کی علمی روایت کی پاسداری کے فرائض کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ مجلہ فکر و نظر پاکستان (جنوری-مارچ ۱۹۸۸ء، ۲۵/۳، صفحات: ۳۶۰) نے آپ کی خدمات کا جلی حروف میں اعتراف کیا ہے۔[۱۵] سید صباح الدین صاحب کا دارالمصنفین سے کس نوعیت کا تعلق تھا ملاحظہ کیجیے:

''شاہ گنج سے آپ کا خط یہاں تیسرے دن ملا، خدا کرے
بھوپال بخیر و عافیت پہنچ گئے ہوں، آپ کے مشوروں سے بڑا
فائدہ پہنچا، تین دن رات اچھے گزرے، آپ کو میں

دارالمصنفین کا بہت بڑا محسن سمجھتا ہوں، آپ نے بھوپال
میں دارالمصنفین کو بڑی رقم دلائی تھی، میں تو اس کے سامنے
جھکا رہتا ہوں جو دارالمصنفین کے لیے کچھ کرے، آپ نے
جو شکریہ ادا کیا ہے اس کی ضرورت نہ تھی، آپ سے بڑا قلبی
لگاؤ ہے، اس لیے جو کچھ کیا دل کی آواز کے ساتھ کیا، البتہ
اس کی تکلیف اب تک ہے کہ جو کچھ رات کو پولیس افسروں
کی وجہ سے ہوا، اس کے لیے پھر آپ سے دست بستہ معافی
مانگتا ہوں امید ہے کہ معاف فرمائیں گے"۔[۱۶]

مذکورہ مکتوب میں دو چیزیں واضح طور سے موجود ہیں ایک تو مولانا محمد
عمران خاں ندوی کا دارالمصنفین کے تئیں جذبۂ ہمدردی اور دوسرے سید صباح
الدین صاحب کا اس سے گہرا تعلق اور اسے آگے بڑھانے کی ہمہ وقت فکرمندی
اور اسے منظم رکھنے کی پیش بندیاں، یہی اخلاص تھا کہ پاکستان سے ساڑھے
پچھتر ہزار ڈالر کی پہلی قسط انھیں موصول ہوئی۔ اسی کے حوالہ سے ایک خط میں رقم
طراز ہیں:

"میں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا مقصد یہ بتایا تھا کہ اس
ادارے کے لیے کم از کم دس لاکھ کا ایک رزرو فنڈ جمع کروں،
اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آرزو پوری کر دی"۔[۱۷]

اب قارئین خود غور فرمائیں کہ ایسے بلند عزائم اور نیک جذبات کے
حاملین کہاں ملیں گے؟ اللہ سے دعا ہے کہ دارالمصنفین ہمیشہ ایسے مخلصین سے
سرفراز ہوتا رہے، سید صباح الدین صاحب کو دارالمصنفین اور اصحاب
دارالمصنفین دونوں سے گہرا تعلق تھا، سید صاحب کو دل و جان سے زیادہ عزیز

رکھتے تھے، جس کے لیے آپ کی تحریریں اور مکاتیب دونوں دال ہیں، ۱۹۸۶ء میں سید سلیمان ندوی پر ہونے والے سمینار پر غیر معمولی خوشی کا اظہار کیا اور اس کی روداد کی اشاعت پر اپنے تأثرات کو یوں قلم بند کیا:

''مطالعۂ سلیمانی کے نسخے ملے، ان کو دیکھ کر جو خوشی ہوئی اس کا اظہار تو خط کے بجائے عندالملاقات ہی کیا جا سکتا ہے، آپ کی زندگی کا شاندار کارنامہ تاج المساجد کی از سر نو تعمیر ہے، آپ اس زمانے کے یا تو شاہ جہاں ہیں یا احمد معمار اور حامد معمار، مگر مطالعۂ سلیمانی کی کتابت، طباعت اور اس کی ترتیب دیکھ کر میری نظر میں یہ آپ کا تعمیر تاج المساجد سے کم عظیم کارنامہ نہیں ہے۔ اور میں یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں اس میں صداقت اور حقیقت اس لیے ہے کہ اس کی قدر دانی دارالمصنفین والے اور خصوصاً میری ذات حقیر ہی کر سکتی ہے۔

سید صاحب کی ہر چیز پیاری معلوم ہوتی ہے، اس لیے ان کے سلسلے میں جو کچھ کیا جائے وہ ظاہر ہے کس قدر میری نظر میں محبوب اور عزیز ہوگا، آپ نے تو مجھ کو شرمندہ کیا، میں سوچتا ہی رہا اور آپ وہ سب کچھ کر گئے جو دارالمصنفین کے اندر ہونا چاہیے تھا، اب اگر آئندہ ہم لوگ اگر کچھ کر بھی سکے تو آپ جو سبقت لے گئے اس کا بدل نہ ہو سکے گا''۔[۱۸]

یہ حقیقت ہے کہ دارالمصنفین اور سید صاحب ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں، آپ کے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے اس ادارہ کو شدید نقصان پہنچا، شاید اب تک اس کی تلافی ممکن نہ ہو سکی، اسی نقصان عظیم کا ذکر مولانا مسعود علی ندوی نے اسی انداز سے کیا ہے:

''جی ہاں قبلہ سید صاحب کی واپسی کی خبر تو غلط نکلی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے، دارالمصنفین کے ناظم و صدر بیک

وقت ہم سے رخصت ہوگئے"۔[19]

مکاتیب کے یہ چند پہلو آپ کے سامنے پیش کیے گئے، آئندہ محققین اس سے اور بھی پہلو نکال سکتے ہیں، ان مکاتیب کی خصوصیات اس طرح بیان کی جاسکتی ہیں۔ ایک تو دارالمصنفین کی تاریخ میں انھیں دستاویزی حیثیت حاصل ہے، بہت سے تشنہ پہلوؤں کی ان سے تکمیل کی جاسکتی ہے، دارالمصنفین کے بہت سے نازک مسائل کی تفہیم میں یہ معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔ اس میں مخالفین شبلی کی داستان بھی رقم کی گئی ہے، اسی طرح اس میں اراکین مجلس انتظامی دارالمصنفین کا ذکر بھی ہے، نیز اس میں معاونین و مخلصین کا تذکرہ بھی ہے۔

ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین کے تاریخی سلاسل کے ارتباط و انسجام سے انکار ممکن نہیں، ندوۃ العلماء کے بہت سے انتظامی مسائل کو ان مکاتیب میں موضوع بحث بنایا گیا ہے، مشاہیر ندوۃ العلماء کی قدرے داستان بھی مرقوم ہے، ان مکاتیب سے تاریخ ندوۃ العلماء کی بہت سی نامکمل کڑیاں پوری کی جاسکتی ہیں، اسی طرح ان خطوط سے تاج المساجد، مدرسۃ الاصلاح اور شبلی کالج پر بھی قدرے روشنی پڑتی ہے۔

ان مکاتیب کا سب سے بین گوشہ یہ ہے کہ ان سے مولانا محمد عمران خاں ندوی کے اخلاص، جذبہ اخوت، قوم و ملت اور دینی اداروں کے لیے ایثار تک رسائی آسان ہے، آپ کے علوئے حقانیت اور عزت نفس کا بھی اندازہ لگانا دشوار نہیں، مولانا مسعود علی ندوی اپنے ایک خط میں بنام حافظ محمد الیاس خاں میں رقم طراز ہیں کہ:

"عزیز عمران طبعاً تیز مزاج واقع ہوئے ہیں، غصہ بہت جلد آجاتا ہے، لیکن میں نے انھیں ایک سے زائد بار اتنا ڈانٹا

ہے کہ وہ گھنٹوں روئے ہیں، لیکن رونے کے بعد ناگواری کا

وجود ان کے چہرے پر میں نے نہیں پایا"۔ ۲۰

مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری کی انتظامی صلاحیت روز روشن کی مانند عیاں ہے، تاج المساجد، ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین کے تئیں آپ کے بصیرت افروز خیالات ہمیشہ تاریخ کی زنیت بنے رہیں گے، مکاتیب مشاہیر دارالمصنفین کی سطور آپ کی دور رس نگاہوں پر دال ہیں، مذکورہ تمام ادارے ایک عرصہ تک آپ کی فہم و بصیرت سے فیض یاب ہوتے رہے۔ مذکورہ تمام خصائص کے باوجود ان مکاتیب کے مزید اور محاسن بھی ہیں۔

ان اہم ترین مکاتیب کی اہمیت وافادیت میں مزید اضافہ ہوتا اگر انھیں ایڈٹ کر کے شائع کیا جاتا، افسوس صد افسوس کہ ان میں بہت سے ایسے پہلو ہیں جو قارئین کے لیے تشنہ طلب ہیں، سخت ضرورت تھی کہ ان پر حواشی لکھے جاتے، ان کی توضیحات کی جاتیں اور ان کے پس منظر کو بیان کیا جاتا، اسی طرح ایک اہم کام یہ تھا کہ رجال مکاتیب مشاہیر دارالمصنفین پر حواشی ترتیب دیے جاتے، یہ رجال سیکڑوں پر مبنی ہیں لیکن قارئین کی اکثریت ان کے احوال وکوائف جاننے سے قاصر ہے، اگر پروفیسر مختار الدین احمد کے ترتیب کردہ "ذاکر صاحب کے خط" اور پروفیسر لطیف الزماں ومہر الٰہی ندیم کے مرتبہ "خطوط رشید احمد صدیقی" پیش نظر ہوتے تو پتہ چلتا کہ عہد جدید میں شخصیات پر نوٹس کس قدر ضروری ہیں۔ ان کے بغیر مکاتیب کی اشاعت بے معنی ہے۔ اسی طرح شخصیات، اماکن اور اداروں کے اشاریے از حد ضروری تھے، لیکن افسوس کہ ان تمام اندراجات سے یہ مکاتیب محروم ہیں۔ اسی طرح جس جامع تعریف اور موٴقر پیش لفظ کی احتیاج تھی اس کا بھی یہاں فقدان ہے۔ ان تمام احساسات کے علی الرغم مرتبین لائق مبارک

باد ہیں کہ اتنے قیمتی ذخیرے کو اہل علم کے سامنے پیش کیا، ان مکاتیب کی وجہ سے بہت سی الجھنیں دور ہوئیں اور بہت سے مسائل کی گتھیاں سلجھ گئیں، یقیناً مورخین کی راہوں کے بہت سے پتھر ہٹ گئے اور بہت سی غلط فہمیاں حرف غلط کی طرح محو ہوگئیں، ہمیں امید ہے کہ مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری کے دیگر مکاتیب بھی تخریج وتحشیہ کے بعد منظر عام پر لائے جائیں گے۔

حواشی

۱۔ مولانا محمد عمران خاں ندوی کی حیات و خدمات کے لیے دیکھیے: حیات عمران، مسعود الرحمٰن خاں ندوی، مکتبہ دین و دانش، بھوپال، ۱۹۹۵ء، (صفحات: ۲۹۰)

۲۔ مطالعہ سلیمانی (مرتبین: مسعود الرحمٰن خاں ندوی، محمد حسان خاں) طبع اول، جون ۱۹۸۶ء، دارالعلوم تاج المساجد، بھوپال، ص۲

۳۔ مکاتیب مشاہیر دارالمصنفین بمقام حضرت مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری، (مرتبین: مولانا پروفیسر محمد حسان خاں، مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی)، مولانا محمد عمران خاں ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیر سوسائٹی بھوپال، ۲۰۱۱ء، ص۲۲

۴۔ نفس المصدر، ص۱۴۳، افسوس صد افسوس کہ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے مولوی سعید احمد ندوی کو تلامذۂ فراہی میں شامل نہیں کیا ہے، (دیکھیے: ذکر فراہی، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ، ۲۰۰۱ء، ص۵۶۸-۵۶۵

۵۔ مکاتیب مشاہیر دارالمصنفین، ص۱۱۴

۶۔ ایضاً، ص۱۴۳

۷۔ ایضاً، ص۱۴۴

۸۔ ایضاً، ص۲۳۵

۹۔ ملاحظہ ہو: مکاتیب شبلی (باہتمام مولوی مسعود علی ندوی، مطبعہ معارف، اعظم گڑھ، طبع دوم، ۱۹۲۷ء، ۲/۱۳۶، نیز دیکھیے: ذکر فراہی، ص ۴۰۵-۳۴۴

۱۰۔ مکاتیب مشاہیر دارالمصنفین، ص ۱۹۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۴۰-۴۴۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۷۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۷۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۷۲

۱۵۔ مجلّہ ''فکر ونظر'' اسلام آباد پاکستان نے مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹا ہے، اس کے لیے ہم ایڈیٹر صاحب زادہ ساجد الرحمٰن کے شکر گزار ہیں (دیکھیے: فکر ونظر، جنوری - مارچ ۱۹۸۸ء، جلد ۲۵، شمار: ۳، صفحات: ۳۶۰) صباح الدین صاحب کا حادثہ بڑا ہی دلدوز تھا، آج تک ذہن ودماغ پر مرتسم ہے، ڈالی گنج لکھنؤ کے پل پر ان کے رکشہ سے گائے کے ٹکرانے کی وجہ سے رکشہ پلٹ گیا اور آپ جائے وقوع پر ہی اپنے رب حقیقی کے سپرد ہو گئے، مرحوم دراصل سید صاحب کے تربیت یافتہ تھے، شبلی کے اتنے شیدائی کے ان پر تنقید کرنے سے اشکبار ہو جاتے۔ ایک بار خاکسار نے شبلی منزل کو لے کر ان سے الجھنا شروع کیا تو دیکھا کہ رونے لگے، ایسے شریف النفس اور رقیق القلب کے چلے جانے کی وجہ سے ہم مغموم ومحزون ہیں۔ شبلی منزل ہی آپ کی تربیت گاہ اور مقصود ومنتہا تھی، اسی تربیت گاہ کی تزئین وآرائش میں زندگی کا لمحہ لمحہ صرف کر دیا۔

۱۶۔ مکاتیب مشاہیر دارالمصنفین، ص ۳۸۸

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۹۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۰۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۴۶

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۴۱

☆☆☆

مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابت

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی

مولٰنا ابوالکلام آزاد کو قدرت نے جن اوصاف سے متصف فرمایا تھا ان میں اس لحاظ سے خطابت پہلا وصف تھا کہ مولٰنا آزاد کا اوّلین شوق یہی تھا۔ اس کے بعد وہ صحافت کی طرف راغب ہوئے۔ ان کا مطالعۂ قرآن کا اشتغال بھی ابتدائے عمر ہی سے بروئے کار آ گیا تھا۔ اس کے نمونے ہمیں خطابت اور صحافت دونوں میں ملتے ہیں۔ صحافت نے انہیں سیاست تک پہنچایا وہ ایک علمی خاندان کے فرد تھے اور چودہ برس کی عمر میں انہوں نے درسِ نظامیہ کی تکمیل کر لی تھی جس کے بعد ان کے والد مولٰنا خیر الدین (م ۱۹۰۸ء) نے انہیں اپنے گھر کے مدرسے میں جہاں مولٰنا آزاد کی اپنی تعلیم ہوئی تھی، تدریس پر مقرر کر دیا۔ ان کی ادبیت کے آثار ان کی صحافت میں نمایاں ہونے لگے تھے اور پھر خطابت بھی اس سے مبرّا نہیں رہی تھی۔ اس طرح گویا ہمیں مولٰنا آزاد کی مختلف صلاحیتوں کا ظہور بتدریج ان کی خطابت، صحافت، قرآن فہمی، سیاست، علمیت اور ادبیت میں نظر آتا ہے۔ تاہم اس کا پہلا مظاہرہ خطابت ہی میں ہوا تھا۔ ابھی وہ بچے ہی تھے کہ ان کا رجحان اس طرف ہو گیا تھا۔ مالک رام صاحب نے خطباتِ آزاد کا جو مجموعہ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کی طرف سے مرتب کر کے شائع کیا ہے اس میں ان کی بڑی بہن فاطمہ بیگم کے حوالے سے لکھا ہے:

"بچپن میں بھائی۔۔۔کبھی۔۔۔گھر کے تمام صندوقوں

اور بکسوں کو ایک لائن میں رکھ کر کہتے تھے کہ یہ ریل گاڑی
ہے۔ پھر والد کی پگڑی سر پر باندھ کر بیٹھ جاتے اور ہم بہنوں
سے کہتے تھے کہ تم لوگ چلّا چلّا کر کہو ہٹو، ہٹو، راستہ دو، دہلی
کے مولانا آرہے ہیں۔۔۔۔پھر بھائی صندوقوں سے
اترتے تھے اور بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلتے تھے
۔۔۔۔کبھی وہ گھر میں کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہو جاتے تھے اور
سب بہنوں کو آس پاس کھڑا کر کے کہتے تھے کہ تم لوگ
تالیاں بجاؤ اور سمجھو کہ۔۔۔میں تقریر کر رہا ہوں اور لوگ
میری تقریر سن کر تالیاں بجا رہے ہیں" ۔[ل]

گویا ذوق خطابت وقیادت کا اظہار تھا جو اتنی کم عمری میں ہوتا تھا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ خطابت اور قیادت کا فاصلہ بہت کم ہوتا ہے۔ مولانا آزاد کا کم عمری کا ایک شوق شاعری بھی تھا لیکن اس نے وہ کمال حاصل نہیں کیا جو مولانا کے دوسرے اشواق نے کیا اور اس لئے وہ جلدی ہی اس سے دست بردار ہو گئے۔ خطابت کا ظہور مناظرے میں بھی ہوتا ہے اور مولانا آزاد نوجوانی میں آریہ سماجیوں سے اور عیسائی مشنریوں سے مذہبی مناظرہ بھی کرتے رہے۔ اس کا مرکز بمبئی (اب ممبئی) تھا اور اس میں ان کے رفیق خاص آغا حشر کاشمیری تھے۔ اس وقت مولانا آزاد کی عمر بیس، بائیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔

تاہم مولانا کی خطابت کا اصلی دور ۱۹۲۰ء میں رانچی کی نظر بندی اور قید و بند سے رہائی کے بعد شروع ہوا جب انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس، مجلسِ خلافت اور جمعیۃ العلماء کی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ اس سے قبل ایسا نہیں تھا کہ مولانا طلاقتِ لسانی سے محروم تھے اور اس دور کی خطابت کے نمونے ناپید

ہیں۔ عرض کیا گیا کہ یہ ذوق تو انہیں قدرت نے بچپن ہی سے ودیعت کیا تھا لیکن وہ اس کی نشو ونما کا زمانہ تھا اس کے اصلی جوہر بلاشبہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے نمایاں ہوئے اور مولانا کی آخر عمر تک ان کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ اگرچہ اس کا اصلی زمانہ حصول آزادی سے قبل کا تھا لیکن ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کے بعد بھی کم سے کم مولانا کی دو بہت معرکہ آراء تقریریں ہوئیں۔ یوں تو اپنی سرکاری حیثیت میں وہ ملک اور بیرونِ ملک مختلف اہم مواقع پر تقریریں کرتے رہے لیکن ان میں خطابت کے جوہر کے مظاہرے کی گنجائش کم ہی ہوتی تھی۔ مولانا کی جن دو معرکہ آراء تقریروں کی طرف اشارہ ہوا ان میں سے ایک حصولِ آزادی کے دو ماہ بعد ہی دہلی کی جامع مسجد میں ہوئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمان تقسیم ملک کے نتائج سے سراسیمہ ہو کر ترک سکونت کر رہے تھے اور دوسری چھٹی دہائی کے آغاز میں اس موقع پر جب حکومت ہند کی وزارتِ تعلیم کی طرف سے دارالمصنفین، اعظم گڑھ کو ایک رقم دیئے جانے پر پارلیمنٹ میں اعتراض کیا گیا تھا اور اعتراض کرنے والے کوئی اور نہیں، کانگریس ہی کے دائیں بازو کے بعض لیڈر تھے۔

مولانا آزاد جو تقریریں اپنی سرکاری حیثیت میں کرتے تھے ان میں بعض اوقات ان کا ایک دوسرا جوہر نمایاں ہو کر رہتا تھا اور وہ تھی ان کی قوت حافظہ۔ دہلی میں یونسکو کا ایک جلسہ تھا۔ اتفاق سے میں بھی موجود تھا۔ مولانا کی تقریر انگریزی میں چھپی ہوئی حاضرین جلسہ کو تقسیم کر دی گئی۔ مولانا بولنے کے لئے کھڑے ہوئے اور کوئی کاغذ سامنے رکھے بغیر اردو میں تقریر فرمائی۔ حیرت ہوتی تھی کہ انگریزی میں چھپے ہوئے کلمات اور مولانا کی زبان سے نکلنے والے اردو الفاظ میں ذرا بھی تفاوت نہیں تھا پروفیسر مختار الدین احمد، سابق صدر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا بیان ہے کہ وہ ۱۹۵۵ء میں اپنے تحقیقی کام کے سلسلے

میں آکسفورڈ میں مقیم تھے۔ مولانا آزاد یوروپ کے بعض ممالک کا دورہ کرتے ہوئے لندن پہنچے۔ برطانیہ میں مقیم ہندوستانی طلبہ کو مدعو کیا گیا کہ وہ لندن آئیں، مولانا انہیں خطاب فرمائیں گے، مختار الدین احمد صاحب بھی وہاں پہنچے۔ مولانا تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ موضوع تھا ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک ہندوستان میں تعلیم کی ترقی۔ حسب معمول مولانا کے ہاتھ میں کوئی کاغذ نہیں تھا۔ مختار الدین احمد صاحب کہتے ہیں کہ مولانا نے تعلیمی ترقی کے اعداد وشمار جس طرح بیان کرنا شروع کئے حاضرین مبہوت تھے کہ مولانا کتنے قوی حافظے کے مالک ہیں۔ تھوڑی دیر میں مولانا کو احساس ہوا کہ مجمع میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اردو نہیں سمجھتے ہیں۔ مولانا کے ترجمان وزارتِ تعلیم کے سکریٹری پروفیسر ہمایوں کبیر تھے۔ مولانا نے ان سے کہا کہ اب آپ تقریر کیجئے۔ ان کے ہاتھ میں فائل تھا۔ اس کی مدد سے انہوں نے انگریزی میں تقریر کی۔ دونوں تقریروں میں جو اعداد وشمار بیان کئے گئے ان میں سر مو فرق نہیں تھا۔ راقم الحروف کو مولانا آزاد کی دو اور تقریریں سننے کا بھی اتفاق ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا تعزیتی جلسہ دہلی میں جامع مسجد کے علاقے میں ہوا تھا۔ میں وہاں حاضر تھا۔ دوسری مولانا کی وہ آخری تقریر تھی جو انہوں نے اپنی وفات سے ایک ہفتہ قبل اردو کانفرنس میں اس مقام پر فرمائی تھی جہاں اب ان کا مزار ہے۔ یہ تقریریں مختصر اور مناسب تھیں۔ ان میں خطابت کے اظہار کی گنجائش بہت کم تھی، مفتی صاحب مرحوم کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ وہ جو منصب چاہتے انہیں مل سکتا تھا لیکن انہوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں فرمائی۔ اردو کانفرنس کی تقریر میں انہوں نے کہا تھا کہ ہندی کو جو جگہ ملنی تھی مل گئی، اب اردو کو اس کا حق ملنا چاہیئے۔ اس کانفرنس کا افتتاح وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے

کیا تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ پنڈت جی کس طرح مولانا کے قریب زانو دبائے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے کہ مولانا کو بیٹھنے کے لئے زیادہ جگہ مل جائے۔ پنڈت سندر لال انجمن ترقی اردو (ہند) کے نائب صدر تھے۔ انہوں نے مولانا کا استقبال کرتے ہوئے ابھی ان کی تعریف میں چند ہی جملے کہے تھے کہ مولانا نے انہیں روک دیا اور کہا پنڈت جی، اب آپ ہی کہتے رہیں گے کہ مجھے بھی کچھ کہنے دیں گے۔

مولانا آزاد کی تحریر کی جو خصوصیت ہے وہی ان کی خطابت کی بھی ہے۔ یعنی موقع اور موضوع کی مناسبت سے اس کا رنگ و آہنگ تبدیل ہو جاتا ہے، ان کی نثر کے سلسلے میں یہ بات بارہا کہی گئی ہے کہ الہلال، تذکرہ، ترجمان القرآن اور غبار خاطر کے اسلوب کا فرق ان کے موضوع کے اعتبار سے جدا جدا ہے اس پر اس وقت مزید روشنی ڈالنی غیر ضروری ہے، یہی فرق اور امتیاز ان کی مختلف مواقع کی تقریروں میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جلسہ کسی تنظیم کا ہے، سامنے مجمع کیسا ہے، زمانہ اور دور کون سا ہے، یہ اختلافات ان کی تقریروں میں ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتے ہیں۔

ایک اور امر کا ذکر ضروری ہے، خطابت میں مہارت کے باوجود مولانا آزاد کو تقریر کرنے پر آمادہ کرنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا سے متعلق ایک مضمون میں اس طرف اشارہ کیا ہے (۲) اور یہ خود ہمارا بھی تجربہ ہے۔ ۱۹۵۱ء میں دہلی میں کانگریس کا سالانہ اجلاس تھا۔ علی گڑھ سے چند احباب اس غرض سے وہاں گئے تھے کہ مختلف لیڈروں کو دیکھ سکیں گے اور ان کی بات سن سکیں گے۔ پہلے کھلے اجلاس میں اس وقت کے متعدد اہم لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، شری راج گوپال اچاری، پنڈت گووند بلبھ پنت، شیخ

محمد عبداللہ وہاں موجود تھے۔ سب ہی نے مختلف قراردادوں پر تقریریں کیں لیکن مولانا پورے وقت خاموش بیٹھے رہے۔ اگلے دن صبح سویرے ہم لوگ ان کی کوٹھی پر حاضر ہوئے۔ شرف باریابی حاصل ہوا۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ ایک ساتھی نے عرض کیا مولانا کل کے جلسے میں آپ نے کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔ ہم نے آپ کی تقریر کبھی نہیں سنی ہے۔ اگر آج کچھ ارشاد ہو تو زہے نصیب مولانا نے فرمایا میرے بھائی، تقریر کسی کا اشتیاق پورا کرنے کے لئے نہیں کی جاتی ہے۔ جب کچھ کہنے کے لئے ہوتا ہے تب کہا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر تامل فرمایا اور پھر کہا (چہرے پر اداسی صاف ظاہر تھی) بہت بولے، بہت بولے۔ کچھ حاصل نہ ہوا۔ مولانا آزاد کو یہ احساس بہت قوی تھا کہ مسلمانوں نے ان کی بات پر کان نہیں دھرا۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد دہلی کی تقریر اسی احساس کی صدائے بازگشت ہے: ''تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں پکارا، تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیئے۔ میں نے چلنا چاہا، تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے، میں نے کروٹ لینی چاہی، تم نے میری کمر توڑ دی حتی کہ پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست آج جو تمہیں داغِ جدائی دے گئی ہے، اس کے عہد شباب میں میں نے تمہیں خطرے کی شاہ راہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں''[۳] اس تقریر میں مولانا نے صرف اپنے اس احساس کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ مسلمانوں کو ان کے پچھلے کارنامے یاد دلائے ہیں اور آئندہ لائحۂ عمل تجویز کیا ہے ''آج بھی ہم ایک دور انقلاب کو پورا کر چکے ہیں، ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان صفحوں میں زیب عنوان بن سکتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لئے تیار بھی ہیں ۔۔۔ میں تم سے نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے

وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقوش اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آرہے ہیں وہ تمہارا ہی قافلہ لایا تھا۔ انہیں بھلاؤ نہیں، انہیں چھوڑو نہیں، ان کے وارث بن کر رہو۔۔۔ آؤ عہد کرو وہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لئے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے"[۴] اس تقریر کے آخیر میں وہی بات بالفاظ دیگر دہرائی گئی ہے جو سات برس قبل کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ رام گڑھ میں اپنے خطبہ صدارت میں فرمائی تھی:

> "میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، اس کی متحدہ قومیت کا ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔[۵] گویا مولانا آزاد نے حصول آزادی سے قبل ۱۹۴۰ء میں مسلمانوں کو جو پیغام دیا تھا اور ان کے لئے جو لائحہ عمل تجویز کیا تھا ان کا وہی پیغام حصول آزادی (اور تقسیم ملک) کے بعد ۱۹۴۷ء میں بھی تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اب بھی یہی لائحہ عمل اختیار کریں۔ مولانا آزاد کی ۱۹۴۷ء کی تقریر ۶۲ برس کی طویل مدت گزر چکی ہے اور جمنا میں کتنا پانی بہہ چکا ہے تاہم کیا آج بھی اس کے علاوہ کوئی اور پیغام ہے جس کا اتباع کیا جائے اور کیا کوئی اور لائحہ عمل ہے جس پر چلا جائے؟

سلسلۂ کلام کو قائم رکھنے کی غرض سے میں بہت دور چلا گیا۔

ابھی تو ۱۹۲۰ء اور ۱۹۴۰ء کی درمیانی مدت اور پھر ۱۹۴۷ء کے بعد کی بعض تقاریر پر مختصر گفتگو کرنی ہے۔

مولانا آزاد کے ۱۹۴۰ء کے کانگریس کے خطبۂ صدارت کا ایک چھوٹا سا اقتباس گوش گزار ہوا۔ اس سے پہلے ۱۹۲۳ء میں جب ان کی عمر ۳۵ سال سے زیادہ نہیں تھی، پہلی مرتبہ کانگریس کے خصوصی اجلاس کے صدر منتخب ہوئے تھے جو دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ آئیں دیکھیں اس موقع پر انہوں نے اس بارے میں کیا ارشاد فرمایا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی کا مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کی توجہ کا خاص مرکز تھا۔ ابھی خلافت ختم نہیں ہوئی تھی اس کی بقا کے لئے مسلمانان ہند سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے اس کی معمولی سی پیش قدمی انہیں مسرور اور معمولی سی پسپائی انہیں مغموم کردیتی تھی۔ اسی سال جولائی میں (کانگریس کا یہ خصوصی اجلاس دسمبر میں منعقد ہورہا تھا) لوزان میں ترکی صلح نامے پر دستخط ہوئے تھے۔ مولانا نے اسے ''ایک بڑی قومی عظمت کی پیدائش کا دن'' قرار دیا تھا۔ (اگرچہ جلدی ہی بعد کے واقعات نے اس خوش فہمی کا ازالہ کردیا تھا)۔ مولانا خاص طور سے اس لئے خوش تھے کہ اس میں ہندوستانی مسلمانوں کی جدوجہد اور گاندھی جی کی معاونت کو بھی دخل تھا۔ مولانا اسے ہندو مسلم اتحاد کے تناظر کا مسئلہ، جس کے بغیر ہندوستان کی آزادی ایک خواب پریشاں سے زیادہ نہیں، اسی کی بدولت ان مشکلات پر غالب آگیا جو عرصے سے اس کی راہ میں حائل تھیں ہندوستان کا تمام مشرق میں وہ بین القومی وقار جس نے مشرق کے جدید بیدار حلقوں میں اسے ایک وسیع جگہ دیدی ہے اسی کا نتیجہ ہے اور اگرچہ جدوجہد وقوع میں نہ آئی ہوتی تو آج ہندوستان کی تمام ایشیا اور افریقہ

میں کیا حیثیت ہوتی''[۶] یہاں بھی مولانا آزاد ہندوستان کی نیک نامی اور عظمت میں مسلمانوں کی شرکت کو ناگزیر قرار دیتے ہیں بلکہ جزو اعظم تسلیم کرتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم مولانا آزاد کی خطابت کے بعض دوسرے نمونوں پر نظر ڈالیں مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں اس امر پر غور کرلیں کہ تحریک خلافت اصلی مقصد ومنشا کیا تھا۔ بلا شبہ ہندو مسلم اتحاد اس خطبے کا وہ حصہ آپ میں سے بہت سے حضرات کے حافظے میں محفوظ ہوگا جس میں مولانا نے ہندو مسلم اتحاد پر پورا زور بیان صرف کرنے کے بعد آخر میں فرمایا تھا ''اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے''[۷] اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ مولانا آزاد کی نظر میں ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت صرف حصولِ آزادی کی غرض سے نہیں تھی بلکہ وہ اسے وسیع تر تناظر میں دیکھ رہے تھے یعنی مذاہب عالم کے بیچ افہام وتفہیم۔ آج ہم تہذیبوں کے تصادم یا ان کی بقائے باہم کی بات کرتے ہیں، مولانا آزاد کی نگاہ دوررس کب یہاں تک پہنچ چکی تھی اور یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ جس طرح انہوں نے ۱۹۲۳ء میں ہندو مسلم اتحاد کے ہاتھ سے جاتے رہنے کے مقابلے میں سوراج ملنے میں تاخیر پر اپنی رضامندی ظاہر کی تھی ٹھیک اسی طرح ۱۹۴۷ء میں فرمایا تھا کہ ملک کی آزادی کو مؤخر کردو لیکن اس کا بٹوارا قبول نہ کرو کیونکہ آزادی تو مل کر رہے گی، آج نہیں تو کل لیکن ملک کا بٹوارا جو نقصان پہنچائے گا اس کی تلافی ممکن نہیں ہوگی۔

بعض تقاریر اور بعض خطبات کے بعض جملے تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ لوکمانیہ ملک کا قول آزادی میرا پیدائشی حق ہے۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں مولانا محمد علی کی تقریر کا آخری حصہ یا مجھے آزادی دو یا قبر کے لئے دو گز زمین۔

۱۴/اور ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب میں آزادیٔ ہند کا استقبال کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو کا بیان کہ اس وقت دنیا سو رہی ہے، ہندوستان جاگ رہا ہے، ہندوستان دو صدی کی نیند کے بعد بیدار ہو رہا ہے اور اس کی یہ بیداری ایشیا اور افریقہ کی بیداری کی نوید ہے ایسے ہی اقوال اور ایسے ہی جملے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی کئی تقریروں اور بیانات کے متعدد حصے اس زمرے میں آتے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں کلکتہ (حال کولکاتہ) کی ایک عدالت میں مولانا آزاد پر مقدمہ چل رہا تھا کہ انہوں نے برطانوی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کو حکم عدولی پر اکسایا ہے۔ مولانا نے اپنے بیان میں اس الزام کا اقرار کرتے ہوئے وہ لافانی جملے کہے تھے جو ہماری تاریخ کے انمٹ نقوش ہیں، ''مسٹر مجسٹریٹ'' یہ تاریخ کا بڑا دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے۔ جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصے میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے، تمہارے حصے میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لئے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے۔ جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مؤرخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلدی جلدی یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج، وہ فیصلہ لکھے گا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا''۔[۸] وقت کے جج نے آخری فیصلہ لکھ دیا۔ اس کا فیصلہ مولانا آزاد کی زندگی ہی میں آگیا اور مولانا نے ارشاد فرمایا: ''وہ دیکھو سامنے لال قلعے کی دیوار پر ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اُڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزاد قہقہے تمسخر کیا

کرتے تھے"۔[۹] اس بیان کو پڑھ کر گاندھی جی نے ہریجن میں لکھا تھا "مولانا کے بیان میں بہت بڑی ادبی خوب صورتی ہے۔ وہ وسیع روانی کے ساتھ پُر جوش بھی ہے وہ نہایت دلیرانہ ہے۔ اس کا لہجہ غیر متزلزل اور غیر آشتی طلب Uncompromising ہے مگر ساتھ ہی سنجیدہ اور متین بھی ہے۔ تمام بیان میں اول سے آخر تک ایک پُر جوش اثر پایا جاتا ہے۔ گویا خلافت اور نیشنلزم پر مولانا ایک پُر اثر خطبہ دے رہے ہیں"۔[۱۰] گاندھی جی کا یہ آخری قول بہت معنی خیز ہے، خلافت اور نیشنلزم پر خطبہ۔ آج تحریک خلافت کے بارے میں طرح طرح کے سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔ بعض لوگ اسے پادر ہوا تحریک قرار دیتے ہیں بیشک یہ تحریک ناکامی پر ختم ہوئی اور اسے ناکامی پر ختم ہونا تھا کیونکہ خلافت کی باگ ڈور ہندوستان کی تحریک خلافت کے رہنماؤں کے ہاتھ میں نہیں تھی بلکہ دور دراز ٹرکی کے نام نہاد خلیفہ کے ہاتھ میں تھی اور وہ نہ اب بیرونی دباؤ کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتا تھا اور نہ اندرونِ ملک اصلاح طلب نوجوان قیادت سے نبرد آزما ہوسکتا تھا۔ تاہم ہندوستان کی تحریکِ خلافت کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس کی بدولت ایک طرف ہندوستانیوں بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کا بیرونی دنیا سے رشتہ استوار ہوا اور دوسری طرف خود اس ملک کی دو بڑی ملتیں ایک دوسرے کے قریب آئیں اور نیشنلزم کا پورا سرسبز و شاداب ہوا اگرچہ بعض اسباب کی بنا پر، جن کے اظہار کا یہ موقع نہیں، یہ پودا بھی مرجھا کر رہا اور یہ مولانا آزاد کی زندگی کا بڑا المیہ تھا اس المیے کے اثرات ان کی اکتوبر ۱۹۴۷ء کی دہلی کی اس تقریر میں صاف نظر آتے ہیں: "سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے"۔[۱۱]

اوپر عرض کیا گیا کہ مولانا آزاد کی بعض اور تقریروں کے بعض حصے بھی ہوا میں تحلیل ہو کر نہیں رہے بلکہ ان کی قدر و قیمت دائمی ہے۔ بالخصوص مولانا نے ۱۹۴۰ء کے رام گڑھ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے جو لائحۂ عمل تجویز کیا تھا وہ ساری دنیا میں پھیلی ہوئی مسلم اقلیتوں کے لئے آج بھی زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ ہے۔ ''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو (اب چودہ سو) برس کی شان دار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں ۔۔۔۔۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے ۔۔۔۔۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں ۔۔۔۔۔۔ میں اپنے اس احساس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا''۔[۱۲] یہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جو مسلمانوں کو کہیں بھی اور کبھی بھی سرخ روئی اور کامیابی سے ہم کنار کر سکتا ہے۔ نہ اپنے مذہب کے احکام سے سرتابی اور نہ اپنے وطن اور قوم کے مطالبات سے پہلو تہی۔ بیشک جام و سنداں کو یک جا کرنا کار دشوار ہے لیکن مولانا آزاد کا پیغام یہی ہے اور یہی ہمارے لئے داروئے شفا ہے۔ یہی عمر بھر خود مولانا آزاد کا لائحۂ عمل رہا اور یہی لائحۂ عمل ہمارے لئے ان کی وراثت ہے۔

قولِ فیصل میں مولانا آزاد کے اس قول کے علاوہ جو اوپر نقل ہوا اور بھی بہت کچھ ہے۔ اسلام کے نظام حکومت پر اس میں بہت اچھی روشنی ڈالی گئی ہے، بالخصوص اس میں شوریٰ کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ دراصل مولانا کا پارلیمانی

جمہوریت پر اصرار اسلام کے نظام۔۔۔۔ شوریٰ ہی سے ماخوذ تھا اور خود اختیاری اور پارلیمانی حکومت ہی سے مطمئن ہونے کا اعلان وہ الہلال ہی میں کر چکے تھے۔ اس بیان میں مولانا نے صرف اپنے مسلمان اور ہندوستانی ہونے کی بات نہیں کہی ہے، اپنے انسان ہونے پر بھی زور دیا ہے انہوں نے فرمایا:

''میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے، کوئی انسان یا انسانوں کی گڑھی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے۔۔۔ (میں) اپنا ملکی، مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک وقوم کو نجات دلاؤں۔[۱۳] مولانا جس طرح غلامی سے بیزار تھے اسی طرح شخصی اقتدار سے بھی متنفر تھے۔ شخصی اقتدار ان کے نزدیک غلامی ہی کی بدلی ہوئی شکل تھی۔ اسی لئے انہوں نے یہاں ''انسانوں کی گڑھی ہوئی بیوروکریسی'' سے اپنی لاتعلقی کا اظہار فرمایا ہے۔ مولانا نے اپنے اس بیان میں ایک اور حقیقت کو واشگاف کیا ہے۔ وہ ایسی حقیقت ہے جس کا اطلاق صرف دور غلامی پر نہیں ہوتا ہے۔ افسوس ہے آزاد ممالک کا بھی اس میں استثنا نہیں ہے۔ مولانا نے فرمایا تھا: ''تاریخ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدان جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں ہی میں ہوتی ہیں''۔[۱۴] ایسے اور بھی کتنے جواہر ریز ہیں جو اس بیان میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں''۔

مولانا آزاد کی ایک تقریر کا حال مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ''ذکر

آزاد' میں لکھا ہے۔ بریلی میں جمعیۃ العلماء کا اجلاس تھا۔ مولانا آزاد کو اس کی صدارت کرنی تھی۔ مولانا احمد رضا خاں اور ان کے معتقدین کو مولانا آزاد سے دہرا اختلاف تھا، دینی مسلک کا بھی اور سیاسی فکر وعمل کا بھی۔ اس وقت مولانا احمد رضا خاں کی تو وفات ہو چکی تھی لیکن بریلی میں ان کے اہل خاندان اور متبعین کا بڑا مجمع تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مولانا آزاد کی تقریر ہو۔ ملیح آبادی کا بیان ہے کہ جلسے میں رخنہ ڈالنے کے لئے وہ لوگ تشدد پر بھی آمادہ تھے علی گڑھ سے مولانا سید سلیمان اشرف کو بلایا گیا تھا۔ وہ مولانا احمد رضا خاں کے شاگرد ومتبع تھے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ سنی دینیات میں استاد تھے راقم الحروف نے انہیں دیکھا ہے اور ان کی تقریر سنی ہے۔ بہت وجیہ شخص تھے لیکن مجھے صرف سیرت پر ان کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ بہت اچھی تقریر کرتے تھے۔ ملیح آبادی کا کہنا ہے کہ انہیں اس لئے بلایا گیا تھا کہ ان کے نزدیک ان کے حلقے میں مولانا آزاد کی تقریر کا جواب صرف وہ دے سکتے تھے۔

جب مولانا آزاد صدر کی نشست پر رونق افروز ہوئے تو ڈائس پر مولانا احمد رضا خاں کے صاحب زادے مولانا حامد رضا خاں، مولانا سلیمان اشرف اور ان کے بہت سے دوسرے، ہم مسلک موجود تھے۔ ملیح آبادی کو اندیشہ ہوا کہ مولانا آزاد پر حملہ نہ ہو جائے، اس لئے وہ ''مولانا کی پیٹھ سے بالکل مل کر بیٹھ'' گئے۔ لکھتے ہیں: ''مولانا کو فوراً محسوس ہو گیا۔۔۔۔۔ جھنجھلا اٹھے (اور فرمایا) مولوی صاحب، یہ کیا؟ آپ خدا ہیں کہ مجھے بچالیں گے؟ اٹھئے میرے پاس آکر بیٹھئے'' مولانا آزاد نے اپنے افتتاحی کلمات میں صلح صفائی کی بات کہی۔ فرمایا کہ اختلافات کوئی بُری بات نہیں بلکہ امت مرحومہ کے حق میں موجب رحمت ہیں اور پھر مخالفین کو دعوت کلام دی۔ مولانا سید سلیمان اشرف نے اپنے مسلک کی

حمایت میں تقریر فرمائی اور اس کا حاضرینِ جلسہ پر بہت اثر ہوا۔ ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ ''ان کے بعد جب مولانا آزاد تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو ''اب سمندر میں طوفانوں پر طوفان آنا شروع ہو گئے، آتش فشاں پھٹنے لگے، زلزلے زمین کو الٹ پلٹ کرنے لگے۔ ستارے ششدر رہ گئے، چاند بھی انسانی طلاقت لسانی پر مبہوت ہو کر رہ گیا''۔ ملیح آبادی کا یہ بھی بیان ہے کہ اس کے بعد مجمع کا، مع اکابر بریلی، رخ بدل گیا اور وہ سب (کم سے کم وقتی طور پر) مولانا کے ہم نوا ہو گئے اور جب قیام گاہ پر پہنچ کر ملیح آبادی نے مولانا کو مبارک باد دی تو مولانا کے مزاج کی ایک اور خصوصیت بے نیازی ظاہر ہو کر رہی۔ فرمایا: بے عقل یہ سب مہمل ہے''۔[۱۵]

مولانا آزاد کی زندگی کی آخری نہایت زبردست تقریر دور غلامی میں نہیں، حصول آزادی کے بعد ہوئی اور کسی غیر ملکی حاکم یا عدالت کے روبرو نہیں، اس پارلیمنٹ میں جسے مولانا کے سیاسی نظام فکر میں بنیادی اہمیت حاصل تھی، اپنوں کے بیچ۔ اس کے بارے میں روزنامہ اسٹیٹمین، نئی دہلی کے وقائع نگار خصوصی نے لکھا تھا کہ اتنی زبردست تقریر کسی بھی پارلیمنٹ ہاؤس میں کبھی کبھی مشکل سے ہوئی ہوگی۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس تقریر کا تأثر اتنا شدید تھا کہ ساری روایات کو توڑ کر اور سب پارلیمانی آداب کو نظر انداز کر کے اس کے اختتام پر خود وزیر اعظم نے تالیاں بجا کر اس کی داد دی تھی۔ اسی کی شہادت کے مطابق اس وقت مولانا آزاد اتنے غصے میں تھے کہ جب ان کے قریب بیٹھی ہوئی وزیر صحت راج کماری امرت کور نے انہیں پانی کا گلاس پیش کیا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ہٹا دیا۔ الزام یہ تھا کہ وزارتِ تعلیم ہندی کے فروغ کے مقابلے میں اردو کی بقا و ترقی پر زیادہ توجہ مبذول کر رہی ہے۔ جیسا کہ عرض

کیا گیا، موقع تھا وزارتِ تعلیم کی طرف سے دار المصنفین اعظم گڑھ کو گرانٹ دینے کا۔ افسوس ہے کہ مولانا کی اس تقریر کا ریکارڈ کہیں محفوظ نہیں ہے، دار المصنفین کے ناظم سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب مرحوم نے جب نئی دہلی میں پارلیمنٹ ہاؤس کی لائبریری میں جاکر ریکارڈ دیکھا تو وہ کہتے تھے کہ اس میں اس موقع کی مولانا کی جو تقریر موجود ہے وہ بالکل بے روح ہے۔ بات سے بات یاد آتی ہے۔ پاکستان میں مسٹر محمد علی جناح کی اس تقریر کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا ہے جو انہوں نے وہاں کی دستور ساز اسمبلی کا افتتاح کرتے ہوئے کی تھی اور جس میں فرمایا تھا کہ پاکستان میں نہ مسلمان مسلمان رہیں گے، نہ ہندو ہندو اور نہ سکھ سکھ، میں یہ بات مذہبی لحاظ سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ سیاسی نقطہ نظر سے کہہ رہا ہوں۔ سب پاکستان کی متحدہ قومیت کے اجزاء بن جائیں گے۔ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ریکارڈ سے بھی مسٹر جناح کے یہ الفاظ حذف کردیئے گئے ہیں۔ بہر حال مولانا آزاد نے فرمایا تھا:
''میری زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ میں بے پناہ ہوں، آپ سمجھے بے پناہ کون ہوتا ہے، نہیں، آپ نہیں سمجھتے تو میں بتاتا ہوں۔ بے پناہ وہ ہوتا ہے جسے کوئی تلوار کاٹ نہیں سکتی۔ میں بے غرض ہوں، اس لئے بے پناہ ہوں''۔ مولانا آزاد نے معترضین کی طرف انگلی اٹھا کر یہ بھی کہا تھا کہ ملک کی تقسیم کا ذمہ دار یہ دماغ ہے۔ میں نے مسلمانوں کو بہت سمجھایا کہ اکثریتی فرقے کا نمائندہ یہ دماغ نہیں ہے بلکہ گاندھی جی ہیں لیکن انہوں نے میری بات نہیں مانی اور پاکستان بن گیا۔ آج یہ موضوع پھر زیر بحث ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا اصلی ذمہ دار کون ہے اور اس بحث میں بعض اوقات مولانا آزاد کا نام نہایت غیر ذمہ دارانہ طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس بارے میں ان کا موقف وہ تھا جو یہاں بیان ہوا۔

حواشی

۱۔ مالک رام: خطبات آزاد: ۷، ۸۔ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء

۲۔ abdullah Butt: Aspects of Abul Kalam Azad:32 Maktaba Urdu Lahore, 1942

۳۔ خطبات آزاد مرتبہ مالک رام: ۳۳۷۔ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۷۴

۴۔ ایضاً: ۳۴۱۔۴۲

۵۔ ایضا: ۲۹۷۔۹۸

۶۔ ایضاً: ۱۴۹۔۷۰

۷۔ ایضاً: ۲۰۵

۸۔ ابوالکلام آزاد: قول فیصل: ۴۹، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء

۹۔ خطبات آزاد: ۳۳۹

۱۰۔ قول فیصل: ۹

۱۱۔ خطبات آزاد: ۲۳۸

۱۲۔ ایضاً: ۲۹۷۔۹۸

۱۳۔ قول فیصل: ۲۰۲۔۳

۱۴۔ ایضاً: ۸۳

۱۵۔ عبدالرزاق ملیح آبادی: ذکر آزاد، ۱۲۰۔ ۲۵، کلکتہ، ۱۹۶۰ء

☆☆☆

اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار

پروفیسر کبیر احمد جائسی

غالباً ۱۹۵۸ء کی بات ہوگی اعظم گڑھ شہر میں ادارۂ ادب اسلامی کی ایک بڑی نشست کا انعقاد ہوا تھا جس میں شرکت کے لئے اور افراد کے علاوہ شہر جونپور سے انور صدیقی بھی آئے جو اس وقت جونپور کے ایک ڈگری کالج کے بی۔اے سال دوم کے طالب علم تھے۔انور کا خاندان اصلاً الہ آباد کا رہنے والا تھا مگر وہ جونپور میں اس لئے تھے کہ ان کے والد جو محکمۂ پولس میں تھے اس زمانے میں جونپور میں تعینات تھے۔ وہ متوسط قد، صاف رنگ، دہرے بدن کے فرد تھے۔سنہرے فریم کا چشمہ اس وقت بھی ان کی آنکھوں کی زینت تھا اور وہ سرتاپا شاعر دکھائی دیتے تھے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ''فریب نگہ شوق کو کیا کیا نہ بنے'' مگر اس کا ذکر آگے آئے گا۔ وہ میرے مہمان تھے دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو دسترخوان بچھایا گیا۔ ابھی کھانا شروع بھی نہ ہوا تھا کہ پتہ چلا حضرت معری کی طرح گوشت نہیں کھاتے ہیں (بعد میں انکشاف ہوا کہ کباب سے شغل فرمالیتے ہیں) یہ سنتے ہی میں دسترخوان چھوڑ کر تیزی سے اندر گیا اور والدہ مرحومہ سے صورت حال بیان کی انہوں نے مجھے تسلی دی اور آلو، پالک اور ٹماٹر کی سبزی نکال کر دی۔ خشکہ اور دال پہلے ہی سے دسترخوان پر تھی غرض کہ انور کی رغبت کے مطابق ان کو 'ماحضر'' پیش کر دیا گیا۔ یہ ان سے پہلا تعارف تھا بعد ازاں اعظم گڑھ کے علاوہ میرا ان سے علی گڑھ اور دہلی میں اس وقت تک رابطہ رہا

جب ۱۹۸۰ء کے اواخر میں دہلی کو خیر باد کہہ کر میں سری نگر نہیں چلا گیا۔ پہلی ملاقات کے بعد میں نے ان کے جو جو بدلتے رنگ دیکھے آج انہیں قلم بند کرنے بیٹھا ہوں۔ یہ وہ باتیں ہوں گی جن کو اب میرے علاوہ کوئی اور بتانے والا غالباً باقی نہیں بچا ہے ان تمہیدی جملوں کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس ماحول کا بھی قدرے ذکر ہو جائے جس کو ہم میں سے کسی نے کم اور کسی نے زیادہ بھلا دیا ہے۔

۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا تھا اس کی ایک الگ آواز دھیرے دھیرے اہالیان ملک کے کانوں میں آنے لگی تھی۔ جماعت اسلامی کی فکر سے ہم آہنگی رکھنے والوں کی ایک قابل لحاظ تعداد ادبی منظر نامہ پر ابھر کر سامنے آئی ان ادیبوں کی تنظیم کا نام ادارۂ ادب اسلامی رکھا گیا۔ ابھی آغاز کار ہی تھا کہ ۱۹۴۷ء میں انگریز ہندوستان کو کنگال بنا کر چلتا بنا۔ جاتے جاتے اس نے ملک کے دو حصے اس طرح کروا دیئے کہ اب شاید ہی یہ حصے مل جل کر اپنی پہلی صورت اختیار کر سکیں اگرچہ دونوں نوزائیدہ ممالک ایک ہی ملک سے عالم وجود میں آئے تھے لیکن جغرافیائی اور تمدنی وجوہ سے دونوں کے مسائل ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے ہندوستان میں آزادی ملنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد ایک سیاسی پارٹی کے ترجمانی کرتے ہوئے اردو کے مشہور شاعر فیض احمد فیض نے کہا۔

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

ایک طرف یہ احساس تھا دوسری طرف حکومتِ وقت کے خلاف تلنگانہ میں جنگ جاری ہو گئی تھی۔ دنیا کا قاعدہ یہ ہے کہ فاتح غازی اور مفتوح باغی قرار دیا جاتا ہے۔ تلنگانہ میں بھی یہی ہوا کہ برسوں کی جنگ کے خاتمے کے بعد تحریک

چلانے والے باغی اور حکومت وقت فاتح قرار دی گئی مگر ''باغیوں'' کی تحریک زیر زمین وہ زہر چھوڑ گئی جو برسہا برس زمین ہی کو نہیں پوری فضا کو مسموم بنائے رہی۔
تلنگانہ تحریک سے منسلک لوگ کمیونسٹ نظریات وخیالات کے حامل تھے وہ اپنے اپنے انداز سے نو حصول آزادی کے خوب وزشت کے بارے میں سوچنے لگے
تقسیم ہند نے جس تعصب کو جنم دیا تھا اس کا بدترین مظاہرہ مولانا حسین احمد مدنی ہی نہیں مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کی آنکھوں کے سامنے دار العلوم دیوبند کی تلاشی کی شکل میں ہوا تھا۔ اسی کے آگے پیچھے رات کی تاریکی میں میر باقی کی بنوائی مسجد جو عرف عام میں بابری مسجد کہی جاتی ہے ایک سازش کا شکار ہوئی اور مسجد کے وسطی گنبد کے نیچے ''رام للاّ'' کو پرکٹ کر دیا گیا، اس وقت بھی مولانا آزاد، مولانا مدنی اور سکولر افراد کے سرتاج کہے جانے والے پنڈت نہرو زندہ تھے مگر پنڈت گوبند پنتھ کی عیارانہ اور شاطرانہ چالوں کے آگے سب بے بس ہو کر چپ ہو رہے۔ مولانا آزاد فروری ۱۹۵۸ء تک اور نہرو مئی ۱۹۶۴ء تک زندہ رہے مگر ۱۹۴۹ء میں مسجد پر جو غاصبانہ قبضہ ہوا تھا اس پر کچھ بھی نہ کر سکے حالانکہ ایک غیر مسلم اکشے برہمچاری نے مسجد کی بازیابی کے لئے بھوک ہڑتال تک کی اور دو تین برسوں تک شہروں شہروں گھوم گھوم کر رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر وہ بھی کچھ کر نہ سکے برہمچاری جی کو مسلمان زعما پر اس لحاظ سے برتری حاصل ہے کہ انہوں نے عملی طور لب کشائی کی جرأت کی جس نے گرتی دیوار کو کچھ دیر تک تھامے رہنے کا کام انجام دیا۔
تقسیم کے بعد کے مذکورہ بالا ماحول میں جماعت اسلامی سے فکری اتفاق رکھنے والے کچھ افراد نے ادارۂ ادب اسلامی کی بنیاد رکھی جس کا خاص مقصد ترقی پسندوں کے ادبی نظریات کی تردید ونفی تھا۔ جب تک حریف میں

قوت وتوانائی رہی نظریۂ ادب اسلامی کے حاملین بھی اپنی قوت بازو کا مظاہرہ کرتے رہے اور جب حریف انتشار اور مردنی کا شکار ہوا تو کوئی مدمقابل نہ ہونے کی وجہ سے ادب اسلامی کی تحریک بھی نیم جان بلکہ بے جان ہوگئی۔

بیسویں صدی کی پانچویں اور چھٹی دھائی ادب اسلامی کا زرّیں عہد تھا اس کے ہراول دستہ میں جو لوگ شامل ہوئے ان میں میرے نزدیک نعیم صدیقی، ابوالمجاہد زاہد، حفیظ میرٹھی، ابن فرید کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ بعد کے لوگوں میں سید عبدالباری، انور صدیقی، ابوالفہم وحید حیدرآبادی، حسّان کلیمی، شمیم، جاوید کے نام میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے ان میں سے انور صدیقی اور حسّان کلیمی کسی ''رومانی تصور'' کی وجہ سے اس قافلے کے ساتھ آئے تھے مگر جلد ہی دونوں نے تحویل قبلہ کرلیا۔ اس کے بعد انور کی بیشتر صلاحیت فقرہ بازیوں میں صرف ہونے لگی، اسی دور سے ان کو ادارۂ ادب اسلامی کے شاعروں کی نظموں اور غزلوں میں ''قل اعوذ بیت'' کی بو آنے لگی۔ اس کے بعد ہوا یوں کہ جیسے جیسے ان کو فارغ البالی نصیب ہوتی گئی ان کی فقرہ بازیاں بڑھتی گئیں، اس دور میں انہوں نے کچھ تنقیدی مضامین ضرور لکھے جن کا سلسلہ گاہے بگاہے چلتا بھی رہا مگر جم کر انہوں نے کوئی ٹھوس علمی کام نہیں کیا۔ ایک عرصے کے بعد انہوں نے اپنے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ۱۹۹۳ء میں شائع کروایا۔ یہ ۱۶۷ صفحات پر محیط مجموعہ ''شناس وشناخت'' کے نام سے شائع ہوا اور اس پر ۱۹۹۴ء کے ''نقد ونظر'' علی گڑھ میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب نے مفصل اظہار خیال بھی فرمایا۔ اسلوب صاحب کے فرمودات کا ذکر آگے کی سطروں میں آئے گا۔ اگر شاہد علی خاں ''شناس وشناخت'' کی شائع نہ کرتے تو شاید آج بھی یہ مضامین رسالوں کی فائلوں میں دفن رہتے۔ شاعری وہ اپنی آخری بیماری کے

آنے سے پہلے تک کرتے رہے مگر انہوں نے اپنا مجموعۂ کلام مرتب کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اپنی شاعری کی ابتدائی ایام میں تو وہ انتہائی پابندی کے ساتھ اردو کے رسالوں میں اپنا کلام شائع کرواتے رہے پھر وہ ''ہوا کے دوش'' پر اس طرح سوار ہوئے کہ تادم مرگ فرش نشین نہ ہوئے۔

انور میرے ہم عمر اور اچھے نہیں بلکہ بہت اچھے دوست تھے۔ علی گڑھ ہو یا اعظم گڑھ یا پھر دہلی ان کا ہر جگہ کا جلوہ ''رنگ دگر'' رکھتا تھا کوشش کر رہا ہوں کہ ان کے جلوؤں کی کچھ جھلکیاں اس تحریر کے ذریعے آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر دوں۔

جس وقت میری ان سے علی گڑھ میں ملاقات ہوئی وہ آفتاب ہوسٹل میں رہتے تھے جس میں پرانے زمانے سے لے کر آج تک صرف ریسرچ اسکالرز یا فرسٹ ڈویزن پانے والوں کو جگہ دی جاتی ہے۔ آفتاب ہوسٹل میں وہ دو برسوں تک رہے۔ اسی زمانے سے ان کی نیم سیمابیت کا آغاز ہو چکا تھا مگر لباس اب بھی وہی چوڑی مہری کا پائجامہ اور شیروانی تھا۔ پتلون بوشرٹ تو بعد کا قصہ ہے جس نے ان کی زندگی کے آخری پڑاؤ تک ساتھ دیا جب وہ اعظم گڑھ کے شبلی کالج میں انگریزی کے لکچرر ہو گئے تب یہ لباس لوگوں کے ''بھڑ کانے'' کی وجہ سے اختیار کیا گیا تھا۔ علی گڑھ میں جن لوگوں کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا ان میں ابن فرید صاحب کے علاوہ بڑوں میں شعبہ انگریزی کے زین العابدین صاحب، معزز علی بیگ صاحب (جو بعد کے زمانے جن سنگھ کے ٹکٹ پر علی گڑھ سے الکشن لڑے تھے اور کامیاب ہو کر یوپی اسمبلی کے ممبر رہے تھے) جذبی صاحب، غلام سمنانی، حسن مثنیٰ انور، صبیح الدین انصاری کے نام یاد آرہے ہیں۔ ہو سکتا ہے دو چار حضرات اور ہوں مگر اس وقت مجھ کو ان کے نام یاد نہیں آرہے ہیں۔

علی گڑھ سے انور کو اکھاڑ پھینکنے والے ان ہی کے شعبہ کے ایک ''گربۂ مسکین'' تھے۔ ہوا یوں کہ انور نے اپنی فقرہ بازی میں مست ہو کر اس زمانہ کے شعبہ انگریزی کے صدر کی شان میں قصیدہ کہہ ڈالا جس کا ایک مصرع تھا:

ہائے اک جہل مرکب کا بی۔ اے خاں ہونا

یہ مصرع شعبۂ انگریزی کے اُسی ''گربۂ مسکین'' نے بی۔ اے، خان کی خدمت میں پہونچا کر اپنی نوکری پکّی کر لی اس طرح انور کو ''دائمی دیس'' نکالا ملا اس ''گربۂ مسکین'' کا نام انور کے معاصر شہریار نے مجھ کو بتلا دیا ہے مگر انور نے ان کا نام مجھ سے کبھی نہیں بتلایا ہے اس لئے ''سنی'' ہونے کے باوجود میں ان کا نام نہیں لکھ رہا ہوں ویسے ہیں وہ بڑے حضرت۔

انور پہلے عارضی لکچرر ہوئے اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کی ایک سازش کا شکار ہو کر عارضی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ خوش قسمتی سے اسی زمانے میں ان کو شبلی کالج اعظم گڑھ میں لکچرر شپ مل گئی جہاں وہ سال سوا سال تک کام کرتے رہے جب وہ اعظم گڑھ میں تھے تو میں علی گڑھ آچکا تھا اس لئے وہاں کے ان کے گزارے ہوئے شب و روز کے بارے میں کچھ کہہ نہ سکوں گا۔ یہ خوش قسمتی ہی ہے کہ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد صاحب نے اپنی خودنوشت ''رقصِ شررِ'' کے کئی صفحات میں ان کے احوال و کوائف قلم بند کر دیئے ہیں۔ یہاں میں طول بیانی سے بچنے کے لئے ان کے فرمودات کا لب لباب اپنے الفاظ میں لکھ رہا ہوں۔

یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ شبلی کالج میں ان کا تقرر کس سنہ میں ہوا تھا ہر ''امدادی'' (Aided) تعلیمی ادارہ میں ایک انتظامیہ کمیٹی ہوتی ہے۔ جو تین یا پانچ سال تک اپنا جلوہ دکھانے کے بعد پھر اپنی قسمت آزمائی کرتی ہے جو افراد

منتخب ہو جاتے ہیں وہ جوڑ توڑ کر کے دو دھڑوں میں بٹ جاتے ہیں اور یہی دونوں دھڑے لڑتے بھڑتے اداروں کا کام چلاتے ہیں ان اداروں کے سربراہوں کو معمولی سی پابندی کے ساتھ مطلق العنانیت حاصل ہوتی ہے جس پر ادارہ کی انتظامیہ کوئی گرفت نہیں کرتی۔ میں جس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں اس زمانے میں کالجوں کے لکچررز کی بنیادی تنخواہ دو سو دس روپیے ماہانہ سے شروع ہوتی تھی مگر بے دست و پا نو گرفتاران کی تنخواہ کا تعین پرنسپل کے رحم و کرم پر ہوتا۔ تنخواہ جو بھی مقرر ہو مگر اس کو دستخط پوری تنخواہ کی وصولی کے رجسٹر پر کرنی ہوتی۔ اس طرح نہ جانے کتنے ضرورت مندوں کا ''جھٹکا'' کیا جاتا۔ مشہور مصنف اور دارالمصنفین کے سینیر رفیق سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا بھی مدتوں ہر ماہ جھٹکا ہوتا رہا۔ ان کو مشاہرہ کے نام پر صرف سو روپیے دیئے جاتے اور دستخط پوری تنخواہ کی وصولیابی کے رجسٹر پر لئے جاتے۔ اس تمہید کو ذہن میں رکھیے اور ملک زادہ منظور احمد کے اس انکشاف پر سر پیٹیے کہ انور صدیقی کو صرف پچاس روپیے ملتے اور کالج کے چپراسی کو ان سے تقریباً دو گنا۔ ملک زادہ صاحب کا کہنا ہے کہ ان کی نرگسیت اس زمانے میں بھی تھی اور اپنی شیروانی پہن کر دیر تک آئینہ کے سامنے کھڑے ہر ہر زاویے سے اپنا جائزہ لیا کرتے۔ اس وقت ان کے والد جو محکمہ پولس میں غالباً کانسٹبل تھے۔ جونپور میں تعینات تھے، ان کی شادی ہو چکی تھی اس لئے ہر سنیچر کی دوپہر تک وہ اعظم گڑھ چھوڑ دیتے اور دوشنبہ کی صبح کو واپس آ جایا کرتے۔ تنخواہ کی کمی کا احساس ان کو بڑی حد تک احساس کمتری کا شکار بنائے تھا جس کی وجہ سے نروس برک ڈاؤن تک کی نوبت آ گئی تھی مگر احباب کی دلداری اور معاملہ فہمی کی وجہ سے جلد ہی سنبھل گئے۔

غالباً اسی احساس کمتری کی وجہ سے ان کی فقرہ بازی دو دھاری تلوار

ہوتی جارہی تھی۔ ملک زادہ منظور احمد صاحب نے اپنی خودنوشت میں ان کی فقرہ بازی کا ایک نمونہ تحریر کیا ہے جو ان ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

''ایک بار ٹائم ٹیبل کچھ اس طرح بنا کر زیادہ تر لڑکیاں وسیم الحسن صاحب کے سکشن میں پڑ گئیں انور صاحب کے سکشن میں صرف ایک لڑکی رہ گئی اس بات کا ان کو اور بھی زیادہ ملال تھا اور ان ہی کو کیا ہم سب ہی کو تھا۔ ہم سب تو خاموش رہ گئے مگر انور صاحب سے ضبط نہ ہوسکا۔ ایک دن لکچر کے دوران صبر وضبط کا پیمانہ جھلک اٹھا۔ بولے ''عطر کی جتنی شیشیاں تھیں وہ شوکت سلطان صاحب نے وسیم الحسن صاحب کے سکشن میں پارسل کردی ہیں میرے کلاس میں صرف ایک آئی ہے اور سنا ہے وہ بھی خالی ہے'' (ص:۱۲۳)

بہ قول ملک زادہ صاحب اس زمانے میں ان کی ''عجیب وغریب ذہنی کیفیت تھی۔ اسی عالم میں وہ ایک دن کلاس پڑھانے کے بعد اس طرح غائب ہوئے کہ پھر لوٹ کر شبلی کالج نہ آئے۔ نہ تو انہوں نے کالج سے رخصت کی درخواست دی تھی نہ ہی اپنے دوست احباب سے اس کا کوئی ذکر کیا تھا وہ اس ذہنی کیفیت میں اپنے والدین کے پاس جونپور پہونچ گئے وہاں پہونچ کر انہوں نے اپنے گھر والوں سے کیا کہا یہ ایک راز ہے جس پر سے پردہ اٹھانے والا اب شاید ہی کوئی زندہ ہو۔

جہاں تک ''عطر کی شیشی'' کی بات ہے اس کے بارے میں میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں ستمبر ۱۹۷۴ء سے نومبر ۱۹۸۰ء تک میرا ان کا جامعہ ملیہ میں ساتھ رہا اور روز کا ملنا ہوتا تھا کبھی کالج میں زیادہ تر اسٹاف کلب میں بعد مغرب۔ ان چھ برسوں

میں انہوں نے میرے سامنے کسی عطر کی شیشی کا کوئی تذکرہ اشاروں کنایوں میں بھی نہیں کیا، ہوسکتا ہے ان کو اپنا ہی ایک شعر بار بار یاد آتا رہا ہو:۔

کیوں جنوں تھا کس لئے وقفِ غم و حرماں تھا دل
دوستو کیا تذکرہ اک بات تھی آئی گئی

دہلی میں جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو ان کی وارفتگی پر ہر ایک طرح کا باندھ بندھ چکا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب وہ خود فراموشی کے لئے مچھلی کے شکار پر جاتے۔ کبھی بلاّ ہاتھ میں نہ لینے کے باوجود کرکٹ میچ دیکھنے کے لئے ٹیلی ویژن سے چپکے بیٹھے رہتے۔ ہر ہر گیند پر یا تو بالر کی تعریف کرتے یا بیٹس مین کی غرض کہ ٹورنامنٹ کے دنوں میں یہی لیل ونہار تھے۔ خالی دنوں میں عصر کے بعد مطالعہ کیا کرتے اور پان پر پان کھاتے رہتے دل چاہتا تو کسی ادبی محفل میں بھی شریک ہو جایا کرتے ورنہ زیادہ تر ان کا یہ معمول تھا کہ شام ہوتے ہی سج دھج کر اسٹاف کلب کی طرف چل دیتے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آنے کے بعد وہ نہ جانے کس طرح خواجہ حسن ثانی نظامی کے ''دربار'' تک پہونچے اور اس طرح پہونچے کہ سلطان جی کے عرس کی شرکت سے کہیں زیادہ خواجہ صاحب کے شغلِ شکار کے ایسے ساتھی بن گئے کہ ان کے بغیر شکاریوں کو شکار کا مزہ نہ آتا۔ وہ خواجہ صاحب اور ان کی پارٹی کے ساتھ اتنی ''چلائی'' کرتے کہ تھک کر بیٹھ جاتے۔ غالباً یہ بھی خود فراموشی کا ایک بہانہ تھا۔ شکار پارٹی حدود دہلی سے نکل کر ہریانہ کے جنگلوں میں ہرن یا چکارے کا شکار کرتی۔ خواجہ صاحب کی جیپ میں شکار لاد کر لانے کے لئے مستقل طور سے جال بندھا رہتا۔ جیپ خواجہ صاحب کے چھوٹے بھائی مہدی مرحوم نظامی چلاتے اور اگر کہیں جیپ خراب ہو جاتی تو متین امروہوی صاحب

اس کو ٹھونک پیٹ کر درست کر دیتے۔ ادھر شکار ذبح ہوا ادھر آن کی آن میں اس کو لادلود کر عجلت کے ساتھ بستی حضرت نظام الدین اولیا پہونچا دیا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب انور کو شکار کا حصہ ضرور دیتے اور وہ اس کو گھر لے بھی جاتے مگر کھاتے وہی ارہر کی پتلی دال لوکی یا کدّو کی بھجیا۔ حسن ثانی نظامی صاحب کبھی کبھی اپنی بستی کے کسی کبابیے کو بلا لیتے اور سیخ کباب لگواتے اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے ایک ''کبابیہ'' مشاعرہ بھی ہوتا یاد پڑتا ہے کہ ایک بار کے اسی طرح کے مشاعرے کی صدارت مظفر حسین صاحب برنی نے کی تھی اور حکیم کوثر چاندپوری مرحوم بھی شریک بزم تھے ظاہر ہے انور تو اس میں شریک تھے ہی۔

جہاں تک مجھ کو معلوم ہے انور کو تصوف کا کوئی خاص ''ذوق'' نہ تھا عملی کا تو ذکر کیا نظری بھی نہیں، مگر ان کو خواجہ حسن ثانی نظامی کی معیت بہت عزیز تھی۔ عرس اور شکار کے علاوہ بھی وہ خواجہ صاحب کے در دولت پر قدم رنجہ فرمایا کرتے تھے۔ عرس کے اور دنوں میں جاتے یا نہ جاتے مگر جس دن سلطان جی یا خواجہ حسن نظامی کی حیات و خدمات پر مقالہ خوانی ہوتی اس دن خود تو جاتے ہی ہم سب کو ہانک لے جاتے۔ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں چھ برسوں تک رہا اور کم از کم چھ تحریریں میں نے بھی پڑھیں۔ ان تحریروں کے محرک اصلی انور ہی تھے اسی سلسلہ سخن میں ایک بات اور لکھ دوں یہ شاید ہی کچھ لوگوں کو یاد ہو۔ ایک بار کے جلسے میں میں نے سلطان جی کے علاوہ ان سے پہلے کے دیگر مشائخ چشت کے ملفوظات کا ذکر کیا تھا جس پر نثار فاروقی مرحوم نے زبردست حملہ کیا تھا جو خواجہ حسن ثانی نظامی کے سمیناروں میں عام طور سے نہیں ہوتا قبل اس کے کہ میں اپنا دفاع کرتا خواجہ صاحب نے فوراً اٹھ کر میرے خیالات کا دفاع کیا اور نثار صاحب کے رویے پر مہذب انداز سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ انور کا پورا

جرگہ سیمنار میں شریک ہوتا آلو گوشت کے روایتی لنگر سے مستفید ہو کر جامعہ نگر واپس آجاتا۔ اگر دیر ہوجاتی تو خواجہ صاحب کی جیپ ان ''آہوان صحرا'' کو جامعہ نگر چھوڑ جاتی جو اس وقت آج کی طرح آباد نہ تھا۔

ان تمام شعوری خود فراموشی اور باقی ماندہ نرگسیت کے باوجود وہ ایک ذمہ دار شوہر اور باپ بھی تھے۔ ایسا تو بہت سے لوگ کرتے ہیں مگر ان کے دل درد آشنا کا جو نمونہ میں نے دیکھا وہ فی زمانہ کم ہی نظر آتا ہے، میرے قیام دہلی کے زمانے میں ان کی جوان چھوٹی سالی کا انتقال ہو گیا۔ ان کی دو اولادیں ایک بچی اور ایک بچہ تھا۔ انور اپنی اہلیہ کے ساتھ تعزیت کے لئے گئے تو واپسی پر دونوں کو اپنے ساتھ لے آئے۔ انور کے لڑکے اور لڑکیاں بڑے ہو چکے تھے وہ اپنے خالہ زادوں کے ساتھ ان کی توقع کے مطابق کھیل کود نہ سکتے تھے۔ کوئی ہم جولی نہ ہونے کی وجہ سے دونوں بہن بھائی آپس ہی میں دھینگا مشتی کرتے رہتے۔ بچی کا نام کوثر تھا بچے کا نام ذہن میں محفوظ نہیں رہ سکا۔ کوثر زیادہ تر اپنے بھائی پر حاوی ہو جاتی، انور کن آنکھیوں سے دیکھا کرتے جب جنگ وجدل حد سے بڑھتا نظر آنے لگتا تو اٹھ کر دونوں کو الگ الگ کر دیتے۔ نہ ڈانٹتے نہ آنکھیں دکھاتے نہ چیخ پکار کرتے سہولت سے دونوں کو الگ کر کے جو کام کر رہے ہوتے اس میں لگ جاتے۔ ۱۹۸۰ء تک بچے ان ہی کے پاس تھے میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے یتیم بچوں کی دلدہی اپنے بچوں سے کسی طرح کم نہیں کی۔

اسی سلسلے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ ان کی خوشدامن صاحبہ علاج کی غرض سے انور کے پاس آئیں۔ دوران علاج جلد ہی ان کا نتقال ہو گیا ان کی تجہیز و تکفین کے فرائض جامعہ والوں نے اس طرح انجام دیئے کہ انور پر کوئی ذہنی بار نہ پڑنے پایا۔ جب ہم لوگ مرحومہ کا جنازہ لے کر چلے تو اچانک بادل نمودار

ہوئے اور ایک لہرا برس کر مطلع صاف ہوگیا۔ ضیاء الحسن صاحب فاروقی پرنسپل جامعہ کالج (اس وقت تک فیکلٹیز نہ بنی تھیں) نے انور سے کہا کہ جس میت پر بارش ہو جائے تو سمجھ لو کہ اس کی بخشش کی نوید مل گئی اس بات کو سن کر ان کے چہرے پر ایسی بشاشت نظر آئی جو پھر دیکھنے کو کبھی نہ ملی۔ دفن سے پہلے ایک اور بات سامنے آئی جنازہ قبرستان کی طرف چلنے سے پہلے ہولائے بولائے انور نے کہا کہ ''عہد نامہ'' تو آیا نہیں۔ بہت سی جگہوں میں عہد نامہ نام کی چھپی ہوتی عربی کی ایک عبارت قبر میں رکھی جاتی ہے خدا جانے اس میں کیا لکھا ہوتا ہے۔ بہر حال مہدی نظامی مرحوم نے دبی زبان سے اس کی کوئی شرعی حیثیت نہ ہونے کی بات کہی مگر انور نے ان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کاغذ کو بھی میت کے سینے پر رکھوادیا۔ ادھر کچھ عرصے سے ایک اور نئی چیز دیکھنے میں آرہی ہے۔ مرد ہو یا عورت اس کا کفن تو اب بھی سفید رنگ کا ہوتا ہے لیکن اس پر سبز رنگ کا کپڑا ضرور رکھا جاتا ہے پتہ نہیں یہ رسم کہاں سے شروع ہوئی ہے۔ میں نے انور کو نہ تو کسی قبر پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھتے دیکھا ہے اور نہ ہی دعا مانگتے نہ جانے کیوں ایک غیر مصدقہ چیز ''عہد نامہ'' کو انھوں نے اپنی خوشدامن کی قبر میں رکھوایا۔

ان کی انسان دوستی کی ایک اور مثال یاد آ گئی اس کو بھی ضبط تحریر میں لا رہا ہوں آج کی نسل تو اس واقعہ کو بھول بھال چکی ہے۔ ان کے شعبے کے ایک استاد انور علی خاں سوز تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے قدیم طالب علم اور انگریزی زبان کے قابل ذکر مضمون نگار۔ ایک زمانہ میں ریڈینس (Radiance) نامی انگریزی ہفتہ وار کے ہر شمارہ میں مختلف مسائل پر ان کے مضامین شائع ہوتے تھے، جامعہ ہی میں پولی ٹکنک کے ایک استاد صفدر صاحب تھے جن سے سوز صاحب کی گہری دوستی تھی۔ ایک دن سوز صاحب صفدر صاحب کی وگّی پر بیٹھے

ہوئے کہیں جارہے تھے راستے میں کسی وجہ سے صفدر صاحب کا توازن بگڑ گیا اور دونوں حضرات سڑک پر گر گئے۔ دونوں ہی کو اندرونی چوٹ آئی صفدر صاحب تو جلد ہی اللہ کو پیارے ہوئے سوز صاحب پر اس کا اثر دیر سے ہوا اور وہ ذہنی طور پر پراگندہ خاطر ہو گئے۔ اگر چہ وہ چلتے پھرتے دوسروں کو پہچانتے، کچھ باتیں بھی کرلیا کرتے مگر ان کو پڑھانا یاد نہیں رہ گیا۔ انور صدر شعبہ تھے انہوں نے سوز صاحب کے کلاسز اپنے رفقا میں بانٹ دیئے اور ٹائم ٹیبل میں ان کا نام چلتا رہا اس طرح انور صدیقی خاموشی سے ان کو تنخواہ دلواتے رہے۔ ایک دن اچانک اپنی رو میں سوز صاحب نہ جانے کدھر نکل گئے پھر کبھی کسی نے کبھی ان کو کہیں نہیں دیکھا۔ اس حادثے کے بعد ان کی اہلیہ کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔ انور سے جب تک ہو سکا ان کو تنخواہ دلواتے رہے اس سے آگے ان کے بس کی کوئی بات نہ تھی اس لئے انہوں نے اپنے لبوں پر مہر سکوت لگالی۔

وہ جامعہ کالج آنے کے بعد سیدھے اپنے شعبہ میں جاتے اگر کچھ سرکاری کاغذات ہوتے اُن کو دیکھنے کے بعد کلاس لینے چلے جاتے جب پڑھا کر فارغ ہوتے تو اپنا بیگ اٹھاتے جامعہ کالج کے پرنسپل ضیاء الحسن صاحب فارقی کے کمرے میں پہونچ جاتے اُس زمانے میں ضیاء الحسن صاحب کے مقربین خاص میں، انور کے علاوہ قاضی محمد احمد، مجیب رضوی، نذیر الدین مینائی، رحمت علی اور مشیر الحق کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یکے بعد دیگرے یہ تمام لوگ ضیاء صاحب کے کمرے میں جمع ہوجاتے اور کالج کی ترقی اور ناموری میں اضافہ کے موضوع پر بہت کم بات ہوتی زیادہ تر ادارہ کی سیاست زیر بحث رہتی اُس زمانے میں فیکلٹیز نہیں بنی تھیں کالجز کے مجموعے کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ تھا۔ جامعہ کالج تو تھا ہی اس کے علاوہ استادوں کا مدرسہ (Teacher's Trainig

(School) دیہاتی ادارہ (Rural Institute) اور ابتدائی وثانوی مدرسے بھی
ایک اکائی بن کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تشکیل کرتے۔ ان میں سے ہر ادارے کا
سربراہ ایک دوسرے کی کاٹ میں رہتا اور کچھ ایسا کرنے کی تگ ودو کرتا کہ وائس
چانسلر کی خوشنودی اسی کو حاصل رہے تاکہ وہ اپنے ''زیرنگیں ملک'' کے لئے زیادہ
سے زیادہ مراعات حاصل کرلے۔ اس کے لئے جس حد تک لوگ کر سکتے تھے
کرتے اور اخلاقیات کو شیءِ نا مطلوب گردانتے۔ ضیاء صاحب کو مشورہ دینے
والوں میں انور پیش پیش رہتے یہ بات ضرور تھی کہ وہ ''سیاست بازی'' کے
باوجود اپنا مطالعہ جاری رکھتے۔ ضیاء صاحب کے مقربین میں مجیب رضوی
صاحب اور نذیرالدین مینائی صاحب غیر معمولی ذہین اور اپنے اپنے موضوعات
کے صاحب نظر افراد میں سے تھے۔ افسوس ہے کہ ان دونوں حضرات نے اپنی
صلاحیتوں سے وہ کام نہ لیا جو لے سکتے تھے۔ مینائی صاحب کی غالباً کوئی کتاب
شائع نہیں ہوئی ہے مجیب رضوی صاحب کی حال ہی میں ایک کتاب شائع ہو کر
منظر عام پر آچکی ہے اسکو دیکھ کر معاً ذوق کا یہ مصرع یاد آتا ہے: ''عید ہوئی ذوق
پر شام کو''۔ تقریباً دو بجے دن تک انور ضیاء صاحب کے پاس بیٹھے رہتے۔ گپ
شپ کے ساتھ ساتھ جامعہ کے مسائل بھی زیر بحث رہتے۔ فیکلٹی بننے کے بعد
مشیر الحق صاحب بھی ضیاء صاحب کے مقربین میں شامل ہو گئے تھے مگر ضیاء
صاحب اب پرنسپل نہیں پروفیسر بن گئے تھے پھر بھی مسعود حسین خاں صاحب
کے خلاف جو مہم چل رہی تھی اس میں مشیر صاحب، ضیاء الحسن صاحب کے گلے
گلے ساتھ تھے پھر یہ قربت اتنی بڑھی کہ ضیاء صاحب مشیر صاحب کی بیٹی کو اپنی بہو
بنا کر لے آئے۔ دو بجے کے بعد انور اپنا بیگ سنبھالتے اور گھر کی طرف رواں
دواں ہو جاتے پھر بیشتر مغرب کے وقت تک گھر پر ہی رہتے۔ گھر آنے کے بعد
ان کی مصروفیات پر گزشتہ سطور میں چند جملے لکھ چکا ہوں اس لئے اس سے صرف

نظر کرتا ہوں۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کے دور وائس چانسلری کے تقریباً ساڑھے تین سال ہنگاموں کی نذر ہوئے۔ ان ہنگاموں کے پس منظر اور جامعہ برادری پر اس کے اثرات کے بارے میں خود مسعود حسین خاں صاحب نے اپنی خود نوشت ''ورودِ مسعود'' میں اپنا نقطۂ نظر پیش کر دیا ہے، میں نے بھی مسعود صاحب کی زندگی ہی میں اُن پر جو مضمون لکھا تھا اس میں اپنے مشاہدات وخیالات قدرے تفصیل سے قلم بند کر دیئے ہیں اب جب کہ نہ انور ہیں نہ ضیاء صاحب اور نہ ہی مسعود صاحب، مزید برآں اس دور کو دیکھنے والے اکثر افراد بھی باقی نہیں رہے ہیں اس لئے ایک جملے میں اپنی بات ختم کر کے انور کی شاموں کی مصروفیات کی طرف آجاؤں گا۔ میرے نزدیک ضیاء صاحب اور مسعود صاحب کی شخصیات کا بنیادی فرق یہ تھا کہ ضیاء صاحب نے اپنی تربیت اس طرح کی تھی کہ ان کے چہرے سے غم کے موقع پر غم کا اظہار ہوتا اور نہ ہی خوشی کے موقع پر خوشی کا۔ اس کے برعکس مسعود صاحب نے اپنی تمام قبائلی خصوصیات برقرار رکھی تھیں۔ اور بے محابا ان کا اظہار کرتے ان کا چہرہ بھی ان کی دلی کیفیات کا غماز ہوتا۔

مغرب کے بعد وہ بن سنور کر پان کی ڈبیہ اور بٹوا لئے نمودار ہوتے اور سیدھے اسٹاف کلب آجاتے جہاں ان کے بیشتر ہم خیال آچکے ہوتے۔ میں بھی وہاں روزانہ جانے کا عادی ہو چکا تھا۔ مسعود صاحب کی مخالفت شروع ہو چکی تھی اور ان کے خلاف مہم ایک تحریک کی شکل لیتی جا رہی تھی۔ بات میں بات نکل آئی تو یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس تحریک کے روح رواں شعبۂ فزکس کے لکچرر سید شمس الحسن مرحوم تھے جنہوں نے یک طرفہ عشق کے جنون میں نماز عشاء پڑھنے کے بعد اپنے کمرے میں رسّی سے لٹک کر خودکشی کر لی تھی جس لڑکی کے عشق میں

دیوانے ہوئے تھے اس نے شمس الحسن کو بارہا سمجھایا کہ اس کی مرضی بلکہ فرمائش سے اس کی منگنی کر دی گئی ہے مگر شمس الحسن کا جنون قابو میں نہ آیا اور وہ انتہائی اقدام کے مرتکب ہو کر ہی رہے۔ مرنے والے کے ساتھ کوئی مر نہیں جاتا دو چار دن کے ماتم کے بعد اہل جامعہ ان کو بھولنے لگے اب تو شاید ہی کسی کو اس ''جنونی'' کا نام یاد ہو۔

انور کے اسٹاف کلب پہونچتے ہی سارے احباب ان کو گھیر کر بیٹھ جاتے کھیل ویل تو کم ہی ہوتا جامعہ ملیہ کی سیاست پر بحث مباحثہ ہونے لگتا۔ ان کی گل افشانی گفتار شروع ہو جاتی۔ وہ دن بھر دوسروں سے جو کچھ سنتے اسی کو اپنی دریافت کی طور پر بتانا شروع کر دیتے کوئی منچلا ان کو ضیق کرنے کے لئے یہ کہہ کر ٹوک دیتا کہ یہ تو کل کی بات ہے اور فلاں صاحب کی زبانی سنی گئی ہے تو انور ہار نہ مانتے اور اپنی بات کی تاویل کرتے اسی ہنگامۂ دار و گیر میں پرنسپل جامعہ کالج ضیاء الحسن صاحب فاروقی نے استعفاء دے دیا۔ اس کی منظوری کی اطلاع تو نہ آئی مگر ضیاء صاحب کے ہم نواؤں میں کھلبلی مچ گئی اور اساتذہ نے اپنی بانہوں پر کالی پٹیاں باندھ لیں اور ضیاء صاحب پر زور پڑنے لگا کہ وہ اپنا استعفاء واپس لیں۔ ضیاء صاحب نے لوگوں کے دباؤ میں آ کر وائس چانسلر پروفیسر مسعود حسین خاں کو اپنا استعفاء واپس لینے کا خط لکھا۔ مسعود صاحب کی ''پٹھنولی'' ابل پڑی انہوں نے اس خط کے جواب میں لکھا کہ چونکہ استعفاء مجلس انتظامیہ (E.C.) کے چیرمین کے نام تھا اس کا جو فیصلہ ہوگا مجلس انتظامیہ میں ہوگا۔ اس سے ہمدردان ضیاء الحسن میں اور آگ لگ گئی۔ جامعہ کے معمر ترین پروفیسر، پروفیسر اظہر انصاری صاحب نے تو حد ہی کر دی وہ اس دن تک کالی پٹی باندھے گھومتے رہے جب تک مجلس انتظامیہ نے ضیاء صاحب کا استعفاء نامنظور نہیں کر دیا اور

ضیاء صاحب نے اپنے عہدے کا چارج نہیں لے لیا۔ عہدے پر بحالی کی خبر سن کر اظہر انصاری صاحب اپنی سالخوردہ سائیکل سے خراماں خراماں تشریف لائے ضیاء صاحب کے سامنے اپنی کالی پٹی کھولی اور ضیاء صاحب کی گود میں ڈال دی (اس وقت ہم سب غالب کے مجسمے کے پاس زمین پر ضیاء صاحب کو گھیرے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے) انور صدیقی اس پورے ہنگامے میں نہ صرف فعال رہے بلکہ ایک ''لیڈر'' کا بھی کام کرتے رہے انہی غیر تعلیمی دلچسپیوں میں وہ اپنا خاصہ وقت برباد کر کے اپنی سیمابیت کو تسکین دیتے رہے۔ سوچتا ہوں اس بھاگ دوڑ کی دنیا میں میری طول کلامی کا متحمل کون ہوگا؟ اس لئے اب ان کی شاعری، نثر نگاری اور ان کے زندگی کے آخری ایام کے بارے میں جو کچھ مجھ کو معلوم ہے قلم بند کر کے خاموش ہو جاؤں گا۔

انور ایک خوشگو شاعر تھے اگر وہ اپنی شاعری کے ساتھ سنجیدگی برتتے اور بذلہ سنجی کے بجائے اپنا وقت اپنے اشعار کو مزید بنانے سنوارنے اور محفوظ رکھنے میں لگاتے تو آج بھی لوگ ان کے اشعار پڑھتے، حظ اٹھاتے اور گنگناتے۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ قدرت جس کو غیر معمولی ذہانت دیتی ہے وہ اپنی ہی آگ میں جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک انور کی شاعری کا دورِ زرّین ۱۹۵۷، ۵۸ء سے شروع ہو کر ملازمت پا کر دلی آنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب وہ معیار میرٹھ، نئی نسلیں لکھنؤ اور پاکستان کے چند رسائل میں تواتر سے لکھ رہے تھے اگر کوئی چاہے تو مذکورہ رسالوں کے دس برسوں کی فائلوں کی ورق گردانی کر کے ایک اوسط درجے کے حجم کا دیوان مرتب کر سکتا ہے۔ خدا بھلا کرے ملک زادہ منظور احمد صاحب کا کہ انہوں نے اپنی خودنوشت ''رقص شرر'' میں انور کے متعدد اشعار نقل کر کے ان کو ضائع ہونے سے بچا لیا ہے میں نے بھی

"نئی نسلیں" سے کچھ اشعار جمع کئے ہیں اپنے اور ملک زادہ صاحب کے جمع کئے ہوئے اشعار کا ایک انتخاب ذیل میں نقل کرتا ہوں:

سوز یقیں کے بغیر خاتم بے نگیں ہے فن — دست ہنروراں میں ہے معجزۂ ہنر تو کیا

ظلمت غم کے گرانبار سلاسل ہیں وہی — یوں تو تاروں کو بجھے رات ڈھلے دیر ہوئی

ہم آج کا کل گیتی سنوارنے کے لئے — کسی کی زلف شکن در شکن سے گزرے ہیں

رات دم توڑ چکی ظلمت غم باقی ہے — جانے تنویر سحر آج کہاں ٹھہری ہے

دامن گل کے رنگ شفق کے نقشِ حنا کے چرچے ہیں — محفل محفل یار کے اپنے رنگ قبا کے چرچے ہیں

دریوزۂ بہار کی مانند ہر ایک شاخ — پھیلی ہوئی ہے دست طلب گار کی طرح

میخانے کے اندر حشر کوئی ایجاد کرو تو بہتر ہے — اے تشنہ لبو اے کم سخنو فریاد کرو تو بہتر ہے

کوے محبت کی سوجھی ہے دل بھی عجب دیوانہ ہے — راہ کٹھن ہے کوس کڑے ہیں منزل منزل جاتا ہے

بادہ وساغر، حسین وسیمگوں راتوں کے خواب — زندگی کن کن فریبوں سے نہ بہلائی گئی

جلنے کو شمع جل نہ سکی رات بھر مگر — وجہ فروغ دیدۂ امکاں ہوئی تو ہے

ہاں ایک نظر ہم پر بھی کبھی شمشاد قد و سیمیں بدنو — اب بار کرم اٹھتا ہی نہیں بیداد کرو تو بہتر ہے

کیا خاک کوئی آکر بیٹھے لذت بھی نہیں راحت بھی نہیں — اب ایسے نشیمن کو یارو برباد کرو تو بہتر ہے

اب فیصلہ کیا تمکنت حسن ہے تیرا — ہر مرحلۂ غم سے تو دیوانے گزر آئے

اس دور کے مارے ہوئے ہم بے ہنراں کو — اب زندگی کرنے کو کہاں سے ہنر آئے

یہ تمکنتِ قیصر و جم کچھ بھی نہیں ہے — ہم پر اثر تیغ ستم کچھ بھی نہیں ہے

ہم زہر کو نوشینہ بنا سکتے ہیں انور — اپنے لئے یہ ساغر سم کچھ بھی نہیں ہے

ہر موج صبا پاؤں کی زنجیر ہے لیکن — ہم رقص غزالانِ ختن دیکھ رہے ہیں

سازش اہل چمن دام و قفس ہیں لیکن — موجۂ گل جو اڑی ہے تو کہاں ٹھہری ہے

ں:

دست ہنرورں میں ہے معجزۂ ہنر تو کیا — سوزِ یقیں کے بغیر خاتم بے نگیں ہے فن
یوں تو تاروں کو بجھے رات ڈھلے دیر ہوئی — ظلمتِ غم کے گرانبار سلاسل ہیں وہی

دہلی میں وہ کبھی کبھار شعر لکھتے مگر بجائے اس کے کہ کہیں شائع کروائیں آل انڈیا ریڈیو کے ''شکم گرسنہ'' میں جھونک آتے اور اسی میں خوش رہتے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ انگریزی سے وابستہ ہونے کے بعد شعر گوئی کی طرف سے جیسے ان کی توجہ ہٹ سی گئی تھی۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے پروفیسر محمد مجیب کی وائس چانسلری کی تقریباً آخری زمانے میں وہ جامعہ ملیہ آ گئے تھے اور انہوں نے مجیب صاحب کے چند مضامین کا رسالہ جامعہ کے لئے ترجمہ بھی کیا تھا۔ اب ضرورتاً وہ نثر نگاری کی طرف توجہ دینے لگے تھے اور شاعری کی جگہ شکار کی رغبت نے لینی شروع کر دی تھی۔ شکار ان کی شکم پروری کے لئے نہ تھا صرف تفریح طبع کا ایک ذریعہ تھا۔ شمیم حنفی نے اپنے تعزیتی مضمون مطبوعہ رسالہ جامعہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۵ء میں لکھا ہے:

''جامعہ میں انگریزی کی ریڈرشپ کے امیدوار انور صاحب بھی تھے لیکن انٹرویو کے وقت (اوکھلا) نہر پر مچھلی کے شکار میں گم تھے۔ کھینچ کھانچ کر لائے گئے۔ بے بس سا ایک قہقہہ لگایا اور منتخب کر لئے گئے (ص:٦)

خدا جانے جب وہ پروفیسر منتخب کئے گئے تو کس عالم میں پائے گئے تھے۔

انور کی نثر نگاری صاف ستھری، واضح اور زبان کی تمام طرفہ کاریوں سے عبارت تھی۔ وہ جس موضوع پر بھی لکھتے اس کے محرم راز بن کر لکھتے۔ ان کی نثر نگاری کی خوبیوں کو سمجھنے کے لئے ان کے استاد مشہور نقاد پروفیسر اسلوب احمد صاحب انصاری کے ان جملوں کو پڑھ لینا کافی ہے جو موصوف نے انور کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''شناس و شناخت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھے ہیں:

''انور صدیقی ذہین قاری اور نقاد ہیں اور انگریزی اور اردو ادب سے ان کی واقفیت اور شناسائی رمز آشنایانہ ہے ان کے یہاں ایک طرح کی مضطرب اور مرتعش آگہی اور نوکیلا پن یعنی Pointness پائی جاتی ہے۔ وہ مکتبی قسم کے نقاد نہیں ہیں۔ وہ اطلاع عامہ اور اعداد وشمار کی کھتونی تیار نہیں کرتے بلکہ اپنے علم وایقان کی روشنی میں ادبی، فنی کارنامے کی روح تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اردو نثر کی تشکیل کے سلسلے میں انہوں نے مثالی نثر کی خوبیوں اور اس کی ماہیت پر بہت سلامت روی کے ساتھ بحث کی ہے اور بہت سے ان مفروضات کو استدلال کے ساتھ رد کیا ہے جو غلط مبحث پیدا کرتے رہے ہیں۔ نثر کا ارتقاء ایک تہذیبی عمل ہے اور اچھی نثر جذبے پر نہیں بلکہ فراست پر انحصار رکھتی ہے ہمارے یہاں اس کا تصور مغالطہ انگیز رہا ہے اور خطابت اور لفاظی کو بھی اچھی نثر کی خوبیاں مان لیا گیا ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے.........''

(ص:۳۶۱)

اپنے تعزیتی اداریے میں شمیم حنفی نے انور کے آخری ایام کے بارے میں لکھا ہے:

''انور صاحب کی زندگی کے کچھ آخری برس بیماری اور بے بس کر دینے والی ناتوانی کے ساتھ گزرے۔ طرح طرح کے وہموں نے انہیں گھیر لیا تھا رفتہ رفتہ اعصاب پر اور قوت

گویائی پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی خالی خالی آنکھوں سے
ملنے والوں کو ایک ٹک یوں دیکھتے رہتے تھے جیسے اپنے آپ
کو ڈھونڈ رہے ہوں اور اپنا پتہ نشان پوچھ رہے ہوں حالات
کا بوجھ اس حد تک بڑھا کہ جامعہ اور دلی سے کنارہ کش ہوکر
الہ آباد جا بسے بالآخر اسی شہر میں جان جاں آفریں کے سپرد
کردی'' (ص ۸)

میں نے ۱۹۸۰ء کے اواخر میں جامعہ کو خیر باد کہا مگر بار بار دلی جاتا اور انور سے ملتا رہا میرا اپنا مشاہدہ یہ ہے کہ اسی زمانے سے انور وہم کا شکار ہونے لگے تھے۔ کبھی ان کو شبہ ہو جاتا کہ بہت زیادہ تمبا کو کھانے کی وجہ سے ان کو کھانے کی نالی میں کینسر ہو گیا ہے کبھی فمِ معدہ پر آماس کا احساس ہوتا اسی زمانے سے ان میں ایک ایسی چیز پیدا ہونی شروع ہو گئی تھی جو اس سے پہلے ان میں کبھی بھی نہ تھی۔ وہ بھابھی اور بچوں کو پریشان کرنے کے لئے کوئی ایسی بات کہہ دیتے کہ گھر کے سب لوگ رونے لگتے پتہ نہیں میرے جامعہ چھوڑنے کے بعد اس میں کمی آئی تھی یا نہیں۔ میں اپنی ملازمت سے ۱۹۹۶ء کے اواخر میں سبکدوش ہوا تھا پتہ نہیں اس کے بعد انور کا کیا حال رہا۔ اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ ان کے اعصاب نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا میں نے خود تو نہیں دیکھا مگر قابل اعتبار ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ ان کے الہ آباد جانے سے پہلے ہی ان کے خون میں شکر اتنی بڑھ گئی تھی کہ چینوٹیاں ان کے بستر پر آنے لگی تھیں۔ اسی زمانے میں جو خانگی دھکا ان کو لگا وہ ان کے مکان کا فروخت ہونا تھا۔ مکان فروخت ہونے کے بعد وہ کچھ دنوں غالباً دہلی کی گنجان آبادی والے محلے ذاکر نگر میں ٹھہرے پھر اپنے چھو۔ نے بیٹے نوید کے ساتھ الہ آباد چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

شمیم حنفی صاحب نے اپنے تعزیتی مضمون میں انور کے انتقال کی نہ تو تاریخ لکھی ہے اور نہ ہی سنہ اگر یہ بھی لکھ دیتے تو بہتر تھا۔ ان کے ایک جملے سے انور کے انتقال کا سنہ تو نکالا جا سکتا ہے۔ تاریخ نہیں ان کا جملہ ہے ''انور صاحب کے انتقال سے کچھ پہلے ہمارے لئے ذاتی سطح پر ایک اور ذاتی صدمے کا سبب مشفق خواجہ کی موت تھی'' (ص ۸) مشفق خواجہ کا انتقال ۲۱/۲/۲۰۰۵ء میں ہوا تھا انور کا انتقال بھی اسی سال ہوا ہوگا۔

گزشتہ بیس برسوں میں رسالہ جامعہ نے بہت اچھے اچھے خاص نمبر نکالے ہیں چند کو چھوڑ کر یہ تمام نمبر ان اصحاب کے لئے وقف ہیں جن کا کبھی بھی جامعہ سے کوئی تعلق نہیں تھا کیا اچھا ہوگا اگر رسالہ جامعہ اپنے وابستگان کو بھی یاد رکھے اور ان پر اگر نمبر نہیں تو ''گوشے'' ہی شائع کر دے تا کہ کل کے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طالب علم یہ جان سکیں کہ ان کی مادر علمی سے کیسے کیسے اصحاب فکر و نظر اور ادیب و مفکر وابستہ رہے ہیں۔ مرنے والے مر جاتے ہیں ان پر نمبر یا گوشہ نکلے یا نہ نکلے وہ اس سے بے نیاز ہو جاتے ہیں یہ تو زندوں کا فرض ہے کہ جانے والوں کو اس طرح یاد رکھیں کہ بعد کے آنے والے بھی ان سے محرمانہ طور سے واقف رہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیا رسالہ جامعہ کی نظر میں انور ایک ''گوشے'' کے بھی حقدار نہیں ہیں؟

☆☆☆

”ماذا خسر العالم“: کا مطالعہ کلام اقبال کی روشنی میں

ڈاکٹر نذیر احمد عبدالمجید☆

انیسویں صدی عیسوی میں، جب مشرق سے مغرب اور عرب سے عجم تک سارا عالم اسلام پے در پے شکستوں سے دوچار تھا اور مغربی استعمار کے مقابلہ میں اپنے آخری معرکے بھی ہارتا جارہا تھا، اردو شاعری میں اسلام اور مسلمانوں کے عہد عروج و اقبال کا مرثیہ لکھا گیا۔ اس مرثیہ کا نام تھا ”مسدس مدوجزر اسلام“ (۱۸۸۵ء)۔ حالی کے بعد اقبال کی دو مسدس نظموں ”شکوہ“ (۱۹۱۰ء) اور ”جواب شکوہ“ (۱۹۱۳ء) نے اردو کی اس ادبی روایت کو مزید ترقی دی۔ حالی اور اقبال کی ان نظموں میں تاریخ عالم کی ایک خاص تعبیر کی گئی تھی۔ ایک خاص نقطۂ نظر سے جسے ہم اسلامی کہہ سکتے ہیں، اسے دیکھا اور دکھایا گیا تھا (اس کی کچھ تفصیل آگے آرہی ہے)۔ راقم الحروف کے نزدیک مولانا سید ابو الحسن علی ندوی (۱۹۱۲ء۔۱۹۹۹ء) کی کتاب ”ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین“ (۱۹۵۰ء) بھی، جس کا لفظی ترجمہ ہے: مسلمانوں کے زوال سے دنیا نے کیا کھویا، اپنے مضمون کے لحاظ سے برصغیر کے مسلمانوں کی اسی ادبی روایت کا حصہ ہے جو نظم سے ترقی کر کے نثر تک (اور اردو سے عربی تک) پہنچی ہے۔

حالی کی مسدس، انیس و دبیر کے مسدس مرثیوں کی طرح کوئی روایتی مرثیہ نہیں تھی۔ بلکہ اس کا ایک دنیاوی مقصد تھا۔ حالی نے اپنی مسدس، بقول خود ”قوم کو بیدار کرنے اور انہیں غیرت و شرم دلانے کے لئے لکھی تھی کہ مسلمان

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سوچیں کہ وہ کیا تھے اور کیا ہو کر رہ گئے''۔ مقدمہ مسدس میں ایک جگہ حالی رقم طراز ہیں ''قوم کے ایک سچے خیر خواہ (یعنی سرسید) مسدس کے جو اپنی قوم کے سوا تمام ملک میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے اور جس طرح خود اپنے پرزور ہاتھ اور قوی بازو سے بھائیوں کی خدمت کر رہا ہے، اسی طرح ہر اپاہج اور نکمے کو اسی کام میں لگانا چاہتا ہے۔ آ کر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرتا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے۔ (چنانچہ میں نے یہ مسدس لکھی)۔ اسی مقدمہ میں ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:
''اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اول عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا۔ پھر آفتابِ اسلام کا طلوع ہونا اور نبی امی کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعتاً سرسبز و شاداب ہو جانا اور اس ابر رحمت کا امت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی اور دنیاوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد تنزل کا حال لکھا ہے۔ اور قوم کے لئے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آ کر وہ اپنے خط وخال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے''۔[۱]

نبوت کے ابر رحمت کے بیان میں حالی کہتے ہیں:

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

مسلمانوں کی ترقیات اور تہذیب وتمدن پر ان کے ''اثرات واحسانات'' کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے

حالی ہی کی طرح اقبال کی مسدس ''شکوہ'' کا مقصد بھی قوم میں ''ولولۂ تازہ'' پیدا کرنا تھا۔ نظم کے آخر میں چھ، سات بندوں میں یہ مقصد بیان ہوا ہے۔ ایک شعر ہے:

چاک اس بلبل تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اسی بانگ درا سے دل ہوں

اقبال کی دوسری مسدس ''جواب شکوہ'' از اول تا آخر گویا ان کے اسی ''اصلاحی مشن'' کا اعلان کر رہی ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کا بھی حالی و اقبال ہی کی طرح کا ایک مقصد نیک ہے۔ مولانا فرماتے ہیں: ''خیال تھا کہ اجمالی طور پر ان نقصانات کی نشاندہی کی جائے جو انسانیت کو مسلمانوں کے تنزل سے پہونچے تاکہ مسلمانوں (میں) اصلاح حال کا جذبہ پیدا ہو''[۲]

اقبال اور حالی کے ساتھ اس اشتراک مقصد کے علاوہ، ''بعثت محمدیؐ'' سے پہلے، ''بعثت محمدیؐ'' کے بعد، ''مسلمانوں کا دور قیادت'' اور مسلمانوں کا تنزل' کے عنوان سے مولانا ندوی کی عربی کتاب (یا اس کے اردو ترجمہ) کے ابتدائی ابواب کا 'Pattern' وہی ہے جو حالی کی مسدس ''مدوجزر اسلام'' کا ہے۔ البتہ حالی کی طرح مولانا ندوی نے اپنی کتاب میں 'مسلمانوں کا دنیاوی ترقیات میں بھی تمام عالم پر سبقت لے جانا' بیان نہیں کیا ہے۔ اس معاملہ میں وہ اقبال کے ہم مشرب ہیں جنھوں نے ''شکوہ'' میں اور اپنی اکثر نظموں میں اپنا زور قلم مسلمانوں کے معنوی (دینی و اخلاقی) کمالات کے بیان میں صرف کیا ہے[۳]

''ماذا خسر العالم ـــــ ''تاریخ عالم کی 'اسلامی تعبیر' کی ایک کاوش ہے۔ اس سیاق میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کلام اقبال کو تاریخی تناظر

میں (یا تاریخ عالم کو 'اقبالیاتی تناظر' میں) دیکھنے کی جو شعوری کوشش اور شدید خواہش ہمیں مولانا ندوی کے ہاں ملتی ہے، کم ہی کسی کے ہاں اس کی نظیر مل سکے گی۔ مولانا ندوی جو تقریر و تحریر میں اکثر اپنے لئے 'تاریخ کے ایک طالب علم' کے الفاظ استعمال کرتے رہے ہین، اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

''تاریخ کے ایک سچے طالب علم اور انسانی تمدن و معاشرہ کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی خواہش رکھنے والے انسان کو (کلام اقبال سے) کیا رہنمائی حاصل ہوتی ہے، اس نقطۂ نظر سے (اس) کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ بات ایک قیمتی انکشاف سے کم نہیں ہوگی کہ اقبال کے کلام میں بعض ایسے دقیق اور لطیف تاریخی اشارے آگئے ہیں جن......کو اگر شرح و بسط کے ساتھ نثر کے صدہا صفحات میں تاریخی دلائل و شواہد......اور کتابوں کے حوالوں کی مدد سے پیش کیا جائے تو وہ اس قدر مؤثر اور دلنشیں نہیں ہو سکتے......انہوں نے اپنے بعض قطعوں، مختصر نظموں اور بعض اوقات ایک شعر میں تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے''۔[۴]

کلام اقبال کو تاریخ عالم کے تناظر میں دیکھنے کا مولانا ندوی کا یہ ذوق کیسا راسخ ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات وہ ایسے اشعار کی تشریح بھی تاریخی حوالوں کے ساتھ کرتے ہیں جن میں کوئی تاریخی تلمیح بظاہر موجود نہیں ہوتی۔ اقبال کا ایک مشہور شعر ہے:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

بعض قارئین کو حیرت ہو سکتی ہے، لیکن مولانا کا ذہن اس شعر سے ''تاریخ عالم کے صفحات'' کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ فرماتے ہیں: ''اقبال

اس قول پر تاریخ عالم کے صفحات شاہد ہیں...... سعد بن ابی وقاص ......اور طارق بن زیاد (وغیرہ) کے زندۂ جاوید کارنامے تاریخ عالم کے مطلع پر ہمیشہ روشن رہیں گے''۔[۵]

اسی طرح اقبال کے یہ دو شعر دیکھئے:

دنیا کی عشاء ہو جس سے اشراق — مومن کی اذاں ندائے آفاق

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود — ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

مولانا ان کی تشریح میں کہتے ہیں: ''علامہ اقبال نے جب تاریخ عالم پر نگاہ ڈالی تو انہیں نظر آیا کہ صالح انقلاب مرد مومن کا مرہون منت رہا ہے۔ زندگی کی تاریک راتوں کے لئے وہ گویا صبح صادق کا مؤذن ہے...... یہ وہی اذاں ہے جو آج سے تیرہ سو برس پہلے فاران کی چوٹیوں سے بلند ہوئی......اور آج بھی اس میں انسانیت کو جگانے اور ضمیر انسانی کو زندہ کرنے کی وہی قوت موجود ہے...... جس سے ایک عالم نو انگڑائی لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا''۔[۶]

واضح رہے کہ یہ مثالیں اس مقالہ سے ماخوذ ہیں جو نوجوان مولانا ندوی نے اپنی کتاب ''ماذا خسر العالم —'' کی پہلی اشاعت کے محض ایک سال بعد ۱۹۵۱ء میں مصر کے جامعہ فؤاد الاول (موجودہ قاہرہ یونیورسٹی) میں پڑھا تھا۔[۷] موقع کی مناسبت سے یہاں ایک مثال ایسی پیش کی جاتی ہے جس میں مولانا نے اقبال کی ایک مختصر نظم (دین وسیاست) کی تفصیلی تشریح کے لئے خود اپنی اسی کتاب ''ماذا خسر العالم'' کا حوالہ دے دیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''اس تمہید کے بعد (مولانا کی یہ تمہید چار صفحات پر مشتمل ہے) آپ اقبال کی یہ نظم پڑھئے۔ کس طرح انہوں نے عیسائیت اور اسلام، قرون وسطیٰ (اور) عصر حاضر اور مسیحی واسلامی تعلیمات کے دریا کو کوزہ میں بند کردیا ہے۔ (حاشیہ میں فرماتے

ہیں) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوڈیبر کی کتاب "مذہب وسائنس" یا مصنف کی کتاب ("ماذا خسر العالم —" کا اردو ترجمہ) "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" ص ۲۵۹۔۲۵۲[۸]

مولانا ندوی نے اپنے اسی مخصوص ذوق کے ساتھ کلام اقبال کا مطالعہ کیا ہے۔ اور اسی کے ساتھ اس کی تعبیر وتشریح اور تبلیغ کا کام بھی بڑے استقلال سے انجام دیتے رہے ہیں۔ جس کا اندازہ ان کے تصنیفی کیریر پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ کی ان کی اہم کتابوں میں "روائع اقبال" (اردو میں "نقوش اقبال") کے علاوہ، وہ "اِسمعیات" بھی ہیں جن میں اقوام عرب وایران سے خطاب کیا گیا ہے۔ مولانا کی اصل عربی تصانیف کے چند اردو عناوین ملاحظہ ہوں:

عرب قوم پرستی اسلامی نقطۂ نظر سے خطرناک کیوں؟

عالم عربی کے لئے سب سے بڑا خطرہ

عالم عربی کا المیہ

مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش

امت مسلمہ کا فرض منصبی اور اس کے انقلابی اثرات

انسانیت کی رہنمائی میں اسلام کا عظیم کردار

تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات ۔۔۔ وغیرہ

یہ فہرست جس میں اضافہ ممکن ہے، مولانا کے اپنے ایک قول کی گویا توضیح ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ جب وہ بڑے ہوئے تو انہوں نے اقبال کو اپنا موضوع بنایا (عنیت به کبیراً)۔

"ماذا خسر العالم —" (اردو میں "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے

عروج وزوال کا اثر'') راقم الحروف کے نزدیک اس سلسلہ کی پہلی تصنیف ہے۔
مولانا کی اس شاہکار عربی تصنیف پر فکر اقبال کے اثرات اتنے ہمہ گیر ہیں کہ
اسے شرح وتعبیر اقبال کی ایک سعیٔ بلیغ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

یہ کتاب جو پہلی مرتبہ ۱۹۵۰ء میں مصر سے شائع ہوئی، مولانا کی پہلی
عربی تصنیف ہے۔ اور اس حقیقت کے علی الرغم کہ یہ نوعمری کی کاوش ہے (مولانا
کی عمر اس کتاب کی اشاعت کے وقت ۳۲۔۳۱ سال تھی)، عالم عربی میں یہ ان
کی سب سے اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ خود بقول مولانا ان کی نشوونما ایسے
عہد میں ہوئی کہ جب اقبال کا فن شہرت کے بامِ عروج پر تھا۔ مولانا فرماتے
ہیں: ''اقبال کا اپنے عہد پر جو اثر تھا اس کی مثال کسی زمانے کے شاعر وادیب
میں نہیں ملتی۔ (چنانچہ) میں نے انہیں اپنے بچپن میں پسند کیا اور سن تمیز کو پہنچ کر
ان کو اپنا موضوع بنایا''[9]

اقبال کے فکروفن سے مولانا ندوی کے اس نہایت متأثر کی کیا وجہ تھی جو
بالآخر ان کے ''موضوع'' بننے کا باعث ہوئی؟ ''نقوش اقبال'' کے مقدمہ میں
مولانا فرماتے ہیں: ''سب سے بڑی چیز جو مجھے اقبال کے فن کی طرف لے گئی وہ
بلند حوصلگی......اور ایمان ہے...... میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے
اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیائے اسلام کی دعوت دیتا
اور تسخیر کائنات اور تعمیر انفس وآفاق کے لئے ابھارتا ہے۔ (دوسری بات یہ ہے
کہ اقبال) مغربی علوم کے بڑے سے بڑے مرکزوں میں تعلیم حاصل کرتا ہے مگر
......محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت، ان کی امت کی صلاحیت اور اس کے مستقبل
پر (اس کا) اعتماد بڑھتا ہی جاتا ہے...... (علامہ اقبال) اسلام کی عظمت رفتہ اور

مسلمانوں کے اقبال گزشتہ کے لئے سب سے زیادہ فکر مند، تنگ نظر قومیت ووطنیت کے سب سے بڑے مخالف، مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں''۔[10]

ان چند اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کے فکری عناصر جن سے مولانا ندوی متأثر ہیں، درج ذیل ہیں:

(الف) دعوتِ بلند حوصلگی اور امتِ اسلامیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صلاحیت اور اس کے مستقبل پر مکمل اعتماد

(ب) احیائے اسلام اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بازیافت کے لئے فکر مندی

(ج) وطنیت (قومیت) کی مخالفت

(د) مغرب کی مادی تہذیب سے اعلان بغاوت

فکر اقبال کے ان عناصر سے نوجوانی مولانا ندوی کی تأثر پذیری کا ان کی اولین عربی تصنیف ''ماذا خسر العالم۔۔'' پر کیا اثر پڑا ہے؟ آیئے دیکھیں۔

جہاں تک امت مسلمہ کی صلاحیت، اس کے مستقبل پر اعتماد، اس کی عظمت گزشتہ کی بازیافت کے لئے فکر مندی اور احیائے اسلام کے لئے مسلمانوں کو ابھارنے کی بات ہے تو واضح رہے کہ ''ماذا خسر العالم۔۔'' کا مرکزی موضوع یہی ہے۔ کتاب کا مقصد تالیف بیان کرتے ہوئے (اس کے اردو ترجمہ کے مقدمہ میں) مولانا فرماتے ہیں: ''خیال تھا کہ اجمالی طور پر ان نقصانات کی نشاندہی کی جائے جو انسانیت کو مسلمانوں کے تنزل اور دنیا کی قیادت سے (ان کے) کنارہ کش ہو جانے سے پہنچے۔ (تا کہ مسلمانوں کو یہ دکھایا جا سکے کہ قوموں کی صف میں ان کا مقام کیا ہے۔ اسی کے ساتھ دنیا کو اپنی

اس بدقسمتی کا بھی علم ہو جس سے اس کو مسلمانوں کی قیادت سے محروم ہو جانے کی بناء پر دوچار ہونا پڑا۔ اور اس کو محسوس ہو کہ حالات میں کوئی بڑی تبدیلی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ دنیا کی قیادت مادہ پرست اور ناخداترس انسانوں کے ہاتھ سے نکل کر ان خداشناس اور خداترس انسانوں کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے۔۔۔(جن) کے پاس آخری پیغمبر کی شریعت اور دین و دنیا کی رہنمائی کا مکمل دستور موجود ہے"۔[۱۱]

(یہاں قارئین کو کلام اقبال کے متعلقہ حصے بے تکلف یاد آسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار:

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
مکاں فانی، مکیں فانی، ازل تیرا، ابد تیرا — خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشت ملت بیضا سے ہے پیدا — کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا — لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

"ماذا خسر العالم" پر دنیا کی امامت و قیادت کا یہ اقبالیاتی طرز فکر کس قدر حاوی ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ سید قطب جو اس کتاب کے ایک مقدمہ نگار ہیں اور جنہوں نے بقول مولانا ندوی اپنے مقدمہ میں کتاب کی پوری روح کھینچ لی ہے، فرماتے ہیں: "(یہ) کتاب اپنے ناظرین کے دل میں جن احساسات کو ابھارتی ہے اور جن حقائق کو دل میں اتارتی چلی جاتی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم سروری اور جہانبانی کی تعلیم ہے"۔[۱۲]

اس اقبالیاتی طرز فکر کے ابلاغ کے لئے مولانا ندوی نے "ماذا خسر العالم" میں ایک مقام پر مشہور نومسلم عالم اور مصنف علامہ محمد اسد کی مدد بھی لی

ہے۔ محمد اسد، جو اقبال کے ممدوح دانشور علماء میں سے ہیں، فرماتے ہیں:

''اسلامی تعلیمات کی رو سے اخلاق۔فضیلت (Virtue) کا علم انسان سے اخلاقی ذمہ داری کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ بڑی بے غیرتی کی بات ہے کہ انسان نظری طور پر حق و باطل میں امتیاز (تو) کر لے (لیکن) پھر حق کی ترقی اور باطل کے زوال کے لئے جدوجہد نہ کرے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ (آل عمران:۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

یہی بات اسلام کی جارحانہ کارروائی، ابتدائی اسلامی فتوحات اور اسلامی ملوکیت (ملک گیری) کو اخلاقی طور پر حق بجانب ثابت کرتی ہے۔ پس اسلام استعماری (Imperialist) ہے، اگر یہ مفہوم انہی الفاظ سے ادا ہو سکتا ہے''[۱۳]

نظریۂ وطنیت (قومیت) پر تنقید اور مغرب کی مادی تہذیب سے اعلان بغاوت بھی مولانا ندوی کی کتاب ''ماذا خسر العالم'' کی ترکیب کے غالب عناصر ہیں۔ حتیٰ کہ ایک مستشرق کے خیال میں، جس کی رائے مولانا نے کتاب کے اردو ترجمہ کے مقدمہ میں نقل کی ہے، ''اس کتاب میں صرف مغربی تہذیب کی مذمت کی گئی ہے''۔ قوم پرستی اور مادہ پرستی کے حوالے سے کی گئی مغربی تہذیب کی یہ مذمت کتاب کے تقریباً ایک تہائی حصہ پر مشتمل ہے جس میں اقبال کی طرح ہی مغربی تہذیب کی خودکشی کی پیشگوئی، بلکہ خبر بھی درج ہوئی ہے۔[۱۴]

یہ کتاب دو عالمگیر جنگوں (۱۹۱۴۔۱۹۱۸ اور ۱۹۳۹۔۱۹۴۵) کے پس

منظر میں لکھی گئی تھی۔ چنانچہ مولانا نے یورپ میں قوت وعلم اور دین واخلاق کے درمیان عدم توازن، مغربی تہذیب کی زر پرستی، مادہ پرستی اور قوم پرستی اور اس کے نتیجہ میں برپا ہونے والی دو عالمی جنگوں، سائنسی ایجادات اور اکتشافات (ایٹم بم وغیرہ) کی ہلاکت آفرینی، اور نظریۂ ارتقاء کی شکل میں خدا بیزاری وغیرہ کا تفصیلی ذکر ہے اور اس کے بعد مغرب کے عہد عروج واقتدار میں دنیا کے معنوی خسارہ کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا کی پوری بات درج ذیل عناوین کے تحت بیان کی گئی ہے:

مذہبی حس کا فقدان، ذوق خدا طلبی کا عالمگیر فقدان، دنیا طلبی اور مادہ پرستی کا بحران، اخلاقی انحطاط اور دینی امور میں پست ہمتی وتن آسانی پیدا ہو جانا۔ گویا یہ وہ نقصانات ہیں جو مولانا کے خیال میں مسلمانوں کی قیادت سے محروم ہونے کی بناء پر انسانیت کو پہنچے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انسانیت کے ''معنوی خسارہ'' کی یہ تفصیل جو ہمیں مولانا کی اس کتاب میں ملتی ہے وہ بھی، اپنی کیفیت کے اعتبار سے پوری طرح اقبالیاتی ہے۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کی تہذیبی ترقیات کے بیان میں مولانا ندوی اقبال کے ہم مشرب ہیں اور اس باب میں مسلمانوں کے معنوی (دینی واخلاقی) کمالات ہی کو اہمیت دیتے ہیں۔ آیئے اب دیکھیں کہ مولانا کے خیال میں اسلامی قیادت کی وہ کون سی برکات تھیں جن سے دنیا اب محروم ہو گئی تھی۔

اس گفتگو کا خلاصہ اگر ہم مولانا ندوی کے الفاظ مستعار لے کر بیان کریں تو یہ ہے کہ اسلام نے توحید کا راستہ صاف، واضح اور آسان کر دیا تھا، حتیٰ کہ کمزور طبیعتوں کے لئے بھی خالص اللہ کی فرماں برداری آسان ہو گئی تھی اور اس سچی خدا شناسی سے وہ ہمہ گیر اور عالمگیر خدا طلبی پیدا ہوئی جس کی تمدنی برکات

سے دنیا مسلمانوں کے عہد زوال میں بھی فیضیاب ہوتی رہی۔

قدرے وضاحت کے لئے میں ایک متعلقہ مقام سے مولانا کی چند عبارتیں بھی نقل کرتا ہوں جو انہوں نے 'گزشتہ اسلامی قیادت کے اثرات' کے عنوان سے تحریر کی ہیں۔ فرماتے ہیں:

''(اس انقلاب سے) دنیا کی سمت بدل گئی۔ (اس کا رخ) عالمگیر خدا فراموشی وخود فراموشی سے ہمہ گیر خدا پرستی اور خود شناسی کی طرف ہو گیا۔ اس کے دور تمدن میں تجارت وصنعت کے ساتھ ساتھ اخلاق وفضیلت کو بھی عروج ہوا اور فتوحات کی وسعت اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق وروحانیت نے بھی یکساں فروغ پایا۔ دینی رشتہ، مقاصد کے اتحاد اور صلح ومحبت نے دنیا کو جنت کا نمونہ بنا دیا جس میں نہ باہم زور آزمائی تھی نہ رسہ کشی۔ خدا پرستی وپاکیزگی کی راہ جو جاہلیت کی حکومت واقتدار میں کانٹوں سے بھری تھی اور مدت سے سنسان پڑی تھی، (اب) بے خطر شاہراہ بن گئی'' [۱۵]

اب آیئے ایک نظر اقبال کی نظم ''شکوہ'' پر ڈالیں جس میں انسانیت پر اسلام اور مسلمانوں کے اثرات یا احسانات تو نہیں گنائے گئے ہیں، البتہ جو بات مولانا نے اپنی کتاب ''ماذا خسر العالم'' میں اس موضوع سے متعلق کہی ہے، کچھ وہی بات اللہ سے شکوے کے پیرائے میں (کہیں کہیں باقاعدہ اللہ میاں پر 'احسان' رکھتے ہوئے) کہی گئی ہے۔ میں یہاں بالخصوص اس کے دو بند یاد دلانا چاہتا ہوں:

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر — کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر

خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر | مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا | قوت بازوئے مسلم نے کیا کام ترا
بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی، تورانی بھی | اہل چیں چین میں، ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی | اسی دنیا میں یہودی بھی تھے، نصرانی بھی
پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے | بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے

اور آخر میں یہ شعر ملاحظہ ہو:

ہم تو رخصت ہوئے، اوروں نے سنبھالی دنیا
پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

راقم الحروف کی اب تک کی گفتگو سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ مولانا کی کتاب ''ماذا خسر العالم'' فکر اقبال کی شرح وتعبیر سے عبارت ہے۔ اب چند ایک ایسے امور کا ذکر کیا جاتا ہے جن سے یہ خیال مزید مبرہن ہو جاتا ہے۔

''دنیا کے لئے اسلام کی قیادت'' کے عنوان سے جو گفتگو مولانا کی کتاب کے آخر میں کی گئی ہے وہ ضخامت کے لحاظ سے اگرچہ اس مواد سے کچھ مختصر ہے جو کتاب میں اس کے عنوان (یعنی انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) سے متعلق درج ہوا ہے، لیکن کتاب کے دو فاضل مقدمہ نگاروں، سید قطب اور محمد یوسف موسیٰ، کے نزدیک اس کتاب کا مرکزی موضوع (اس کے عنوان سے قطع نظر) یہی ہے۔ یعنی مسلمانوں کو دنیا کی امامت (القیادة العالمیة) کے لئے تیار کرنا اور عظمت رفتہ (مجد الاسلام) کی جستجو[۱۶] 'عالم اسلامی کا پیغام' عنوان کے تحت مولانا ندوی کتاب کے آخری حصہ میں فرماتے ہیں:

''انسانیت کی مشکل کا صرف ایک ہی حل ہے۔ اور وہ یہ ہے

کہ عالم گیر قیادت اور زندگی کی جہازرانی ان مجرم اور انسانیت کے خون سے رنگین ہاتھوں سے نکل کر۔۔۔ان امانت دار، فرض شناس، خداترس اور تجربہ کار ہاتھوں کی طرف منتقل ہو جو انسانیت کی جہازرانی کے لئے روزازل سے بنائے گئے ہیں۔ نتیجہ خیز انقلاب صرف یہ ہے کہ دنیا کی رہنمائی اور انسانیت کی سربراہی جاہلیت کے کیمپ سے جس میں برطانیہ، امریکہ، روس اور ان کی حاشیہ بردار ایشیائی قومیں ہیں، منتقل ہوکر اس امت کے ہاتھ میں آجائے جس کی قیادت انسانیت کے معمار اعظم رحمت عالم محمد رسول اللہ کے ہاتھ میں ہے اور جو اس دنیا کی تعمیر نو۔۔۔۔کے لئے محکم اور واضح اصول و تعلیمات رکھتی ہے''۔[۱]

یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ پوری کتاب میں مولانا ندوی نے اگرچہ صرف دو مقامات پر باقاعدہ اقبال کے حوالہ کے ساتھ گفتگو کی ہے، تاہم یہ دونوں مقامات کتاب کے اس مرکزی موضوع سے براہ راست متعلق ہیں۔ ''دنیا کے لئے اسلام کی قیادت'' کے عنوان سے قائم کردہ اس باب میں ''مسلمان عالم انسانیت کی پناہ گاہ اور مستقبل کی امت ہیں'' ایک ذیلی عنوان ہے جس کے تحت ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کا خلاصہ درج ہوا ہے اور ''نئی قیادت کا دور'' ایک اور عنوان ہے جس کے تحت ''زبور عجم'' کے اشعار کا عربی میں ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ جن میں سے ایک شعر ہے:

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ
معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

(فرنگ کی غارت گری سے تمام عالم کھنڈر ہو چکا ہے۔ اے حرم کے

معمار دنیا کی تعمیر نو کے لئے اٹھ کھڑا ہو)۔[۱۸]

اقبال کے ان دوراست حوالوں کے علاوہ، عالم اسلامی کا انقلاب یا عالم اسلامی کا پیغام اور عالم عربی کی قیادت وغیرہ عنوانات کے تحت جو گفتگو کی گئی ہے اس پر اقبال کی دیگر دو نظموں ''پس چہ باید کرد'' اور ''امراء عرب سے'' کے علاوہ (جن کا ذکر آگے آرہا ہے)، فکر اقبال کی ایک واضح عمومی چھاپ نظر آتی ہے۔ چند ذیلی عنوانات دیکھئے: نیا ایمان، صنعتی اور جنگی تیاری، نئی علمی تنظیم، شہسواری اور فوجی زندگی کی اہمیت، طبقاتی تفاوت اور اسراف، تجارت اور مالی نظام میں خود مختاری (مؤخر الذکر عنوانات کے ''اقبالیاتی'' حوالہ کے لئے بطور خاص 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' اور 'نقوش اقبال، ص ۳۶۔۳۷ ملاحظہ فرمائیں)۔

اسی طرح ''مسلمانوں کے تنزل کے اسباب'' کی بحث کے عنوانات دیکھئے: جہاد اور اجتہاد کا فقدان، بدعات وخرافات، دین وسیاست کی علیحدگی، فلسفیانہ موشگافیاں، حملۂ تاتاری، مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح اور عثمانی ترکوں کی آمد وغیرہ۔ ایک ایک آدھے آدھے صفحے کے یہ ''اقبالیاتی بیانات'' کسی مربوط تجزیاتی سیاق کی غیر موجودگی میں ''مسدس حالی'' اور ''جوابِ شکوہ'' کے اشعار کی یاد دلاتے ہیں۔

آخر میں ایک اور دلچسپ بات قابلِ ذکر ہے کہ بعض مقامات پر مولانا ندوی نے اپنی بات کے لئے جو تعبیر اختیار کی ہے اس سے ایسا لگتا ہے کہ وہ گویا اقبال کے اشعار کا ترجمہ یا خلاصہ پیش کررہے ہیں۔ تعلیم جدید کے موضوع سے متعلق اقبال کی ایک مختصر نظم یا قطعہ ''مدرسہ'' کا یہ شعر دیکھئے:

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش

مولانا ندوی انگریزی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے ''ماذا خسر العالم''

میں لکھتے ہیں:

فاصبح الآباء.... یعلمون (الاولاد)... العلوم المعاشیة واللغات الافرنجیة.... وبتاثیر التعالیم الافرنجیة .... تسلط علیهم خوف الفقر حتی اصبحوا من خوف الموت فی الموت[19]

یعنی لوگوں نے اپنے بچوں کو معاشی علوم اور فرنگی زبانیں پڑھانی شروع کردی۔ اور فرنگی تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ ان پر فقر کا خوف مسلط ہو گیا حتیٰ کہ وہ موت کے خوف سے (موت سے پہلے) مردہ ہو گئے۔

اقبال اپنی ایک مختصر سی نظم ''امرائے عرب سے''۔ میں نغمہ ریز ہیں:

کرے یہ کافر ہندی بھی جرأت گفتار
اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو
وصال مصطفوی، افتراق بولہبی

نہیں وجود حدود وثغور سے اس کا
محمد عربی سے ہے عالم عربی

اقبال کی اس نظم سے ظاہر ہے کہ عرب قوم پرستی کے خلاف کہی گئی ہے۔ ''ماذا خسر العالم'' میں ایک مقام پر عرب قوم پرستی کے خلاف جو گفتگو کی گئی ہے اس کا عنوان ہے: ''محمد رسول اللہ روح العالم العربی''۔ مزید لطف کی بات یہ ہے کہ مولانا ندوی کا خطاب بھی یہاں ''امرائے عرب'' ہی سے ہے۔ لکھتے ہیں:

''فالمهم لامراء العرب وزعمائهم وقادة الجامعة العربية ان یغرسوا الایمان فی الشعوب العربیة وجماهیر الامة''

یعنی امرائے عرب اور عرب اتحاد (عرب قوم پرستی) کے علمبردار لیڈروں کے لئے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ وہ عرب اقوام اور پوری امت مسلمہ میں ایمان کی آبیاری کریں[20]

''ماذا خسر العالم ---'' میں اقبال کی ترجمانی اور تعبیر و تبلیغ کا دائرہ

'اتفاق سے اختلاف تک' پھیلا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر اس سلسلہ کی ایک آخری بات پیش کی جاتی ہے۔ اقبال نے فارسی کو وسیلۂ اظہار بنایا اور عجم سے امید وابستہ کی:

طہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

مولانا ندوی نے عربی کو وسیلۂ اظہار بنایا اور عرب سے امید وابستہ کی۔ مولانا کی کتاب "ماذا خسر العالم ۔۔۔" اس ذیلی عنوان کے ساتھ اختتام پذیر ہوتی ہے: "رجاء العالم الاسلامی من العالم العربی" (عالم اسلامی کی توقع عالم عربی سے)۔

البتہ یہ اختلاف محض ظاہری ہے۔ اور اس ظاہری اختلاف مسلک میں بھی مولانا ندوی نے گویا اقبال ہی کی پیروی کی ہے۔ جیسا کہ خود مولانا کی ایک تحریر سے اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اقبال کی ایک مشہور نظم "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کے بارے میں مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں: "اقبال نے ۔۔۔ اپنی ایک خاص نظم بلاد عرب اور امت عربیہ کے لئے ۔۔۔ لکھی ہے جس میں ان کے فضل و شرف، اسلام کی علمبرداری اور انسانیت کی دستگیری کا ذکر کیا ہے"[۲۱]

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مولانا ندوی کی کتاب "ماذا خسر العالم ۔۔۔" ہماری ایک ادبی روایت کا حصہ ہے جو حالی و اقبال سے شروع ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں، اسکی ایک علمی اہمیت یہ ہے کہ نظم کی اس روایت سے تاریخ عالم کی جو "اسلامی تعبیر" شروع ہوئی تھی، اور جسے مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد چہارم[۲۲] میں "پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت، ظہور اسلام کے وقت دنیا کی مذہبی اور تمدنی حالت کیا تھی، ظہور

اسلام کے وقت عرب کی مذہبی اور اخلاقی حالت، عربوں کی خصوصیات اور خیر الامم بننے کی صلاحیت" وغیرہ عنوانات کے تحت نثر کا اعتبار اور علمی استناد بخشتا تھا، مولانا ندوی نے اسے مزید ترقی دی۔ بقول سید قطب:

"(اس کتاب) سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو یورپ کے اسلوب نگارش سے بے نیاز ہو کر۔۔۔ تاریخی مباحث پر کس طرح قلم اٹھانا چاہیے۔ اور کس انداز سے اسے مرتب کرنا چاہیے"[۲۴۳]

حواشی وحوالا جات

۱۔ مسدس مدوجزر اسلام۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ خدا بخش ایڈیشن 1995ء، ص ۸-۶

۲۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر (ترجمہ ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'')۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ مولوی شمس تبریز خاں (مترجم)، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۱ء، ص ۴۱

۳۔ مولانا الطاف حسین حالی اوران کی مسدس مدوجزر اسلام سے مولانا ندوی کے تعلق وتأثر کے لئے دیکھئے: کاروان مدینہ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء، ص ۱۷۸۔

مسدس کا شعر:

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی

بخاری کی ایک طویل حدیث (العلم۔ رقم ۷۹) سے مستفاد ہے۔ مولانا ندوی نے ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' میں ایک مقام پر شعر کے مفہوم کو نثر میں بیان کر کے حاشیہ میں یہ حدیث درج کردی ہے (ص ۱۴۷) اردو ترجمہ میں پھر حالی کا شعر لکھ دیا گیا ہے (ص ۱۶۲)۔ علاوہ ازیں، مولانا ندوی کا ایک رسالہ ''المد والجزر فی تاریخ الاسلام'' کے نام سے ہے جس میں مسلمانوں کی اخلاقی صورت حال پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ نقوش اقبال، ص: ۲۹۳

۴۔ نقوش اقبال۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مولوی شمس تبریز خاں (مترجم)، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ ۱۹۷۶ء، ص: ۲۷۵۔۲۷۴

۵۔ ایضاً، ص: ۱۲۶۔۱۲۵

۶۔ ایضاً، ص: ۱۲۴۔۱۲۳

۷۔ "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کی اشاعت کے ایک سال بعد مولانا ندوی نے ۱۹۵۱ء میں مشرق وسطیٰ کا سفر کیا تھا اور وہاں اپنے ایک سالہ قیام کے دوران انہوں نے اقبال پر عربی میں متعدد مقالات لکھے اور لکچر بھی دیئے۔ نقوش اقبال: ص ۳۸

۸۔ نقوش اقبال، ص: ۲۷۷

۹۔ ایضاً، ص: ۳۳

۱۰۔ ایضاً، ص: ۳۴۔۴۲

۱۱۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ص: ۱۵۔۱۴

۱۲۔ ایضاً، ص: ۲۴۔۲۷

۱۳۔ ایضاً، ص: ۱۷۶۔۱۷۵

۱۴۔ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ۔السید ابو الحسن علی الندوی۔دار الانصار۔مصر ۱۹۷۷ء، ص: ۱۹۵۔۱۶۵

۱۵۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ص: ۳۸۴ "(غیر مسلم اقوام پر اسلامی توحید کے اثرات کے لئے دیکھئے: "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین "ص: ۱۴۲۔۱۳۵ یا اردو ترجمہ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" ص: ۱۸۸۔۱۷۷، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کے 'اثرات' کی پوری بحث کے لئے دیکھئے: عربی کتاب، ص: ۲۸۶۔۲۴۹ یا اردو ترجمہ، ص: ۳۸۸۔۳۳۵)

۱۶۔ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، ص:۱۰۔۲۲

۱۷۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ص:۴۰۲۔۴۰۱

۱۸۔ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، ص:۲۹۷۔۲۹۸،
۲۸۵۔۲۸۷

۱۹۔ ایضاً، ص:۲۶۲۔۲۶۱

۲۰۔ ایضاً، ص:۳۰۲۔۳۰۱

۲۱۔ نقوش اقبال، ص: ۱۵۹۔ اس نظم کا خلاصہ مولانا نے ''روائع اقبال'' میں عربوں کے لئے پیش کردیا ہے۔ ملاحظہ ہو باب: اقبال کا پیغام بلاد عربیہ کے نام۔ ''روائع اقبال'' اور ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کے متعلقہ ابواب (اقبال کی شخصیت کے تشکیلی عوامل، اقبال اور مغربی تہذیب وثقافت، اقبال اور عصری نظام تعلیم، ابلیس کی مجلس شوریٰ، اقبال اور قومیت ووطنیت وغیرہ) میں جو معنوی اشتراک ہے، وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

۲۲۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا سید سلیمان ندوی، آر۔ زیڈ پیکے جیز، لاہور (۱۴۰۸ھ) جلد چہارم (شب ظلمت تا صبح سعادت، ص:۱۸۲۔۱۱۶)

۲۳۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ص:۲۶۔۲۵

☆☆☆

مصنف کی دیگر تصانیف

۱۔ قرآن کے چند اہم مباحث
۲۔ مطالعات قرآن
۳۔ قرآنی مقالات کا اشاریہ
۴۔ اساطین عربی زبان وادب (ہندوستان میں)
۵۔ مصر میں مقالہ نگاری کا ارتقاء
۶۔ نقوش عقاد
۷۔ مولانا محمد اسلم جیراجپوری حیات وخدمات
۸۔ محمد بن حسن شیبانی حیات وخدمات
۹۔ الصدر الشہید حسام الدین عمر بن عبدالعزیز عمر ابن مازہ بخاری حیات وخدمات
۱۰۔ دراسات فی الادب الحدیث
۱۱۔ مولانا حمید الدین فراہی مفسر و محقق
۱۲۔ مولانا عبدالسلام ندوی ماہر قرآنیات وادبیات
۱۳۔ افکار قرآن
۱۴۔ انعکاس: عربی زبان وادب ہندوستان میں
۱۵۔ میر کارواں
۱۶۔ ذاکر علی گڑھ
۱۷۔ انعکاس
۱۸۔ لالۂ وگل
۱۹۔ نایاب ہیں ہم
۲۰۔ المباحث الادبیۃ
۲۱۔ چار جدید مصری شعرا
۲۲۔ نیر تاباں